محی الدین نواب

جب کسی کو نظر انداز کیا جاتا ہے تو وہ سب سے پہلے آئینے کے سامنے آ کر پوچھتا ہے۔ ''مجھ میں کیا کمی رہ گئی ہے؟''

آئینہ اسے سر سے پاؤں تک دکھاتا ہے، اس کے بدن کا ورق ورق پیش کرتا ہے۔ اسے سمجھاتا ہے کہ اس میں کوئی کمی نہیں ہے، کمی دیکھنے والوں میں ہے جو حسنِ نظر نہیں رکھتے، وہ کبھی حسنِ ادا کو پہچان نہیں پاتے۔

صدف ایسی تھی کہ آئینہ اس کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتا تھا اور وہ بھی آئینے میں اپنا تماشا دیکھتی چلی جاتی تھی۔

کوئی دیوانہ عاشق اسے دن رات ایسے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ آئینہ مجبور ہوتا ہے۔ وہ ساری عمر بھی اس کے سامنے کھڑی رہتی تو وہ اس کا قصیدہ پڑھتا رہتا۔

عورت کے لیے آئینہ قدرت کا بہترین عطیہ ہے۔ شوہر اسے دیکھ کر، چھو کر پھر اسے پا کر ایک حد سے گزر کر بیزار ہو جاتا ہے، کوئی دیوانہ شوہر بھی دن رات اپنی بیوی کی پوجا نہیں کرتا، صرف آئینہ کرتا ہے، اس کے سامنے آتے ہی اسے اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ جب تک وہ جانا نہیں چاہتی، تب تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

ابھی صدف کی زندگی میں ایسا وقت نہیں آیا تھا کہ نعمان اس سے بیزار ہو جاتا۔ کہتے ہیں لڑکی شادی کے بعد محبوبہ نہیں رہتی، صرف بیوی بن کر رہ جاتی ہے لیکن شادی کے تین برس بعد بھی نعمان اسے اتنی ہی شدت سے چاہتا تھا جیسے وہ پہلی بار اس سے مل رہی ہو، ہر نیا دن اسے نئی نویلی بنا دیتا تھا۔

بہت کم عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو شادی کے بعد بھی محبوبہ بن کر رہنے کے گر جانتی ہیں۔ وہ شوہر کو عاشق بنائے رکھنے کے کئی نسخے جانتی تھی۔ پہلا نسخہ تو یہی تھا کہ وہ پوری طرح نعمان

کے ہاتھ نہیں آتی تھی، کبھی ہاتھ آ کر نکل جاتی تھی پھر ہاتھ آنے کے لیے ایک طویل وقفہ رکھتی تھی تا کہ وہ اس کے لیے ترستا رہے۔ جو شوہر بار بار طلب کرتا رہے، وہ آخر طلب گار بن کر رہنے کا عادی ہو جاتا ہے۔

یہ خود کو پُرکشش بنائے رکھنے کی ادائیں تھیں۔ وہ اپنے بدن کو یوں سنبھال کر رکھتی تھی، جیسے شیشے کا نازک پیمانہ ہو، وہ اپنے پیمانے سے چھلکتی نہیں تھی، اس پیمانے سے پیاس بجھانے دیتی تھی مگر اسے ٹھیس پہنچانے نہیں دیتی تھی۔

نعمان نے شادی کے دوسرے برس کہا۔ ''ممی اور ڈیڈی آس لگائے بیٹھے ہیں۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیسی آس؟''

''گھر میں بہو آتی ہے تو سب ہی پوتے یا پوتی کی آواز سننا چاہتے ہیں۔''

''نعمان! میں نے شادی سے پہلے ہی کہا تھا، تم شوہر بننے کے بعد باپ بننے کی ضد کرو گے۔''

''یہ میری ضد نہیں، بزرگوں کی ضد ہے۔''

''تم انہیں سمجھاؤ۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میری آزادی ختم ہو جائے؟ ابھی تو ہمارے آزادی سے گھومنے پھرنے اور عیش کرنے کے دن ہیں۔ ہماری تنہائیاں کتنی جذباتی اور رومان پرور ہوتی ہیں۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ایسی تنہائی میں بچے کے رونے کی آواز آئے اور میں اسے دودھ پلانے لگ جاؤں؟''

''میں ابھی یہ نہیں چاہتا۔ واقعی ہمیں دو چار برس آزادی سے رہنا چاہیے۔''

وہ صدف کی ہاں میں ہاں ملانے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ اپنے بزرگوں کی توقعات کے خلاف اس کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارتا رہا۔ اس کی ممی پیروں فقیروں کے پاس جاتی رہیں، مزاروں پر جا کر منتیں مانتی رہیں۔ انہوں نے تین برس بعد کہا۔ ''بیٹے! بہو کا میڈیکل چیک اَپ کرانا چاہیے۔''

''اس کی کیا ضرورت ہے ممی؟''

''ضرورت ہے۔ تین برس کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ طرح طرح کے وسوسے جنم لیتے ہیں۔ بہو بانجھ ہوئی تو کیا ہم اولاد سے محروم رہیں گے؟ تمہارے باپ دادا کی نسل آگے نہیں بڑھے گی؟''

''آپ یہ وسوسے اپنے دل سے نکال دیں۔ اولاد بھی ہوگی اور نسل بھی آگے بڑھے

گی۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟ تین برس میں کچھ نہیں ہوا، آگے بھلا کیا ہوگا؟''

اس کے ممی ڈیڈی نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر ماں نے گھور کر پوچھا۔

''اس کا مطلب ہے، تم دونوں ابھی اولاد نہیں چاہتے؟ یہ تم دونوں کا منصوبہ ہے۔''

باپ نے ناگواری سے کہا۔ ''میں اس گھر کا سرپرست ہوں، یہاں کا مالک و مختار ہوں اور تم نے ایک پوتے یا پوتی کے لیے بھی مجھے محتاج بنا کر رکھا ہے۔ ہم پچھلے تین برس سے انتظار کر رہے ہیں اور تم ہمیں بے وقوف بناتے آ رہے ہو؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے ڈیڈ! وہ...... بات یہ ہے کہ......''

ماں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''کوئی بات نہیں ہے۔ سیدھی اور صاف بات یہ ہے کہ تم ہمیں دھوکا دیتے رہے ہو۔ ہم پوتے یا پوتی کی آس لگائے بیٹھے ہیں اور تم ہمیں ترساتے رہے ہو۔''

نعمان نے سر جھکا لیا۔ دونوں بزرگوں کا مطالبہ درست تھا۔ وہ کوئی بات بنا کر انہیں ٹال نہیں سکتا تھا۔ ماں نے کہا۔ ''میں تمہارا سر جھکا ہوا نہیں...... فخر سے اٹھا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں۔ ہمارا خاندان دور تک پھیلا ہوا ہے۔ رشتے دار قریبی ہوں یا دور کے...... سب ہی پوچھتے ہیں کہ ہم پوتے یا پوتی کی خوش خبری کب سنائیں گے۔''

باپ نے کہا۔ ''تمہارے چچا اور چچی اسلام آباد سے فون پر پوچھتے ہیں۔ تمہاری پھوپھی لندن سے ای میل کے ذریعے سوال کرتی ہیں کہ ہمارا ننھا جانشین کب آئے گا۔ تم یوں سر نہ جھکاؤ، یہ دیکھو کہ تم نے ہمارا سر کس طرح جھکایا ہوا ہے؟''

ماں نے کہا۔ ''میں کچھ نہیں جانتی۔ آخری بار کہتی ہوں، اس ایک سال کے اندر ہمیں اولاد کی خوش خبری سناؤ۔ اگر تم نے میری یہ خواہش پوری نہ کی تو میں تم سے بات کرنا چھوڑ دوں گی۔ میرا دودھ تم پر قرض ہے۔ تم یہ قرض میرے پوتے یا پوتی کی صورت میں ادا کر سکتے ہو۔ اس سے آگے کچھ نہیں کہوں گی۔''

یہ کہہ کر وہ وہاں سے اٹھ کر چلی گئیں۔ اس رات نعمان نے صدف سے کہا۔ ''پانی سر سے گزر چکا ہے۔ ممی ڈیڈی اب مزید انتظار نہیں کریں گے۔''

''انتظار کیوں نہیں کریں گے؟ ایسی کیا بات ہو گئی؟''

''بات بہت بڑھ چکی ہے۔ وہ تمہارا چیک اَپ کرانا چاہتے ہیں۔''

وہ ناگواری سے بولی۔ ''یہ انہیں بیٹھے بیٹھائے کیا سوجھی؟''

''جب بہو کی گود ہری نہ ہو تو دنیا کی ہر ساس یہی سوچتی ہے کہ بیٹے میں خرابی نہیں ہے، بہو میں ہے لہٰذا اسی کا معائنہ کرانا چاہیے۔''

''پھر تو یہ بھید کھل جائے گا کہ ہم دونوں خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کر رہے ہیں۔''

''میں نے آج انہیں بتا دیا ہے۔''

صدف نے اسے چونک کر دیکھا پھر پوچھا۔ ''تم نے کیوں بتایا؟ کیا کچھ بات نہیں بنا سکتے تھے؟''

''میں ہزار باتیں بناتا لیکن ممی اور ڈیڈی اپنی ضد پوری کرتے۔ تمہارا میڈیکل چیک اَپ ضرور کرایا جاتا۔ آج نہ سہی کل تو یہ بات کھلنی ہی تھی۔''

''بعد میں جو ہوتا، دیکھا جاتا۔ تم مجھ سے تو مشورہ کر لیتے۔ ہم کسی تدبیر سے میڈیکل چیک اَپ والے مسئلے کو کھٹائی میں ڈال دیتے۔''

''ہم کب تک ایسا کرتے رہیں گے؟ میں نے اپنے والدین کو کبھی کسی معاملے میں دھوکا نہیں دیا۔ اولاد کے معاملے میں تین برسوں سے دھوکا دیتا آ رہا ہوں۔ جب ممی پیروں فقیروں کے پاس جاتی ہیں، ہر نماز کے بعد پوتے یا پوتی کے لیے دعائیں مانگتی ہیں تو میرا دل اندر سے مجھے ملامت کرتا ہے۔''

وہ چڑ کر بولی۔ ''تو صاف کہو نا کہ تم بھی اب باپ بننے کے لیے مچل رہے ہو؟''

''پلیز...... مجھے طعنے نہ دو۔ میں شادی کی پہلی رات سے اب تک تمہاری بات مانتا آ رہا ہوں۔ اب تمہیں میری بات مان لینی چاہیے۔''

اس نے نعمان کو گہری ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ اس کی آواز، اس کا لہجہ اور اس کے تیور بتا رہے تھے کہ اب وہ اپنے والدین کی خواہش ضرور پوری کرے گا۔

وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''نعمان! جانتے ہو، ایک بچے کے بعد کیا ہوگا؟ میرا فیگر آدھا رہ جائے گا۔ عمارت کو ڈھانے کے لیے ایک زلزلہ ہی کافی ہوتا ہے۔ کیا تم تاج محل کو کھنڈر بنانا چاہتے ہو؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ دنیا کی تمام عورتیں ماں بنتی ہیں۔ وہ کھنڈر نہیں کہلاتیں۔ ماں بننے کے بعد پہلے سے زیادہ شخصیت میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔ عورت کی عظمت ماں بننے میں ہے۔''

''میں ایسی عظمت نہیں چاہتی۔ میں اپنا گلیمر اور اپنی موجودہ کشش برقرار رکھنا چاہتی ہوں۔''

''تم میرے لیے ہمیشہ پُرکشش رہو گی۔ میرے بچے کی ماں بن کر میرے اندر اپنی جڑیں اور مضبوط کر لو گی۔''

''اگر میں ماں نہیں بننا چاہوں تو کیا تم زبردستی اپنی بات منواؤ گے؟''

''میں زور زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔ تم شادی سے پہلے بھی مجھے جانتی تھیں۔ اب یہ اچھی طرح سمجھ رہی ہو کہ میں تمہاری خوشی میں خوش رہتا ہوں لیکن تم پر صرف میرا حق نہیں ہے، میرے والدین کے حقوق بھی ہیں۔ وہ تم سے پوتی یا پوتے کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ تم یہ مطالبہ پورا نہیں کرو گی تو یہی سمجھا جائے گا کہ تم بانجھ ہو اور بانجھ بہو پر ہمیشہ سوکن لائی جاتی ہے۔''

وہ ایک دم سے بپھر کر بولی۔ ''تو کیا تم دوسری شادی کرو گے؟ مجھ پر سوکن لاؤ گے؟''

''میں شادی نہیں کروں گا لیکن تم مجھے اس دوراہے پر لا کر کھڑا کر دو گی جہاں والدین کی جائز ضد کے آگے جھکنا پڑتا ہے۔ سارے رشتے دار کہیں گے، تمام دنیا کہے گی کہ اپنا وارث پیدا کرنے کے لیے دوسری شادی کرنی ضروری ہے۔ کیا ان حالات میں، میں انکار کر سکوں گا؟ تم ہی بتاؤ، میں ساری دنیا سے کیسے لڑ سکوں گا؟''

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی، وہ درست کہہ رہا تھا۔ اس نے سوچا۔ ''میں نعمان کو الجھن میں مبتلا کر رہی ہوں۔ اپنا نقصان کر رہی ہوں۔ اگر اس خاندان کی نسل میرے ذریعے آگے نہیں بڑھے گی تو دوسری بہو ضرور لائی جائے گی۔ میں اپنے ہاتھوں اپنی سوکن کے لیے دروازہ کھول رہی ہوں۔ نہیں...... یہ سراسر میری نادانی ہے۔ میں نعمان کو تین برسوں سے اپنی مرضی پر چلاتی آئی ہوں۔ کبھی محبت سے اور کبھی لڑ جھگڑ کر قائل کرتی آئی ہوں لیکن ساس سسر اور دنیا والوں کے سامنے تو انہیں جھکنا ہی پڑے گا۔''

وہ اور ذرا قریب ہو کر اس کے شانے پر سر رکھ کر بڑے ہی سمجھانے اور منانے والے انداز میں بولی۔ ''تم میری وجہ سے ممی اور ڈیڈی کے سامنے شرمندہ ہو رہے ہو، میں تم سے اتنی محبت کرتی ہوں لیکن پریشان بھی کرتی ہوں۔ اب نہیں کروں گی، تم میری صرف ایک بات مان لو۔''

''ایسی بات منواؤ کہ مجھے بزرگوں کے سامنے شرمندہ نہ ہونا پڑے۔''

"میں ایسی کوئی بات نہیں کروں گی۔ میری صرف یہ بات مان لو کہ ہم ایک دو ہفتے تک مزید یہ پابندی برقرار رکھیں گے۔ دو ہفتوں کے بعد وہی ہوگا جو تمہارے بزرگ چاہتے ہیں۔"

"دو ہفتوں کی کوئی بات نہیں ہے۔ ممی نے کہا ہے، ایک برس کے اندر بچے کی خوش خبری سنائی جائے، ابھی بہت وقت پڑا ہے۔"

صدف نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ دو ہفتے بہت ہوتے ہیں۔ اس عرصے میں انسان دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جا کر واپس آ جاتا ہے۔ اسے بھی اپنے مقصد کی طرف واپس جانا تھا اور مقصد یہ تھا کہ وہ ماں بننے کے نام پر کھنڈر نہیں بنے گی۔

☆======☆======☆

صدف کو اپنے وجود سے جنون کی حد تک عشق تھا۔ وہ اپنی کشش کو برقرار رکھنے کے لیے ماں جیسے عظیم رشتے کی نفی کرتی آئی تھی۔ وہ قدرتی طور پر مجبور نہیں تھی لیکن اس نے اپنے فیگر کی خوب صورتی کو اپنی مجبوری بنا لیا تھا۔

وہ تقریبات میں جاتی تو اس کے لباس اور میک اَپ کی میچنگ نگاہوں کو پکارتی تھی، ہر دوسری آنکھ اسے دیکھنے پر مجبور ہو جاتی تھی۔ ایسے وقت وہ ہواؤں میں اُڑنے لگتی تھی۔ نئے ملنے والے اسے بے ساختہ مس کہنے پر مجبور ہو جاتے تھے اور جب وہ اپنا تعارف مسز نعمان کی حیثیت سے کراتی تو سامنے والے اسے بے یقینی سے دیکھنے لگتے تھے۔ ان کے چہروں اور ردِعمل سے یوں لگتا تھا، جیسے جام ہاتھ میں آنے سے پہلے ہی چھین لیا گیا ہو۔

یوں تو سب ہی اسے بے باکی سے دیکھتے تھے لیکن شادی شدہ حضرات جب اسے اپنی بیگمات کی اوٹ سے جھانک کر دیکھتے تو اسے ایک انجانی سی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ ان کی نظروں میں یہ حسرت ہوتی تھی۔ "کاش! خود کو اسمارٹ اور خوب صورت بنا کر رکھنے والی ایسی بیوی ہمیں بھی نصیب ہوتی......"

ایسے وقت وہ ناگواری سے پہلو میں بیٹھی اپنی بیگمات کو دیکھتے جو ازدواجی زندگی کی شروعات میں تو اسمارٹ تھیں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنی دوشیزگی کھو چکی تھیں۔ اب ان کی ساڑھی کے پلو سے شوہر کے بجائے بچے الجھے رہتے تھے۔

لیکن صدف ازدواجی زندگی کے تین برس بعد بھی خوشبو کی طرح اِدھر سے اُدھر لہراتی پھرتی تھی۔ ہر کوئی اسے مسخر کر لینا چاہتا تھا لیکن خوشبو کہاں تسخیر ہوتی ہے؟ اسے مٹھی میں بند کر

کے رکھو تو مٹھی بند رہ جاتی ہے اور خوشبو ہوا ہو جاتی ہے۔ جس طرح وہ مسز نعمان ہونے کے باوجود، مس صدف نظر آتی تھی اور ہمیشہ ایسی ہی نظر آنا چاہتی تھی۔

مگر اب بزرگوں کا دباؤ نعمان کو مجبور کر رہا تھا۔ ایسے میں صدف نے اسے تسلی دی تھی لیکن خود بے چین ہو گئی تھی اور یہی بے چینی اسے اپنی سہیلی ڈاکٹر رملا کے کلینک میں لے آئی۔ وہ اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے گلے لگ گئی پھر اس کے رخسار چوم کر بولی۔

"او......صدف! میری جان......! کیسی ہو؟"

وہ اس سے الگ ہو کر ایک ادا سے بولی۔ "بہت اچھی ہوں اور ایسی ہی رہنا چاہتی ہوں، تب ہی تمہارے پاس آئی ہوں۔"

پھر اس نے کرسی پر بیٹھی ہوئی ایک مریضہ کو دیکھ کر رملا سے کہا۔ "تم فارغ ہو جاؤ پھر باتیں ہوں گی۔"

وہ اپنی کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ "اچھی بات ہے۔ میں مریض سے فارغ ہوتے ہی تمہیں اٹینڈ کرتی ہوں۔"

صدف صوفے پر بیٹھ کر ایک میگزین کی ورق گردانی کرنے لگی۔ رملا اس مریضہ کا اور اس کے نوزائیدہ بچے کا معائنہ کرتے ہوئے بولی۔ "دودھ پورا نہ ہونے کی وجہ سے بچہ کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ کیا تم بھرپور خوراک نہیں لے رہی ہو؟ تمہاری صحت ہی بچے کی صحت ہے۔"

مریضہ نے کہا۔ "خوراک تو میری بہت اچھی ہے لیکن میں زیادہ تر بیمار رہتی ہوں۔ بہت سی میڈیسن لے رہی ہوں۔"

"پھر تو دودھ کم ہونے کی وجہ تمہاری بیماری ہے۔ میں کچھ دوائیں لکھ کر دے رہی ہوں۔ انہیں پھل اور دودھ کے ساتھ استعمال کرو۔"

صدف ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی اور بڑی ہمدردی سے اس عورت کو دیکھ رہی تھی۔ وہ مریضہ بولی۔ "ان دواؤں سے کچھ فرق نہیں پڑتا، آپ مجھے کوئی ایسا انجکشن دے دیں جس سے دودھ بڑھ جائے۔"

ڈاکٹر رملا نے مسکرا کر کہا۔ "بی بی! مصنوعی انجکشنوں کے ذریعے جانوروں کے دودھ کی مقدار بڑھائی جاتی ہے تم انسان ہو، میں تمہیں انسانوں والی دوائیں دے رہی ہوں۔ ان شاء اللہ بچے کو دودھ کم نہیں پڑے گا۔"

وہ مریضہ نسخہ لے کر چلی گئی۔ صدف نے بڑی ہمدردی سے سوچا۔ "یہ بے چاریاں ماں

بننے سے پہلے ہی عذاب جھیلتی ہیں اور ماں بننے کے بعد بھی مصائب کا سامنا کرتی رہتی ہیں۔''

ڈاکٹر رملا کچھ دیر تک اپنے مریضوں میں الجھی رہی، جب وہ فارغ ہوئی تو صدف اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''اگر تم ڈاکٹر نہ بنتیں تو میرا بڑا نقصان ہوتا۔ ان تین برسوں میں تین عدد بچے میرے آگے پیچھے جھول رہے ہوتے۔ تھینکس گاڈ! میں اس جھنجھٹ سے محفوظ ہوں۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''بچے زیادہ ہو جائیں تو جھنجھٹ بنتے ہیں۔''

''نہیں بھئی، ایک ہو یا دس ہوں، گود میں آتے ہی عورت کے گلیمر کو ختم کر دیتے ہیں۔ اس کی اپنی کوئی شخصیت ہی نہیں رہتی۔''

''سب عورتیں تمہاری طرح نہیں سوچتیں، بچہ تو ایسا خوب صورت تحفہ ہے جو ہر عورت اپنے خاندان کو دینا چاہتی ہے۔ ایک تم ہی ہو، جو کتراتی ہو۔''

''تو کیا میں خاندان والوں کی خوشی کی خاطر اپنا فیگر بگاڑ لوں؟ ایک عدد بچہ گود میں لٹکا کر کارٹون بن کر شاپنگ کروں؟ ڈرائیونگ کروں؟ تقریبات میں جاؤں؟ نہ بابا نہ، مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔ میں تو ایسا سوچ کر ہی لرز جاتی ہوں۔''

''تم شادی کے دن سے اب تک اپنی ضد اور میرے مشوروں پر چلتی آئی ہو۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ تمہیں نعمان جیسا شوہر ملا ہے، جو تمہاری بے جا ضد کے آگے جھکتا رہتا ہے۔''

وہ ذرا افسردگی سے بولی۔ ''لیکن اب نہیں جھکیں گے......''

اس نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا مطلب......؟ کیا نعمان باپ بننا چاہتا ہے؟''

''وہ باپ بننا چاہیں یا نہ چاہیں لیکن میرے ساس سسر دادی دادا بننا چاہتے ہیں۔''

''او...... آئی سی...... یعنی سرد جنگ جاری ہے؟ نعمان کا کیا ری ایکشن ہے؟''

''ان کا ری ایکشن کیا ہوگا؟ پہلے وہ میری ضد کے آگے جھکتے تھے، اب والدین کی ضد کے سامنے جھک رہے ہیں۔''

رملا کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔ ''ویسے دیکھا جائے تو وہ ٹھیک ہی کر رہے ہیں۔ سب ہی والدین اپنی نسل کو آگے بڑھتے اور پھلتے پھولتے دیکھنا چاہتے ہیں۔''

وہ چڑ کر بولی۔ ''تم بھی ان سب کی حمایت کر رہی ہو، والدین کی خواہش پوری کرنے

میں نعمان کا کچھ نہیں بگڑے گا لیکن میں سراسر نقصان اٹھاؤں گی۔ ایک ننھا سا بچہ میری کشش اور میرے گلیمر کو تباہ کر دے گا، میرے فیگر کا ستیاناس...... کر دے گا اور میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔''

''تمہیں تو صرف اپنے فیگر کی پڑی رہتی ہے۔ شوہر کی اور سسرال والوں کی خوشیوں کا کوئی خیال نہیں ہے۔''

''نعمان مجھے بہت چاہتے ہیں لیکن میں جانتی ہوں جب بچے ہو جائیں گے اور میں جسمانی طور پر بھدی ہو جاؤں گی تو یہی نعمان مجھے اپنے ساتھ کسی تقریب میں لے جاتے ہوئے شرمائیں گے۔ مجھے نظر انداز کریں گے۔ میں نے اکثر ایسے شوہروں کو دیکھا ہے جو اپنی بیگمات سے نظر بچا کر خوب صورت اور اسمارٹ لڑکیوں کو دیکھتے ہیں۔ نعمان بھی ایسے ہی ہو جائیں گے اور مجھ سے تو یہ برداشت نہیں ہوگا۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''سب ایسے نہیں ہوتے اور میں نہیں سمجھتی کہ نعمان کبھی تمہارے ساتھ ایسا رویہ اختیار کریں گے۔''

''ارے رہنے دو...... بچے کے رونے کی آواز شوہر کی ساری دیوانگی دھو ڈالتی ہے۔ کباب میں ہڈی کون پسند کرتا ہے؟ آہستہ آہستہ دوریاں بڑھنے لگتی ہیں۔ بیوی بچوں میں الجھ کر رہ جاتی ہے اور میاں صاحب کنواری دوشیزاؤں پر ڈورے ڈالنا شروع کر دیتے ہیں۔''

وہ اس کی بات سن کر ہنسنے لگی پھر بولی۔ ''تمہاری سوچ تو شروع سے ہی الٹی ہے۔ ارے بے وقوف! بچہ ہونے سے تو محبت مزید بڑھتی ہے۔ ہر شوہر کی یہ دلی خواہش ہوتی ہے کہ اس کی بیوی کی گود میں اس کا بچہ کھیلے، اس کی نسل اس کی گود میں پروان چڑھے۔ ایسے میں اسے بیوی پر بہت پیار آتا ہے۔''

''نہیں بھئی، مجھے ایسی محبت، ایسا پیار نہیں چاہیے جو مجھے تماشا بنا دے۔ مجھے تو ان عورتوں پر بہت غصہ آتا ہے جو بچوں کو اپنا دودھ پلاتی ہیں۔ ارے بھئی دودھ پلانا ہے تو فیڈر سے پلاؤ۔ گائے بھینسوں کی طرح عجوبہ کیوں بن رہی ہو؟''

رملا ایک ذرا سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''ماں اگر بچے کو اپنا دودھ پلاتی ہے تو یہ کوئی عجوبہ بننے والی بات نہیں ہے۔ تم سونے کے زیورات پہنتی ہو اور یہی ڈیزائن تمہیں آرٹی فیشل جیولری میں بھی مل جائیں گے لیکن تم سونے کے زیورات کو ترجیح دیتی ہو کیونکہ انہیں پہن کر تمہیں دلی سکون اور فخر حاصل ہوگا۔ جبکہ آرٹی فیشل جیولری پہن کر ایسا کچھ نہیں ہوتا۔ اسی طرح دودھ

کے بارے میں بھی سوچو، قدرتی دودھ میں اور ڈبے کے دودھ میں بھی فرق ہوتا ہے۔''

''تم ڈبے کے دودھ کی برائی کر رہی ہو جبکہ ابھی کچھ دیر پہلے تم نے ایک عورت کو مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنے بچے کو لیکٹوجن ٹو پلائے۔''

''کچھ مجبوریاں ہوتی ہیں جن کی وجہ سے ہم ڈبے کا دودھ استعمال کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ کچھ عورتوں کے قدرتی طور پر دودھ نہیں اُترتا یا بچے کے لیے کم پڑتا ہے تو ایسی صورت میں ڈبے کے دودھ کا سہارا لیا جاتا ہے مگر آج کل متوسط طبقے کی اور اَپر کلاس کی عورتوں نے تو اسے فیشن بنالیا ہے۔ پڑھی لکھی ہونے کے باوجود ایسی نادانی کرتی ہیں۔ ان سے اچھی تو جاہل اور غریب عورتیں ہیں جو اپنے بچوں کی صحت چاہتی ہیں اور انہیں اپنا دودھ پلاتی ہیں۔''

وہ ایک ذرا ناگواری سے بولی۔ ''غریب عورتیں ایسے بچوں کو اپنا دودھ صرف اس لیے پلاتی ہیں کیونکہ وہ ڈبے کے مہنگے دودھ افورڈ نہیں کرسکتیں۔ ان کے برعکس پڑھی لکھی اور سمجھ دار عورتیں بچوں کو اپنا دودھ پلا کر اپنے گلے کی گھنٹی نہیں بناتیں بلکہ اپنی سہولت کو دیکھتے ہوئے انہیں آیا کے حوالے کردیتی ہیں۔ ایسی عقل مند عورتوں کو تم لوگ فیشن زدہ کہتے ہو۔''

''یہ عقل مندی نہیں، نادانی ہے۔ دودھ نہ پلانے کے باعث عورتیں سینے کی مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوجاتی ہیں۔ بعض اوقات یہ بیماریاں ناقابلِ علاج ہوجاتی ہیں۔ ایسی ہی عورتوں کو بریسٹ کینسر ہوجاتا ہے۔ طبی نقطہ نظر کے مطابق ماں کا دودھ بچے کے لیے بہترین غذا ہے۔ تم ذرا ماں تو بنو پھر دیکھنا میں اپنے مشوروں اور اپنی نصیحتوں پر تمہیں چلاؤں گی۔''

''میں اور ماں......؟ کبھی نہیں...... ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا...... میں کبھی ماں نہیں بنوں گی۔ مجھے تو یہ سوچ کر ہی وحشت ہو رہی ہے کہ میں کبھی ایک عدد بچہ گود میں لٹکائے پھروں گی۔''

''پھر ان کا کیا ہوگا جو تم سے اپنے پوتے یا پوتی کی آس لگائے بیٹھے ہیں؟ نعمان کے بارے میں سوچو آخر وہ کب تک اپنے والدین کو ٹالتا رہے گا؟ وہ مرد ہے، ابھی پیار سے جھک رہا ہے، تمہارا مسلسل انکار اسے سرکش بنا سکتا ہے۔''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ میں انہیں باپ بنانے سے انکار نہیں کروں گی لیکن خود کبھی ماں نہیں بنوں گی۔''

وہ الجھ کر بولی۔ ''یہ کیا بات ہوئی؟ تم ماں نہیں بنو گی تو وہ باپ کیسے بنے گا؟ کیا سوکن

لانے کا ارادہ ہے؟''

''دوسری شادی بچوں کا کھیل نہیں ہے، یہ سب ڈرانے دھمکانے کی باتیں ہیں۔ میں ڈرپوک نہیں ہوں جو سسرال والوں کی ایسی دھمکیوں سے ڈر جاؤں گی اور ان کے سامنے ہتھیار ڈال دوں گی۔''

''مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آرہا کہ تم کیا کرنے والی ہو؟''

''مجھے کچھ نہیں کرنا۔ سب کچھ تمہیں کرنا ہے۔''

وہ حیرانی سے بولی۔ ''مجھے کیا کرنا ہوگا؟ تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''

''میں اب تک تمہارے ایسے مشوروں پر عمل کرتی آئی ہوں جن میں نعمان کے تعاون کی ضرورت پڑتی رہی ہے جیسا کہ میں کہہ چکی ہوں، اب وہ مجھ سے تعاون نہیں کریں گے، اپنے والدین کو دھوکا نہیں دیں گے، اب ایک راستہ رہ گیا ہے کہ میں نعمان کو دھوکا دیتی رہوں۔''

''یہ کیا کہہ رہی ہو؟ جس شوہر کو دل و جان سے چاہتی ہو، اسے دھوکا دوگی۔''

''میرے دھوکا دینے سے انہیں کوئی جانی و مالی نقصان نہیں پہنچے گا۔''

رملا اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگی۔ وہ اس کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ''پلیز...... مجھے ایسی گائیڈنس دو جس میں نعمان کو ہمراز بنائے بغیر میں ماں بننے سے محفوظ رہوں۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر اس کے ہاتھ کو تھپتھپاتے ہوئے بولی۔ ''ایک سہیلی کو جس حد تک کام آنا چاہیے، میں تمہارے کام آؤں گی۔ یہ تمہاری مرضی ہے کہ تم ماں نہیں بننا چاہتیں مگر قدرت سے کب تک جنگ کرتی رہو گی؟''

صدف خاموش رہی۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ رملا نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''دوسری شادی بچوں کا کھیل تو نہیں ہوتا لیکن نسل کو آگے بڑھانے کے لیے ہر ممکن راستہ اختیار کیا جاتا ہے، کہیں...... تمہاری یہ ضد سوکن کے لیے راستہ ہموار نہ کردے......''

''کیسی سوکن......؟ جب نعمان یہ دیکھیں گے کہ ہم خاندانی منصوبہ بندی پر عمل نہیں کر رہے ہیں تو دوسری شادی کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ وہ یہی سمجھتے رہیں گے کہ قدرت کی طرف سے دیر ہو رہی ہے۔''

''جب ایسی دیر ہوتی ہے تو میڈیکل چیک اَپ کرایا جاتا ہے، دیر کی وجہ معلوم ہوجاتی ہے۔''

وہ الجھ کر بولی۔ ''جب ایسا وقت آئے گا تب دیکھا جائے گا۔ فی الحال تو میرے بچاؤ کا کوئی راستہ نکالو......''

اس نے ایک نظر اس پر ڈالی پھر قلم اٹھا کر نسخہ لکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ بچاؤ کا نہیں، فرار کا راستہ ہے۔ میں دیکھوں گی کہ تم حقیقت سے کب تک فرار حاصل کرتی رہو گی۔''

وہ نسخہ لکھنے کے بعد اسے ان دواؤں کا طریقہ استعمال بتانے لگی۔

☆======☆======☆

وہ فرار کا نیا راستہ اختیار کرنے کے بعد بہت مطمئن تھی لیکن یہ عارضی سکون کسی وقت بھی غارت ہوسکتا تھا۔ جھیل بہت پُرسکون ہوتی ہے لیکن کوئی ایک کنکر اس کے اندر ہلچل پیدا کر دیتا ہے۔ بی آپا اسی ایک کنکر کی طرح اس کی زندگی میں آدھمکی تھیں۔

وہ گھر میں قدم رکھتے ہی اپنی بہن یعنی صدف کی ساس سے لپٹ کر بولیں۔ ''کیسی دبلی ہوگئی ہو؟ ایسا کون سا غم ہے جو تمہیں کھائے جا رہا ہے؟''

وہ بولی۔ ''مجھے بھلا کیا غم ہوگا؟''

''رہنے دو۔ مجھ سے چھپا رہی ہو۔ میں سب سمجھتی ہوں۔ پوتے یا پوتی کو گود میں کھلانے کی حسرت تمہیں اندر ہی اندر کھائے جا رہی ہے۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولیں۔ ''بس آپا! نسل کے معاملے میں ہم والدین جوان اولاد کے سامنے بھکاری بن کر رہ جاتے ہیں۔''

بی آپا اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''توبہ کیسا سناٹا چھایا ہوا ہے تمہارے گھر میں۔ میرے کانوں میں تو خاموشی کی سیٹیاں بجنے لگی ہیں۔ تم تو جانتی ہو، میری دو دو بہوئیں ہیں اور ان کے چار چار بچے ہیں گھر میں ایسی رونق لگی رہتی ہے کہ کیا بتاؤں؟''

صدف کوریڈور سے گزرتے ہوئے ٹھٹک گئی۔ انہیں دیکھ کر تیزی سے چلتی ہوئی ان کے قریب آ کر بولی۔ ''السلام علیکم خالہ جان! آپ کب آئیں؟''

وہ اسے دیکھ کر دونوں بازو پھیلا کر بولیں۔ ''اے وعلیکم السلام۔ میری بچی! دودھوں نہاؤ پوتوں پھلو......بس ابھی آئی ہوں۔''

انہوں نے آگے بڑھ کر اسے سینے سے لگا لیا پھر اس کی پیشانی کو چوم کر کہا۔ ''اے دلہن! تم تو پہلے سے بھی زیادہ پیاری ہوگئی ہو۔ کہیں میری نظر نہ لگ جائے۔''

یہ کہہ کر انہوں نے اپنی چھوٹی انگلی کو سرمے کی سلائی کی طرح ایک آنکھ پر پھیرا۔ پھر

کاجل کی سیاہی لگی انگلی کو اس کے چہرے کی طرف بڑھایا۔ وہ ایک ذرا پیچھے ہٹ گئی۔ بی آپا نے سمجھ لیا کہ نئے زمانے کی لڑکی ہے، چاند سے چہرے پر دھبا نہیں چاہتی وہ بولیں۔ ''اے دلہن! میں تمہیں نظر بد سے بچا رہی ہوں، کوئی بات نہیں اسے تمہارے بالوں میں لگاؤں گی تو کوئی دھبا دکھائی نہیں دے گا۔''

انہوں نے آگے بڑھ کر انگلی کی سیاہی کو اس کے بالوں پر رگڑ دیا۔

صدف نے ذرا ناگواری سے سوچا۔ ''بزرگوں کی منطق بھی نرالی ہوتی ہے، اسے تو برداشت کرنا ہوگا۔ کوئی بات نہیں......ابھی جا کر شیمپو کرلوں گی۔''

صدف کی ساس نے کہا۔ ''آپا! کیا دروازے پر ہی کھڑے رہنے کا ارادہ ہے؟ اندر آ کر آرام سے بیٹھو......پھر باتیں کرو۔''

وہ جلدی سے بولیں۔ ''ہاں ہاں......تم فکر نہ کرو۔ اندر بھی آؤں گی اور دو چار مہینے رہ کر جاؤں گی۔ میرے بیٹے نے مجھے اسلام آباد سے بائی ایئر بھیجا ہے اتنا خرچہ کر کے دروازے سے نہیں لوٹوں گی، تم لوگوں کے درمیان رہ کر کچھ عرصہ گزاروں گی۔''

صدف کی ساس نے خوش ہو کر کہا۔ ''یہ تو بہت اچھی بات ہے، تم نے دل خوش کر دیا۔ آؤ......اندر چلو......''

وہ ان دونوں کے ساتھ اندر جانے لگیں۔ ایک ملازم ان کا سامان اٹھائے ان کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ چلتے چلتے رک گئیں۔ چونک کر بولیں۔ ''اے ہے۔ میں تو بھول ہی گئی۔ سامان میں دب کر میرے سارے پان مرجھا گئے ہوں گے۔''

یہ کہتے ہی انہوں نے ملازم سے اپنا ایک سفری بیگ لے کر اسے کھولا۔ کاغذ میں لپٹے ہوئے پانوں کو نکال کر صدف کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اے دلہن! ذرا انہیں پانی میں تو بھگو دو......''

وہ پان لے کر کچن کی طرف چلی گئی۔ ساس نے ملازم سے کہا۔ ''آپا کا سامان فی الحال میرے بیڈروم میں رکھ دو۔''

ملازم سامان لے کر چلا گیا۔ بی آپا نے ناک چڑھا کر کہا۔ ''بی پاشا! تم بھی عجیب بہو لائی ہو۔ شادی کو تین برس سے اوپر ہونے کو آئے ہیں اور یہ ویسی کی ویسی ہی دھان پان سی ہے۔ بیاہتا عورت تو لگتی ہی نہیں ہے۔ کیا کھاتی پیتی نہیں ہے؟''

وہ مسکرا کر بولیں۔ ''کھائے گی نہیں تو زندہ کیسے رہے گی؟ بس ذرا حساب کتاب سے

کھاتی ہے۔"

بی آپا دونوں بازو پھیلا کر بولیں۔ "اے لو! کھانے میں حساب کتاب کیسا......؟ اللہ نے دیا ہے تو کھاؤ اور دکھاؤ۔ میری بہوؤں کو دیکھو۔ کھاتی ہیں تو دکھاتی بھی ہیں۔ ان کے تو ایسے گال پر گال چڑھے ہوئے ہیں۔ بہوئیں صحت مند دکھائی دیں تو سسرال کی ہی تعریف ہوتی ہے۔ تمہاری والی کو دیکھ کر تو ایسا لگ رہا ہے جیسے اس گھر میں قحط پڑا ہو۔"

"بس آپا! کیا بتاؤں، یہ تو جس دن زیادہ کھا لیتی ہے، اس دن رات گئے تک لان میں ٹہلتی رہتی ہے۔"

بی آپا نے ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر ذرا تعجب سے کہا۔ "اے ہے۔ کیا چڑیا کا پیٹ لے کر پیدا ہوئی ہے؟"

وہ دونوں باتیں کرتے ڈرائنگ روم میں آ کر بیٹھ گئیں۔ بی آپا نے دیدے گھماتے ہوئے پوچھا۔ "تم نے ڈرائنگ روم تو بڑا اچھا سیٹ کیا ہے۔"

"اسے میں نے نہیں، صدف نے اپنی مرضی سے سیٹ کیا ہے۔"

یہ سنتے ہی وہ ذرا ناگواری سے بولیں۔ "اچھا......؟ تب ہی دروازوں اور کھڑکیوں پر دبیز پردوں کے بجائے مہین پردے لٹک رہے ہیں۔ جیسی خود تنک منک سی ہے، ویسی ہی چیزیں بھی پسند کرتی ہے۔"

وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھیں مگر چپ ہو گئیں۔ ایک ملازمہ صدف کے ساتھ ناشتے کی ٹرالی دھکیلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں داخل ہو رہی تھی۔ بی آپا نے پوچھا۔ "اے دلہن! تم پان بھگونے گئی تھیں اور وہیں کی ہو کر رہ گئیں؟"

وہ ناشتے کی پلیٹیں سینٹر ٹیبل پر رکھتے ہوئے بولی۔ "بس ذرا کچن میں مصروف ہو گئی تھی۔"

وہ اس کا ہاتھ تھام کر اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولیں۔ "یہ ملازموں کے کام ہیں۔ انہیں کرنے دو۔ تم میرے پاس بیٹھو۔ مجھ سے باتیں کرو۔ کھانا پینا تو چلتا ہی رہے گا۔ کوئی ایک دو دن کی بات نہیں ہے۔ میں چار پانچ مہینے یہاں رہوں گی، کرتی رہنا خدمت......"

صدف نے بیزار ہو کر انہیں دیکھا۔ ساس نے کہا۔ "آپا! تم یوں اچانک بغیر اطلاع کے آئی ہو۔ روانہ ہونے سے پہلے فون ہی کر دیتیں......"

وہ ہاتھ نچا کر بولیں۔ "یہ چونچلے رہنے دو۔ اپنوں کے گھر اطلاع دے کر نہیں آیا کرتے۔ بس موڈ ہوا، اٹھ کر چلی آئی۔"

"پہلے سے خبر ہو جاتی تو میں تمہارے لیے ایک کمرہ سیٹ کروا دیتی۔ اب تم صدف سے باتیں کرو، میں جا کر کسی کمرے کی صفائی کروا دیتی ہوں۔"

صدف کی ساس اٹھ کر جانے لگیں، بی آپا نے کہا۔ "سنو! سامان میں میرا پاندان ہے، کسی ملازم کے ہاتھ ذرا بھجوا دو۔ چائے پی کر منہ کڑوا ہو جاتا ہے، فوراً ہی پان کھانے کی عادت ہے۔"

وہ مسکراتی ہوئی وہاں سے چلی گئیں۔ بی آپا نے صدف کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے پوچھا۔ "نعمان کب تک آتے ہیں؟"

"انہیں تو اکثر ہی دیر ہو جاتی ہے، آج بھی کہہ کر گئے ہیں، شاید دس گیارہ بجے سے پہلے نہیں آ سکیں گے۔"

وہ چائے کی ایک چسکی لینے کے بعد بولیں۔ "میاں ایسی ہی باتیں بناتے ہیں۔ گھر میں کوئی دلچسپی نہ ہو تو دفتری مصروفیات کے بہانے کرتے ہیں۔ گھر میں دو چار نہ سہی، ایک ہی بچے کی کلکاری سنائی دے تو پھر بہانے بھول جاتے ہیں۔ شام کو دفتر سے سیدھے کھنچے چلے آتے ہیں۔"

صدف نے ناگواری سے سوچا۔ "بڑی بی بچوں کا ذکر لے کر بیٹھی ہیں، یقیناً ان کی تان مجھ پر ہی ٹوٹے گی کہ میں ماں کیوں نہیں بن رہی ہوں؟"

انہوں نے اس کی طرف جھک کر ذرا سرگوشی میں کہا۔ "اے دلہن! کب تک آزاد پھرو گی اب بس کرو۔ میاں کے پاؤں میں اولاد کی زنجیر ڈال دو ورنہ پچھتاؤ گی۔"

صدف نے چونک کر انہیں دیکھا پھر کہا۔ "یہ میرے بس میں نہیں ہے، قدرت کو جب منظور ہو گا، اولاد ہو جائے گی۔"

وہ مسکرا کر اسے کہنی مارتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولیں۔ "اے قدرت کو تو تب منظور ہو گا، جب تم میاں بیوی راضی ہو جاؤ گے۔ جب میری شادی ہوئی تھی تب میں بھی ماں بننے سے ڈرتی تھی۔ تمہارے خالو نے بڑے پیار سے مجھے رام کیا تھا پھر تو بھری گود ایسی اچھی لگی کہ بچوں کی لائن لگا دی میں نے......"

یہ کہتے ہی وہ منہ دبا کر ہنسنے لگیں پھر بولیں۔ "میں بھی خوش، میاں بھی خوش اور سسرال

بھی خوش۔ پورے بارہ بچے ہوئے تھے۔ لوٹ پوٹ کے چار رہ گئے۔ باقی آٹھ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ اسی لیے کہتے ہیں، زیادہ سے زیادہ بچے جمع کرو، بدقسمتی تو کتنے ہی خرچ کر دیتی ہے، بس نصیب سے دو چار ہی رہ جاتے ہیں۔''

وہ بیزاری سے ان کی باتیں سن رہی تھی۔ وہ چائے کی پیالی خالی کرنے کے بعد بولیں۔

''بی پاشا نے کیا ملازم کو پاندان کے لیے اسلام آباد روانہ کر دیا؟''

صدف اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں دیکھتی ہوں......''

وہ جانا چاہتی تھی۔ ایسے ہی وقت ایک ملازم پاندان اٹھائے ڈرائنگ روم میں داخل ہوا۔ بی آپا نے صدف کا ہاتھ پکڑ کر اسے کھینچ کر اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہا۔ ''اے لو...... پاندان آ گیا۔ اب تم کہیں مت جاؤ۔ مجھے کوئی باتیں کرنے والا نہ ملے تو گھبراہٹ سی ہونے لگتی ہے۔''

اس نے بیزاری سے انہیں دیکھا۔ وہ اپنی گھبراہٹ دور کر رہی تھیں لیکن اس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ملازم پاندان رکھ کر چلا گیا۔ وہ اسے کھول کر ایک پان کے پتے پر چونا لگاتے ہوئے بولیں۔ ''جب تک داڑھ میں پان کا ٹکڑا نہ دبا لوں، دماغ کام ہی نہیں کرتا ہے۔''

اس نے پریشان ہو کر سوچا۔ ''یا خدا! مجھ پر رحم کر...... یہ پان کھائے بغیر میرا دماغ گھما رہی ہیں، اب پان کھا کر ان کا دماغ کام کرے گا تو میرے دماغ کا کیا بنے گا؟''

وہ پان منہ میں رکھ کر بولیں۔ ''اے دلہن! تم کھاؤ گی؟ کہو تو الائچی والا پان لگا دوں۔''

''نہیں، شکریہ میں پان نہیں کھاتی......''

وہ پان چبا چبا کر باتیں کرنے لگیں۔ کچھ ہی دیر میں ان کا منہ پان کی پیک سے بھر گیا۔ اب باتیں کرنے میں انہیں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ منہ اٹھا اٹھا کر بول رہی تھیں۔ صدف پریشان ہو کر انہیں دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ ''کہیں خالہ جان کا پیمانہ صوفے پر نہ چھلک جائے۔''

وہ اٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں جا کر دیکھتی ہوں، اگر ممی نے آپ کا کمرہ صاف کروا دیا ہو تو آپ وہاں چل کر آرام کر لیں۔''

یہ بہانہ اچھا تھا۔ بی آپا کو بھی بات کرنے میں رکاوٹ کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ انہوں نے اس بار اسے نہیں روکا۔ وہ جانے لگی تو انہوں نے منہ اٹھا کر کہا۔ ''بی پاشا سے کہنا کہ وہ ذرا

اگال دان کا بھی بندوبست کر دیں، مجھے تو بڑی پریشانی ہو رہی ہے۔''

''وہ جی اچھا......'' کہہ کر تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔ بی آپا اسے جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں اور زیرِ لب معنی خیز انداز میں مسکرا رہی تھیں۔

☆======☆======☆

صدف غصے سے اپنے کمرے میں ٹہل رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے وہ نیچے ڈرائنگ روم میں تھی۔ وہاں سب ہی گھر کے افراد موجود تھے۔ اچھا خاصا پکنک کا پروگرام بن رہا تھا، بہت دنوں سے آؤٹنگ بھی نہیں ہوئی تھی، سب ہی خوش تھے، بڑھ چڑھ کر پروگرام میں حصہ لے رہے تھے۔ ایسے میں بی آپا نے اولاد کا ذکر شروع کر دیا۔ ''گھر میں بچے ہوتے تو پکنک کا مزہ دوبالا ہو جاتا۔''

صدف یہ سنتے ہی سلگ گئی، وہ سمجھ گئی کہ اب خالہ جان اس موضوع پر بے تکان بولتی چلی جائیں گی۔ اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی لیکن وہ تھیں کہ ریکارڈ کی طرح بجتی چلی گئیں۔ تب ہی وہ جھنجھلا کر وہاں سے چلی آئی تھی۔

وہ ناگواری سے ٹہل رہی تھی پھر اس نے دروازے کی طرف دیکھا۔ نعمان دروازہ کھول کر اندر آ رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔ ''تمہارا موڈ اچانک ہی آف ہو گیا، کیا خالہ جان کی باتیں بری لگیں؟''

''کیا بری نہیں لگنی چاہئیں؟ اچھا خاصا تفریح کا پروگرام بن رہا تھا۔ سب ہنس بول رہے تھے لیکن خالہ جان کو تو ہم سے خدا واسطے کا بیر ہو گیا ہے، انہیں آئے ہوئے دس دن ہو چکے ہیں۔ دن دیکھتی ہیں نہ رات، انہیں کسی کے موڈ کی بھی پرواہ نہیں ہوتی، کسی نہ کسی بہانے بچوں کا ذکر لے بیٹھتی ہیں اور تان اس بات پر ٹوٹتی ہے کہ مجھے ان کے پاس بیٹھے بیٹھے ماں بن جانا چاہیے۔''

وہ ہنسنے لگا، اس نے جھنجھلا کر پوچھا۔ ''آپ ہنس رہے ہیں؟''

''تم بات ہی ایسی کر رہی ہو......''

''ایسی باتیں میں نہیں، آپ کی خالہ جان کرتی ہیں۔ آپ ہی بتائیں، اب تو میں اپنی کوئی ضد بھی نہیں منوا رہی ہوں، سب کچھ قدرت پر چھوڑ دیا ہے، اب جب خدا کو منظور ہوگا، تب اولاد ہو جائے گی۔ انہیں اتنی فکر کیوں ہے؟''

وہ اس کے قریب آ کر بڑی اپنائیت سے بولا۔ ''تم ان کی باتوں کو دل پر مت لیا کرو،

میں تو تمہاری طرف سے مطمئن ہوں، خوش ہوں کہ تم میری اور میرے والدین کی خوشی کو پورا کرنے کے لیے اپنی ضد بھول گئی ہو، تم مجھے ایک بھرپور اور مسرتوں سے بھری زندگی کا خواب دکھا رہی ہو اور مجھے امید ہے کہ جلد ہی اس کی تعبیر ملے گی۔"

وہ بڑی محبت سے بول رہا تھا اور وہ اس سے نظریں چرا رہی تھی، ایک دل کہہ رہا تھا۔

"صدف! تم خود غرض ہو۔ ایسے بھروسا کرنے والے شوہر کو دھوکا دے رہی ہو۔"

پھر ایک دم سے اس کے اندر احساس پیدا ہوا۔ "نہیں...... میں دھوکا نہیں دے رہی ہوں، یہ مرد بڑے سنگ دل ہوتے ہیں ابھی جس قدر قریب ہیں، بچے ہو جانے کے بعد اسی قدر دور ہو جاتے ہیں۔ میں ذہین ہوں، اپنی ذہانت اور حکمتِ عملی سے خود کو ایسے برے وقت سے بچا رہی ہوں، ایسے بچاؤ میں نعمان کا بھی فائدہ ہے، یہ میری تعریفیں سن کر خوش ہوتے ہیں۔"

یہ خیال آتے ہی وہ زیرِلب مسکرانے لگی۔ وہ اس کے حسن کے خزانے کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ رہا تھا۔ اس کی قربت سے سرشار ہو رہا تھا۔ صدف نے اس کی گردن میں اپنی بانہیں حمائل کر کے سوچا۔ "میں انہیں ہمیشہ اسی طرح خوش دیکھنا چاہوں گی۔"

بی آپا اپنے کمرے میں آ گئی تھیں اور اس وقت بستر پر لیٹی کروٹیں بدل رہی تھیں، انہیں صدف کا ایک دم سے اٹھ کر جانا برا نہیں لگا تھا لیکن نعمان کا اس کے پیچھے پیچھے جانا ناگوار گزرا تھا۔ انہیں اپنی سبکی محسوس ہوئی تھی۔ انہوں نے نعمان کو گود میں کھلایا تھا، وہ گود کی گرمی بھول کر بیوی کی آب و ہوا میں چلا گیا تھا۔

انہوں نے کروٹ بدلی مگر چین نہیں آیا۔ وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ پاندان اپنے سامنے رکھ کر ایک پان بنانے لگیں پھر اسے منہ میں رکھ کر کچھ سوچنے لگیں۔ سوچنے کا انداز ایسا تھا جیسے دیا سلائی جلا رہی ہوں مگر یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آگ کس سمت سے لگائی جائے؟

پھر جیسے اچانک ہی دماغ روشن ہو گیا۔ وہ بستر سے اُتر کر کھڑی ہو گئیں، کچھ سوچ کر آگے بڑھیں، اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آ گئیں۔ کوریڈور میں سناٹا چھایا ہوا تھا، وہ دبے قدموں چلتی ہوئی ایک طرف جانے لگیں، پھر بی پاشا کے کمرے کے سامنے آ کر رک گئیں۔ کمرے میں روشنی تھی اس کا مطلب تھا کہ وہ جاگ رہی تھیں۔ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر دروازے پر دستک دے کر کہا۔ "بی پاشا! دروازہ کھولو۔"

کچھ دیر بعد ہی بی پاشا نے دروازہ کھول کر پوچھا۔ "آپا تم! اور اس وقت؟ خیریت تو

ہے؟"

وہ مسکرا کر بولیں۔ "ہاں خیریت ہی ہے۔ بس ذرا نیند نہیں آ رہی تھی، سوچا دو گھڑی تم سے باتیں کر لوں۔ اپنے میاں صاحب کو بتا کر میرے کمرے میں آ جاؤ۔"

"اچھا۔ تم چلو، میں انہیں بتا کر آتی ہوں۔"

انہیں آگ لگانے کی صحیح سمت مل گئی تھی، کچھ دیر بعد ہی وہ دونوں بہنیں آمنے سامنے بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ بی پاشا نے کہا۔ "مجھے احساس ہے تمہیں صدف کا رویہ برا لگا ہوگا۔"

"نہیں۔ میں تم سے دلہن کی شکایت نہیں کروں گی، اسے جیسی تربیت دی گئی ہوگی وہ ویسی ہی بن کر دکھا رہی ہے لیکن نعمان کو تم نے اور میں نے پالا ہے۔ اس کی تربیت میں کہاں کمی رہ گئی تھی جو وہ بزرگوں کا ادب و آداب ہی بھول گیا ہے۔"

"نہیں آپا! تم غلط سوچ رہی ہو۔ میرے بیٹے کی تربیت میں کوئی خامی نہیں ہے۔ وہ تو بہت ہی فرمانبردار بیٹا ہے۔"

"ہاں۔ تو میں کب انکار کر رہی ہوں کہ نعمان فرمانبردار نہیں ہے لیکن تمہارا نہیں وہ اپنی بیوی کا فرمانبردار ہے۔ تم نے دیکھا نہیں تھا، کیسے اپنی بیگم کے پیچھے پیچھے اٹھ کر چلا گیا تھا۔ میں محسوس کر رہی ہوں کہ تم ہی اسے شہ دیتی ہو، میں تو کہتی ہوں، بیٹے کو ممتا کی لگام دو۔ اسے اپنی ڈگر پر چلاؤ لیکن تم تو نہ شاید کچھ دیکھتی ہو نہ سنتی ہو۔"

"تم بے فکر رہو۔ نعمان ایسا نہیں ہے، وہ میرا بیٹا ہے۔ میری بات مان رہا ہے۔ دیکھ لینا ایک سال کے اندر ہی وہ مجھے دادی بنا دے گا۔"

"تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ تمہاری بات مان رہا ہے؟ ہو سکتا ہے وہ اب بھی بیوی کی انگلی پکڑ کر چل رہا ہو۔"

بی پاشا نے انہیں سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا، میں نے جو ایک سال کا الٹی میٹم دیا ہے، وہ ضرور کارگر ثابت ہوگا۔"

بی آپا نے ناگواری سے کہا۔ "ایک سال بھی تو بہت ہوتا ہے تم صرف چھ مہینوں کا وقت دیتیں۔"

وہ مسکرا کر بولی۔ "آپا! تم تو ہتھیلی پر سرسوں جمانے والی بات کر رہی ہو۔"

"میں کیا ہتھیلی پر سرسوں جماؤں گی؟ تمہاری محبت میں بول رہی ہوں، مجھے تو لگتا ہے جیسے تین برس گزر گئے ہیں اس طرح یہ ایک برس بھی گزر جائے گا اور تمہاری حسرت دل میں

ہی رہ جائے گی۔ مجھے تمہاری بہو بیگم کے تیور کچھ ٹھیک نہیں لگتے، ہوسکتا ہے وہ اب بھی راضی نہ ہو اور بیٹا صرف تمہیں بہلا رہا ہو۔''

انہوں نے پریشان ہو کر بہن کو دیکھا۔ وہ ناک سکیڑ کر بولیں۔ ''برا مت ماننا...... تمہیں بھی بڑا شوق تھا، غیروں میں رشتے ناتے جوڑنے کا۔ اب نتیجہ بھگت رہی ہو۔ میری بیٹی کو بہو بنالیا ہوتا تو اس وقت چھ بچے تمہیں دادی دادی کہتے پھر رہے ہوتے۔''

انہوں نے چونک کر تعجب سے پوچھا۔ ''تین برس میں چھ بچے؟''

وہ گڑبڑا کر بولیں۔ ''وہ میں...... جڑواں کے حساب سے بول گئی شاید؟ چلو...... چھ نہ سہی تین تو ضرور ہوتے۔ تمہارا ایک ہی بیٹا ہے اور تمہیں وارث کی فکر نہیں ہے۔ اچھا رشتہ جوڑا ہے......''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولیں۔ ''میں بھلا کیا رشتہ جوڑتی؟ جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں۔''

''جوڑے آسمانوں پر بنتے ہیں مگر بچے تو زمین پر ہوتے ہیں لیکن یہاں تو ایک چڑیا کا بچہ بھی نہیں ہوا۔ ایسے آسمانی جوڑے کا کیا فائدہ؟''

بی پاشا نے افسردگی سے سر جھکا لیا۔ لوہا گرم ہو گیا تھا۔ انہوں نے چوٹ ماری۔ ''اچھا بھلا رشتہ ہو رہا تھا، میری بیٹی اس گھر کی بہو بننے والی تھی لیکن یہ صدف نہ جانے کہاں سے بیچ میں آ گئی؟ یہ نعمان کے اور میری بیٹی کے بیچ میں آ گئی تھی، تو کیا اب میری بیٹی ان دونوں کے بیچ میں نہیں آ سکتی؟''

بی پاشا نے چونک کر انہیں دیکھا پھر کہا۔ ''پرانی باتوں کو چھوڑو۔ میں نے جو دوسری بہو لانے کی دھمکی دی ہے، وہ ضرور اپنا اثر دکھائے گی۔''

وہ بھڑکانے والے انداز میں بولیں۔ ''ایسی دھمکیوں سے کچھ نہیں ہوگا جو کرنا ہے، وہ کر گزرو۔ آج کل کی یہ جوان اولاد ہم بزرگوں کو بے وقوف سمجھتی ہے وہ تمہیں باتوں سے بہلا رہا ہے، تم بہل رہی ہو اور بہو دور کھڑی تمہارے احمق بننے کا تماشا دیکھ رہی ہے اور خوش ہو رہی ہے۔''

''کیا مطلب؟''

''سیدھی سی بات ہے، اپنی دھمکی کو دھمکی نہ رہنے دو۔ اس پر جلد ہی عمل کر ڈالو۔ دلہن صاحبہ کے سارے مزاج ہوا ہو جائیں گے۔''

وہ سوچ میں پڑ گئیں۔ بی آپا کی باتوں سے دل میں یہ اندیشہ جنم لینے لگا تھا کہ کیا واقعی بیٹا اسے بے وقوف بنا رہا ہے؟ انہوں نے پوچھا۔ ''آپا! میں یہ کیسے معلوم کروں کہ وہ دونوں مجھے دھوکا دے رہے ہیں؟ دوسری بہو لانے کی کوئی ٹھوس وجہ تو میرے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔''

بی آپا سر جھکا کر سوچنے لگیں پھر بولیں۔ ''وجہ ہو یا نہ ہو، دوسری شادی کوئی گناہ نہیں ہے، مرد تو چار چار شادیاں کر سکتے ہیں۔''

''نہیں آپا! پھر بھی سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا چاہیے۔ کوئی ٹھوس وجہ ہوگی تو بیٹے کا انکار دم توڑ دے گا۔ وہ بغیر کسی وجہ کے دوسری شادی پر کیوں راضی ہوگا؟''

بی آپا نے کچھ سوچا پھر سرگوشی میں کہا۔ ''سنو! مجھے تو لگتا ہے، تمہاری بہو ہی بانجھ ہے۔ تین سال سے میاں کو بے وقوف بنا رہی ہے کہ بچے پیدا کر کے پابند نہیں ہونا چاہتی۔ وہ ضرور اپنی کوئی کمزوری چھپا رہی ہے ورنہ شادی کے فوراً بعد ہی ہر عورت کے اندر ممتا کا جذبہ جاگ اٹھتا ہے۔''

بی پاشا گہری سنجیدگی سے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ وہ ان کے لیے سوچ کے نئے دروازے کھول رہی تھیں۔ ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈال رہی تھیں جن پر بی پاشا نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔

دوسری صبح انہوں نے بیٹے سے کہا۔ ''نعمان! ناشتے کے بعد میرے کمرے میں آؤ۔ مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔''

بی آپا نے معنی خیز انداز میں مسکرا کر ان ماں بیٹے کو دیکھا پھر سر جھکا کر ناشتا کرنے لگیں۔ ان کی لگائی ہوئی آگ بی پاشا کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔ نعمان ناشتے سے فارغ ہو کر اپنی کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ممی! جلدی کریں، مجھے دیر ہو رہی ہے، آج نئے معاہدے کے سلسلے میں بہت ضروری میٹنگ ہونی ہے، میں پہلے ہی لیٹ ہو چکا ہوں۔''

بی پاشا پہلے ہی بھری ہوئی تھیں۔ رات بی آپا نے اس میں مزید بارود بھر دیا تھا۔ وہ چبھتے ہوئے لہجے میں بیٹے سے بولی۔ ''میں جانتی ہوں، تم اپنے ڈیڈی کے کاروبار کو بہت عروج اور بہت ترقی دے رہے ہو لیکن کس لیے......؟ تمہارے بعد کون ہے جو اس پھیلے ہوئے کاروبار کو سنبھالے گا؟''

نعمان اور صدف نے چونک کر انہیں دیکھا، ان کا طنز بھرا لہجہ کچھ عجیب سا لگا۔..

بولیں۔ ''پہلے تمہارے ڈیڈی یہ کاروبار سنبھالتے رہے تھے، اب تم سنبھال رہے ہو لیکن تمہارے بڑھاپے میں کون اس دولت اور جائیداد کو سنبھالے گا؟ کون اس کروڑوں کے کاروبار کا وارث بنے گا۔''

صدف پریشان ہو کر ساس کی باتیں سن رہی تھی۔ ایسے ہی وقت اس کی نظر بی آپا پر پڑی جو بڑی پُرسکون دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ فوراً سمجھ گئی کہ یہ آگ ان ہی کی لگائی ہوئی ہے۔نعمان صدف کی طرف سے مطمئن تھا۔ وہ سب کی خوشیوں کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس سے بھرپور تعاون کر رہی تھی لیکن گھر کے بزرگ طنز کے نشتر اچھالنے سے باز نہیں آ رہے تھے۔ رات کو بھی اولاد کے ذکر نے اسے پریشان کر دیا تھا اور اب صبح ہوتے ہی پھر وہی ذکر چھڑ گیا تھا۔

اس نے جھنجلا کر ماں سے پوچھا۔ ''کیا اولاد کے علاوہ اس گھر میں کوئی دوسری بات نہیں ہو سکتی......؟''

وہ بولیں۔ ''جس گھر میں جو مسئلہ چل رہا ہو، اسی پر دن رات بحث کی جاتی ہے اور وارث کا مسئلہ ہمارے لیے بہت اہم ہے لیکن تم اور تمہاری بیگم اس مسئلے کو کوئی اہمیت نہیں دے رہے ہو۔''

وہ ذرا تیز لہجے میں بولا۔ ''یہ مسئلہ ہمارے لیے بھی اہم ہے۔ وہ آنے والا صرف آپ کا پوتا نہیں ہمارا بچہ بھی ہوگا اور والدین ہونے کے ناتے ہمیں اس کی زیادہ فکر ہے۔''

اس کے لہجے نے ماں کو چونکا دیا، بیٹے نے پہلی بار اونچی آواز میں بات کی تھی۔ صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ بیوی کا جادو سر چڑھ کر بول رہا ہے اور بی آپا کی یہ بات درست معلوم ہو رہی تھی کہ وہ بزرگوں کا ادب ولحاظ بھول گیا ہے۔

باپ جواب تک خاموشی سے ناشتا کر رہا تھا اور ان کی باتیں سن رہا تھا، ایک جھٹکے سے اٹھ کر غصے سے بولا۔ ''نعمان! تم یہ کس لہجے میں اپنی ماں سے بات کر رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''تو پھر آپ ہی انہیں سمجھائیں، یہ کون سا وقت ہے اس موضوع پر بات کرنے کا؟ میں انہیں کیسے یقین دلاؤں کہ سب کچھ ان کی مرضی کے مطابق ہو رہا ہے۔''

ماں نے کہا۔ ''میں کیسے یقین کر لوں؟ تم تین برس سے ہمیں دھوکا دیتے آ رہے ہو، اب بھی دے سکتے ہو۔''

صدف اس صورتِ حال سے پریشان ہو رہی تھی۔ نعمان نے کہا۔ ''آپ صبر تو کریں،

ایک برس بعد ساری حقیقت آپ کے سامنے آ جائے گی۔ یہ یقین ہو جائے گا کہ ہم آپ کو دھوکا نہیں دے رہے ہیں۔''

وہ صدف کی حمایت میں بول رہا تھا، دعویٰ کر رہا تھا کہ ایک برس بعد ان سب کو اس خاندان کا وارث دے کر مطمئن کر دے گا لیکن صدف کا تو جیسے سارا اطمینان ہوا ہو گیا تھا۔ اس نے گھور کر بی آپا کو دیکھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر نعمان اور بی پاشا کے درمیان آ کر بولیں۔ ''بچہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے، تمہیں ذرا صبر سے کام لینا چاہیے۔''

وہ بولیں۔ ''تین برس سے صبر ہی تو کرتی آ رہی ہوں لیکن اب یہ ایک برس پہاڑ کی طرح لگ رہا ہے۔''

نعمان نے کہا۔ ''ایک برس کا وقت بھی آپ ہی نے دیا ہے۔''

بی آپا نے ان دونوں کو دیکھا پھر کہا۔ ''تم دونوں یہ کیا ایک برس گائے جا رہے ہو؟ بی پاشا تم تو بڑی ہو، سمجھ دار ہو کیا اتنی سی بات نہیں سمجھ سکتیں کہ ایک دو برس کا نہیں، ایک دو مہینوں کا انتظار کرنا ہے۔''

سب نے چونک کر انہیں دیکھا۔ وہ صدف کو دیکھ کر بڑے میٹھے انداز میں مسکرائیں پھر بولیں۔ ''بارش برسنے سے پہلے گھٹا چھاتی ہے، ایک دو ماہ میں ہی دلہن کے پاؤں بھاری ہوں گے تو باقی کا عرصہ پلک جھپکتے میں ہی گزر جائے گا۔''

ان کی بات سن کر نعمان نے بڑے پیار سے مسکرا کر صدف کو دیکھا، ایسے میں اسے شرمانا مسکرانا چاہیے تھا لیکن اس نے سر جھکا لیا جیسے میاں سے نظریں چرا رہی ہو، بی پاشا شکایتی نظروں سے بی آپا کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ ان کے بیٹے اور بہو کو ایک دو ماہ کی چھوٹ دے کر اس گرما گرم معاملے کو پھر سے لٹکا رہی تھیں۔ وہ پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف جانے لگیں اور زیرِلب بڑبڑانے لگیں۔ ''سب اپنی اپنی بولی بول رہے ہیں۔ کسی کو میرا احساس نہیں ہے۔ میں نے تین برس انتظار کیا ہے۔ ایک دو ماہ اور کر لوں گی لیکن یہ یقین سے کہتی ہوں کہ پھول کا پودا پھول ہی دے گا، پھل کبھی نہیں دے گا......''

وہ ناگواری سے بڑبڑاتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ ان کے دل میں بی آپا کی کہی ہوئی یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ بہو بانجھ ہے۔ منصوبہ بندی کی آڑ میں اپنی کمزوری چھپا رہی ہے۔

باپ نے بیٹے سے کہا۔ ''نعمان آج کی صورتِ حال دیکھ کر میں اندازہ کر رہا ہوں کہ

اگر وارث کا مسئلہ حل نہ ہوا تو اس گھر کا سکون برباد ہو جائے گا اور ایسی تباہی سے پہلے ہی میں چاہوں گا کہ دوسرا راستہ اختیار کر لیا جائے۔''

صدف نے سر اٹھا کر پریشانی سے سسر کو دیکھا۔ دوسرے راستے کا مطلب دوسری بہو تھا۔ بات اس کی سوچ سے زیادہ بگڑ رہی تھی۔ بی آپا نے اپنے بہنوئی سے کہا۔ ''ماں گئی تو اب آپ بچے کے پیچھے پڑ گئے کیوں صبح صبح اسے پریشان کر رہے ہیں؟ خدارا آپ اپنے کمرے میں جائیں اور آفس جانے کی تیاری کریں۔''

وہ بیٹے کو گھورتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے۔ بی آپا نے مسکرا کر نعمان کو دیکھا پھر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔ ''تم سمجھ دار ہو، اپنے ماں باپ کی بے چینی کو سمجھ سکتے ہو، یہ اپنے دل سے مجبور ہیں، دادا دادی بننے کی حسرت انہیں بولنے پر مجبور کر رہی ہے۔ تم ان کی باتوں کو دل پر مت لو۔ چاند چڑھے گا تو یہ ہی نہیں...... پوری دنیا دیکھے گی۔''

وہ بولا۔ ''لیکن ان کی عجلت ہمیں الجھن میں مبتلا کر دیتی ہے خالہ جان! آپ ہی انہیں سمجھائیں، ان کی غلط فہمی دور کریں، ہم انہیں کوئی دھوکا نہیں دے رہے ہیں۔''

صدف انہیں چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی اور نعمان کی معصومیت پر ناگواری سے سوچ رہی تھی۔ ''اونہہ...... آگ لگا کر تماشا دیکھنے والے غلط فہمیاں پیدا کرتے ہیں، دور نہیں کرتے اور خالہ جان بڑی خوب صورتی سے ہمارے آشیانے میں آگ بھڑکا رہی ہیں اور نعمان ان سے اچھائی کی امید لگا رہے ہیں۔''

وہ نعمان کی پیشانی چوم کر بولیں۔ ''تم پریشان نہ ہو، میں ہوں نا، سب سنبھال لوں گی، تم آرام سے آفس جاؤ، ذہن پر کوئی بوجھ نہ لو۔ جب تک میں یہاں ہوں، تمہیں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے جیسے ابھی میں نے بات سنبھالی ہے، ویسے ہی آئندہ بھی سنبھالتی رہوں گی۔''

وہ جس انداز سے بات سنبھال رہی تھیں، صدف اس انداز کو اچھی طرح سمجھ رہی تھی۔ نعمان اور اس کے ڈیڈی آفس چلے گئے تو وہ صدف کے قریب آ کر بڑی اپنائیت سے بولیں۔ ''دلہن! بی پاشا کی باتوں کا برا نہ ماننا، ان کے ذہن پر تین برس کی بے اعتمادی چھائی ہوئی ہے، تم فکر نہ کرو۔ تمہارے ماں بننے کے آثار نظر آتے ہی ان کی بے اعتمادی ڈھل جائے گی۔''

صدف خاموش کھڑی ان کی باتیں سن رہی تھی اور اندر ہی اندر غصے سے کھول رہی تھی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر بولیں۔ ''میں تو دن رات دعائیں مانگتی ہوں کہ جلد از جلد خوشی کی خبر سننے کو ملے۔ کیسی خالی خالی سی لگتی ہو، وہاں تمہاری گود بھرنے گی اور یہاں سارا گھر خوشیوں سے بھر جائے گا۔ ہم بزرگ تو صرف دعاؤں کا ہی سہارا دے سکتے ہیں باقی جو خدا کو منظور...... یا تم دونوں کی مرضی۔''

انہوں نے اپنی بات کے آخر میں طنز کا نشتر چلانا ضروری سمجھا۔ صدف نے چبھتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھا پھر پلٹ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ وہ بھی اطمینان کی ایک گہری سانس لے کر بی پاشا کے کمرے میں آ گئیں۔

وہ انہیں دیکھتے ہی بولیں۔ ''آپا! تم بھی خوب ہو۔ میری حمایت کرنے کے بجائے، نعمان کی حمایت میں بول رہی تھیں؟ رات مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ میں بیٹے اور بہو کو شہ دیتی ہوں اور اب خود کیا کر رہی تھیں؟''

وہ مسکرا کر بولیں۔ ''میں جانتی تھی، تم ناراض ہو رہی ہو گی۔ میں اس وقت جو کر رہی تھی، ٹھیک کر رہی تھی۔ میری حکمتِ عملی کو سمجھو۔ تم بول رہی تھیں، بہنوئی صاحب بھی بولنے لگے تھے۔ میں بھی شروع ہو جاتی تو وہ ہتھے سے اکھڑ جاتا۔ تم نے دیکھا نہیں تھا۔ وہ ذرا سی بات پر آگ بگولا ہو گیا تھا۔ جوان اولاد سے منہ ماری ہوتی تو کیا تمہیں اچھا لگتا؟''

وہ ذرا ناراضی سے منہ پھیر کر بیٹھ گئیں۔ وہ ان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولیں۔ ''جوان اولاد کو اس طرح بھڑکایا نہیں جاتا۔ میں اس کی حمایت نہیں کر رہی تھی، معاملے کو ٹھنڈا کر رہی تھی۔''

وہ چڑ کر بولیں۔ ''معاملہ گرم ہو رہا تھا تو ہونے دیتیں، آخر ہم میاں بیوی کب تک احمق بنتے رہیں گے؟ آج دو ٹوک فیصلہ ہو ہی جاتا تو اچھا تھا۔ وہ ہمیں وارث دے سکتی ہے تو دے نہیں تو ہم دوسری بہو لے آئیں گے۔''

''کیا پاگل ہو رہی ہو؟ ابھی ایسا جوش دکھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم تو بے صبری ہوئی جا رہی ہو۔ رات تک تو تم بڑی سمجھ داری کی باتیں کر رہی تھیں۔ صبح ہوتے ہی کیا ہو گیا ہے؟ بم کی طرح پھٹ پڑی ہو؟''

بی پاشا دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر بولیں۔ ''میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ ایک وارث کے لیے ان دونوں نے ہمیں ترسا کر رکھ دیا ہے۔ ہمارا ایک ہی بیٹا ہے اور بہو نے

آتے ہی اس پر اپنی حکومت قائم کر لی ہے۔ بچوں کے معاملے میں بھی مارشل لاء لگائے بیٹھی ہے۔ تم ہی بتاؤ، کیا ایسا کسی خاندان میں دیکھا ہے؟ تم بھی بہوئیں لائی ہو، آج پوتے پوتیوں میں کھیل رہی ہو لیکن یہاں کا تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔''

بی آپا دونوں کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔ ''سب قیامت کی نشانیاں ہیں۔ اتنی عمر گزر گئی نہ ایسی بہو دیکھی نہ سنی، نئی صدی ہے۔ جو نہ ہو، وہ کم ہے۔''

وہ الجھ کر بولیں۔ ''نئی صدی کی اور قیامت کی نشانیاں میرے ہی گھر سے ظاہر ہونی تھیں۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولیں۔ ''اب تو انسان کی کرنی کا پھل خدا اس دنیا میں ہی دے دیتا ہے۔ میری بیٹی شمیم نعمان کی دلہن بنتے بنتے رہ گئی۔ اس نے کوئی بد دعا تو نہیں دی ہو گی مگر خدا تو اس مظلوم کو دیکھ رہا ہے۔ کیا کمی تھی اس میں......؟''

بی پاشا نے مجرمانہ انداز میں سر جھکا لیا۔ وہ بولیں۔ ''سب کہتے ہیں، وہ بولتی بہت ہے، ارے میں کہتی ہوں، میرے آنگن کی چڑیا ہے، چہکتی پھرتی ہے، جلنے والے جلتے ہیں تو جلا کریں، بچوں کی تو ایسی شوقین ہے، دن بھر بھائی کے بچوں کو گود میں لیے لیے پھرتی ہے، دیکھ لینا جس گھر جائے گی، بچوں کی لائن لگا دے گی۔ تم نے ایسی زرخیز کھیتی کو ٹھکرا کر، ایک بنجر کو سینے سے لگایا ہے تو اس گھر میں پھول نہیں کھلیں گے، خاک ہی اُڑے گی اور اُڑ رہی ہے۔''

بی پاشا نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا پھر ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''بس کریں آپا! میں نے اپنی معصوم بھانجی کو نظر انداز کیا تھا، آج سزا پا رہی ہوں۔ یہ ضرور شمیم کی آہ ہے جو مجھے خوشیوں سے محروم کیے ہوئے ہے۔''

''خدا کے بھید وہی جانتا ہے، شاید تمہاری سزا ختم کرنے کے لیے ہی وہ اب تک کنواری بیٹھی ہے۔''

بی پاشا نے ذرا ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ''آپا...... اگر دوسری بہو کے آنے سے ہی ہماری خوشیاں پوری ہو سکتی ہیں تو کیا تم اپنی شمیم کا ہاتھ میرے نعمان کے ہاتھ میں دینے کے لیے راضی ہو جاؤ گی؟''

بی پاشا نے تو جیسے ان کے دل کی بات کہہ دی تھی۔ وہ اپنے اندر کی خوشی کو دباتے ہوئے بولیں۔ ''بہن...... بہن کے کام نہیں آئے گی تو اور کوئی آئے گا؟ شمیم تمہاری بھی بیٹی ہے، جب جی چاہے اسے یہاں لے آنا۔''

بی پاشا ایک دم سے خوش ہو کر بہن سے لپٹ گئیں، بی آپا ان سے زیادہ خوش ہو رہی تھیں مگر بھرپور اظہار سے پرہیز کر رہی تھیں۔ وہ دور تک کی سوچ رہی تھیں۔ کروڑوں کی جائیداد ان کے سامنے تھی۔ جس پر آئندہ ان کی بیٹی شمیم راج کرنے والی تھی۔ برسوں کا سپنا پورا ہونے والا تھا۔ بی پاشا ان کی احسان مند ہو رہی تھیں جبکہ وہ صدف کی احسان مند ہو رہی تھیں کہ وہ اس گھر کو کوئی وارث نہ دے کر ان کی بیٹی کی آمد کو سہل بنا رہی تھی۔

بی پاشا نے ان سے الگ ہوتے ہوئے کہا۔ ''اس رشتے سے پہلے ایک رکاوٹ ہے، اسے دور کرنا ضروری ہے۔ تم نے نعمان کا رویہ دیکھا ہے، وہ صدف سے بہت مانوس ہے۔ بلاوجہ اس پر سوکن لا کر اسے دکھی نہیں کرنا چاہے گا، میں نے تم سے رات کو بھی کہا تھا، اب بھی کہہ رہی ہوں کہ دوسری بہو لانے کی ہمارے ہاتھ میں کوئی ٹھوس وجہ ہونی چاہیے۔''

بی آپا انہیں سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھنے لگیں پھر بولیں۔ ''ہاں، اس پہلو پر تو میں بھی غور کر رہی ہوں۔ تم ایک دو ماہ اور صبر کر لو۔ میں اس عرصے میں نعمان کو راضی کرنے کا کوئی نہ کوئی راستہ نکال ہی لوں گی۔''

وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولیں۔ ''آپا! پہلے میں نے تین برس انتظار کیا پھر بیٹے بہو کو ایک برس کا وقت دیا۔ اس ایک برس میں سے چھ مہینے گزر چکے ہیں جیسے تیسے یہ دو مہینے بھی گزار لوں گی۔ اگر بہو اس دوران میں امید سے ہو گئی تو اچھا ہے۔''

بی آپا نے مسکرا کر ان کا جملہ پورا کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر نہ ہوئی تو میری شمیم مسز نعمان بنے گی...... کیوں...... ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟''

وہ ان سے لپٹ کر بولیں۔ ''بالکل ٹھیک کہہ رہی ہو......''

وہ دونوں ایک دوسرے سے لپٹ کر خوشی کا اظہار کرنے لگیں۔ آئندہ مستقبل میں ایک بہن دوسری بہن کے کام آنے والی تھی۔

☆======☆======☆

بی پاشا کوٹھی کے باغیچے میں ٹہل رہی تھیں اور کیاری میں لگے پودوں کو دیکھ رہی تھیں۔ جنہیں دو ماہ پہلے لگایا گیا تھا اور اب ان میں پھول کھل رہے تھے۔ وہ جھک کر ان پھولوں کو بڑی نرمی سے چھو کر دیکھنے لگیں۔ ان کے چہرے پر سکون چھایا ہوا تھا۔

دو ماہ کے عرصے میں بی آپا کی پیش گوئی سچ ثابت ہو گئی تھی۔ انہیں یقین ہونے لگا تھا کہ وہ ایک بانجھ بہو لے آئی ہیں۔ اگر وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل ہوتی تو سوکن کے نام

سے خوف زدہ ہو کر ہی خوش خبری سنا چکی ہوتی لیکن اب تک ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی تھی۔ اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ قدرتی طور پر مجبور ہے اور بی پاشا اب اپنی بہن کے مشورے سے اس حقیقت سے پردہ اٹھانے والی تھیں اور وہ ایسا ثبوت ہوتا کہ جس کے سامنے بیٹا بھی جھکنے پر مجبور ہو جاتا۔

بی آپا اپنے کمرے میں بیٹھی پان پر پان چبا رہی تھیں۔ ان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ دو ماہ میں انہوں نے بی پاشا کے اندر جو بارود بھرا تھا، وہ آج رات پھٹنے والا تھا۔

صدف آج بھی اپنی ضد پر اُڑی ہوئی تھی اور ڈاکٹر رملا کے سمجھانے کے باوجود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کا کام کر رہی تھی۔ اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ جو گرجتے ہیں وہ برستے نہیں ہیں۔ خالہ جان اس کے ساس سسر کو بھڑکا رہی ہیں اور وہ بھڑک رہے ہیں، یہ چلی جائیں گی تو امن وامان ہو جائے گا لیکن وہ تو جیسے یہاں آ کر جم ہی گئی تھیں۔ جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔

صدف نے سوچا۔ ''کب تک رہیں گی؟ آخر ایک نہ ایک دن تو جائیں گی، کراچی سے کیا، دنیا سے ہی جائیں گی۔''

وہ صحیح سوچ رہی تھی۔ آگ لگانے والے آگ لگا کر چلے جاتے ہیں۔ راکھ بننے کا انتظار نہیں کرتے لیکن وہ اس کی سوچ کے برعکس راکھ کا ڈھیر دیکھنا چاہ رہی تھیں کیونکہ انہیں اسی ڈھیر سے اس ہیرے کو نکالنا تھا جو ان کی بیٹی کی زندگی چمکانے والا تھا۔

ڈنر کے بعد چائے کا دور چل رہا تھا گھر کے سب ہی افراد ڈرائینگ روم میں جمع تھے کوئی خاص موضوع زیرِ بحث نہیں تھا۔ صدف چائے پینے کے بعد اٹھ کر جانے لگی تو ساس نے پوچھا۔ ''صدف! کہاں جا رہی ہو؟''

وہ پلٹ کر بولی۔ ''میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔''

وہ بولیں۔ ''ابھی مت جاؤ۔ یہاں بیٹھو...... مجھے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔ تمہاری موجودگی بھی لازمی ہے۔''

وہ ساس کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔ نعمان بھی ماں کو دیکھ رہا تھا۔ وہ بولیں۔ ''ہم نے وارث کے انتظار میں تین برس گزارنے کے بعد تم دنوں سے پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کہ تم اپنی مرضی چلا رہے ہو۔ لائف کو انجوائے کرنے کے لیے اولاد کی آمد کو

روک رہے ہو۔ تب ہم نے تمہیں ایک سال کا وقت دیا تھا۔''

نعمان نے مداخلت کی۔ ''ممی! یہ تو ہم سب ہی جانتے ہیں۔ ان باتوں کو دہرانے کا مطلب......؟''

''مطلب نہیں مقصد...... ان باتوں کو دہرانے کا مقصد تمہیں یہ احساس دلانا ہے کہ ایک برس کی دی گئی چھوٹ کے آٹھ ماہ گزر چکے ہیں۔''

وہ مسکرا کر بولا۔ ''ابھی چار ماہ باقی ہیں ممی!''

''میں بھی جانتی ہوں لیکن پوچھنا یہ ہے کہ جو کام آٹھ مہینوں میں نہ ہو سکا، وہ چار ماہ میں کیسے ہوگا؟''

نعمان نے صدف کو دیکھا۔ باپ نے کہا۔ ''ہم نے اس ایک برس میں اپنا وارث چاہا تھا مگر تم مسلسل ہمیں مایوس کرتے آ رہے ہو۔''

وہ بولا۔ ''اولاد کی حسرت ہمارے دل میں بھی ہے لیکن قدرت دیر کر رہی ہے تو ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

ایسے ہی وقت بی آپا نے چھالیا کی ڈلی کو سروتے سے کاٹا، کھٹ کی آواز پر صدف نے انہیں دیکھا، ان کا انداز ایسا تھا جیسے چھالیا نہیں، رشتے کاٹ رہی ہوں۔ بی پاشا نے حتمی لہجے میں کہا۔ ''ہم یہی دیکھنا چاہتے ہیں کہ دیر قدرت کی طرف سے ہو رہی ہے یا تمہاری طرف سے؟''

صدف نے پریشان ہو کر پہلے ساس سسر کو پھر نعمان کو دیکھا۔ سسر نے کہا۔ ''ہم نے بہت انتظار کیا ہے۔ اب وہی ہوگا جو ہم چاہیں گے۔''

نعمان نے سوچتی ہوئی نظروں سے ان تینوں بزرگوں کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''آپ سب کیا چاہتے ہیں؟''

باپ نے کہا۔ ''ہم اپنا وارث چاہتے ہیں۔''

اس نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''اور اس کے لیے آپ دوسری بہو لانا چاہتے ہیں؟ یہ سوچے بغیر کہ خدا کے گھر دیر ہے، اندھیر نہیں ہے؟''

ماں نے بہو کو دیکھا پھر بڑے پیار بھرے لہجے میں بیٹے سے کہا۔ ''نہیں بیٹا! ہم ایسے ظالم نہیں ہیں۔ بغیر کسی وجہ کے صدف پر سوکن نہیں لانا چاہتے۔''

ان دونوں نے الجھی ہوئی نظروں سے اپنے بزرگوں کو دیکھا۔ بی پاشا نے کہا۔ ''یوں تو

ایک بہت اہم وجہ ہمارے ہاتھ میں ہے لیکن یہ وجہ تصدیق کے بغیر بے بنیاد ہے۔ ہم دوسری بہو لائیں گے مگر کچھ ضروری کارروائی کرنے کے بعد......''

نعمان نے پوچھا۔ ''کیسی کارروائی؟ آپ سب کیا چاہتے ہیں؟''

ماں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''بہو کا میڈیکل چیک اَپ......''

صدف نے چونک کر پریشان ہو کر ساس کو دیکھا۔ بات جہاں سے چلی تھی، وہیں آ کر ٹھہر گئی تھی۔ کچھ عرصہ پہلے بھی گھر میں اس کے میڈیکل چیک اَپ کی بات ہوئی تھی۔ نعمان نے ایک نظر صدف پر ڈالی پھر کچھ سوچنے کے بعد ماں سے کہا۔ ''اگر آپ کی تسلی کے لیے صرف صدف کا میڈیکل چیک اَپ ضروری ہے تو مجھے انکار نہیں ہے مگر ایک بات یاد رکھیں کہ اگر یہ پوزیٹو ہوئی تو میں دوسری شادی نہیں کروں گا۔''

صدف جواب تک خاموشی سے سب کی باتیں سن رہی تھی، ایک دم سے چیخ کر بولی۔

''میں میڈیکل چیک اَپ نہیں کراؤں گی۔ آپ سب میرے بارے میں بات کر رہے ہیں، فیصلے کر رہے ہیں لیکن مجھ سے کوئی مشورہ نہیں لے رہے ہیں اور نعمان! تم نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ یہ میرا چیک اَپ کرانا چاہتے ہیں تو کرا لیں؟ کل کو یہ مجھے کنوئیں میں پھینکنے کو کہیں گے تب بھی تم ان کی ہاں میں ہاں ملانا......''

وہ بولا۔ ''تم غلط سمجھ رہی ہو۔ میں آئے دن کے جھگڑوں کو ختم کرنے کے لیے ان کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہوں، مجھے پوری امید ہے کہ تم پوزیٹو ہو گی۔''

بی پاشا اور بی آپا صدف کو دیکھ رہی تھیں، اس کا میڈیکل چیک اَپ سے کترانا ان کے اندیشوں کو درست ثابت کر رہا تھا۔ بی آپا نے آگ لگانے والے انداز میں کہا۔ ''اے دلہن! سانچ کو آنچ کیا......؟ اللہ کا نام لے کر گزر جاؤ اس مرحلے سے...... رپورٹ ہماری سوچ کے مطابق ہی آئے گی۔''

انہوں نے آخری جملہ بڑے معنی خیز انداز میں کہا تھا۔ صدف نے سلگ کر انہیں دیکھا۔ نعمان بڑی محبت سے سمجھانے والے انداز میں بولا۔ ''ہاں صدف! ہمارے بزرگ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔''

اس نے گہری نظروں سے نعمان کو دیکھا پھر کچھ سوچنے کے بعد کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں میڈیکل چیک اَپ کے لیے راضی ہوں لیکن خامی تو تمہارے اندر بھی ہو سکتی ہے؟''

سسر نے ایک جھٹکے سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''بہو! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟''

وہ بولی۔ ''کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی...... اولاد نہ ہونے کی وجہ صرف میں ہی نہیں...... آپ کے صاحبزادے بھی ہو سکتے ہیں۔''

بی پاشا اور بی آپا نے چونک کر اسے دیکھا۔ بی پاشا نے کہا۔ ''تم فضول باتیں کر رہی ہو۔ نعمان کے ڈیڈی میں کوئی خرابی نہیں تھی تو بیٹے میں کیسے ہو سکتی ہے؟''

صدف نے ساس سے کہا۔ ''میری ممی میں بھی کوئی خرابی نہیں تھی، اس لیے میں پیدا ہو کر اس گھر کی بہو بنی ہوں۔ جب وہ ماں بن سکتی ہیں تو میں بھی بن سکتی ہوں۔ آپ بزرگ ہیں، میری بات سمجھنے کی کوشش کریں۔ خامی کسی میں بھی ہو سکتی ہے، اس لیے میڈیکل چیک اَپ صرف میرا نہیں، نعمان کا بھی ہونا چاہیے۔''

بی پاشا اس بات پر جھنجھلا رہی تھیں۔ انہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا تو نعمان نے فوراً ہی انکار کے انداز میں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''نو ممی! یہ درست کہہ رہی ہے جب اس کا میڈیکل چیک اَپ کرایا جائے گا تو میرا بھی ہونا چاہیے۔ مجھ میں بھی کوئی نقص ہو سکتا ہے۔ جب مجھے اعتراض نہیں ہے تو آپ کو بھی اعتراض نہیں کرنا چاہیے۔''

☆======☆======☆

بی پاشا نے اپنے میاں کی طرف دیکھا۔ بیٹا اپنی بیوی کے حق میں بول رہا تھا، لیکن اتنے انصاف سے بول رہا تھا کہ ان میں سے کوئی اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔

بی پاشا اور بی آپا کے نئے حملوں کے سامنے صدف کی پچھلی حکمتِ عملی کمزور پڑ رہی تھی۔ وہ دوسرے ہی دن ڈاکٹر رملا کے پاس پہنچ گئی۔ وہ تمام صورتِ حال سننے کے بعد بولی۔

''یہ بات تمہارے حق میں بڑی اچھی ہے کہ نعمان تمہارا ساتھ دے رہا ہے، تم پوزیٹو ہو تو وہ دوسری شادی نہیں کرے گا۔ وہ ابھی سے تمہارا بچاؤ کا راستہ ہموار کر رہا ہے۔''

اس نے قائل ہونے کے انداز میں سر ہلایا پھر پوچھا۔ ''اگر میں نیگیٹو ہوئی تو......؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''پھر تو وہی ہوگا، جو تمہارے ساس سسر چاہتے ہیں۔ ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے، نعمان کی رپورٹ بھی نیگیٹو ہو سکتی ہے۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''اگر ایسا ہو گیا تو پھر سمجھو، سارا معاملہ ہی ٹھنڈا ہو جائے گا۔ سب کو چپ لگ جائے گی۔''

''نعمان کی رپورٹ جیسی بھی آئے، بس تمہاری رپورٹ نیگیٹو نہیں ہونی چاہیے۔''

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلا کر کچھ سوچنے لگی پھر بولی۔ ''ہم دونوں کی پوزیٹو رپورٹ

میرے حق میں بہتر نہیں ہے۔ میں اس معاملے کو بالکل ہی ختم کر دینا چاہتی ہوں۔ ساس سسر کے طعنوں سے اور باتوں سے پیچھا چھڑا لینا چاہتی ہوں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''یہ سوچنا تمہارا کام ہے، تم ڈاکٹر ہونے کے ناتے بہت کچھ کر سکتی ہو۔''

رملا نے اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر پوچھا۔''میں...... کچھ سمجھی نہیں...... تم مجھ سے کیا چاہتی ہو؟''

وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر ٹہلنے کے انداز میں ذرا دور گئی پھر واپس آ کر اس کے سامنے میز پر دونوں ہتھیلیاں ٹکا کر ذرا جھک کر بولی۔''تم ہمیشہ میرے کام آتی رہی ہو، اس بار بھی آؤ گی......''

رملا نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ ذرا دھیمے لہجے میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔''تمہیں نعمان کی رپورٹ ہر صورت نیگیٹو ثابت کرنی ہوگی۔''

اس نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس سے پہلے ہی صدف نے کہا۔''میں جانتی ہوں، یہ تمہارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔''

وہ اس کے ارادوں کو بھانپ کر بولی۔''یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ رپورٹس بدلنا، کوئی کھیل نہیں ہے۔''

وہ سیدھی کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔''کھیل ہی ہے مگر ذرا مشکل ہے۔ ہر کھیل میں کھلاڑی کی جیت یا ہار کی توقع کی جاتی ہے، وہ اپنی ذہانت سے جیت جائے تو بہت اچھی بات ہے اور اگر ذہانت کام نہ آئے، تو حکمتِ عملی سے ہار کو جیت میں بدل دیا جاتا ہے۔''

''آج تم بڑی گہری باتیں کر رہی ہو؟ کیا منصوبہ بنا کر آئی ہو؟''

''میں کوئی منصوبہ بنا کر نہیں آئی، یہاں آ کر میری عقل نے کام کیا ہے۔''

رملا نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔''یہ کام بہت مشکل ہے۔''

''مجھے صرف اتنا بتا دو کہ تم یہ کام کر سکتی ہو یا نہیں؟''

''اگر میں ناں کہوں تو......؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔''تو......؟ تو اس شہر میں رشوت خور ڈاکٹرز بہت ہیں۔''

وہ چونک کر ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی پھر بولی۔''نہیں...... میں تمہیں بھٹکنے نہیں دوں

گی۔ تم نادانی کی باتیں کر رہی ہو۔ تم نے کسی رشوت خور ڈاکٹر کے پاس جانے کا تو سوچ لیا مگر یہ نہیں سوچا کہ وہ آئندہ تمہیں کس طرح بلیک میل کرتا رہے گا؟''

''میں خود بھی بھٹکنا نہیں چاہوں گی۔ تم رقم لو اور میرا کام کروا دو۔''

ڈاکٹر رملا کچھ دیر تک اسے گہری نظروں سے دیکھتی رہی پھر بولی۔''صدف! تم اس قدر ضدی ہو گی، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ اولاد کو تم نے اپنی چڑ بنا لیا ہے، دولت سے سب کچھ بدلا جا سکتا ہے، لیکن اگر تمہاری قسمت میں اولاد ہوئی تو اسے کیسے بدلو گی؟ اس وقت کوئی حکمتِ عملی کام نہیں آئے گی۔ میں تمہارا ساتھ دیتی آ رہی ہوں لیکن کبھی اونچ نیچ بھی ہو سکتی ہے اور تم اتفاقاً ماں بن سکتی ہو۔''

وہ چڑ کر بولی۔''فار گاڈ سیک رملا! مجھے لیکچر نہ دو۔ جو اتفاق آج تک نہیں ہوا، وہ آئندہ کیسے ہوگا؟''

''ایک سہیلی اور ڈاکٹر ہونے کے ناتے تمہیں سمجھانا میرا فرض ہے۔ اب بھی وقت ہے، اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔''

وہ فیصلہ کن لہجے میں بولی۔''تم نے اپنا فرض پورا کر لیا...... اور میں نے سوچ لیا...... اب یہ بتاؤ...... رپورٹ بدلنے کی کیا قیمت ہوگی؟''

رملا اس کا فیصلہ سن کر تھکے ہوئے انداز میں اپنی چیئر پر بیٹھ گئی پھر بولی۔''میں چند ڈاکٹرز اور ان کے اسپتالوں کے نام لکھ کر دے رہی ہوں۔ تمہارے میاں کا چیک اَپ ان میں سے کسی بھی اسپتال میں ہوگا تو میں رپورٹ تبدیل کرا سکوں گی۔ اب وہ معاوضہ کیا لیں گے، یہ میں نہیں جانتی، تم اپنے میاں اور ساس سسر کو اس بات پر مائل کرو کہ وہ ان ہی چند اسپتالوں میں سے کسی ایک کے ڈاکٹر سے معائنہ کرائیں۔''

''یہ میں کر لوں گی۔ نعمان کو جہاں چیک اَپ کرانے کو کہوں گی، وہ وہیں جائیں گے، رہ گئی معاوضے کی بات تو اب مجھے پرواہ نہیں ہے۔ جتنی بھی رقم لگے گی میں دوں گی۔''

وہ ایک کاغذ پر چند ڈاکٹرز اور ان کے اسپتالوں کے نام لکھنے لگی۔

کاتبِ تقدیر کو الزام دیا جاتا ہے کہ اس نے نصیب اچھے نہیں لکھے، لیکن انسان بھی انسان کی تقدیر لکھتا ہے۔ اچھی لکھتا ہے یا بری لکھتا ہے......

رملا تو اپنی سہیلی کی بھلائی کے لیے اور اس کے برے وقت میں کام آنے کے لیے لکھ رہی تھی۔ تقدیر کو بدل دینا چاہتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے صدف کے کام آتی رہی تھی اس بار بھی کام

آئی۔اس نے تقدیر بدل دی۔

جب میڈیکل رپورٹس ساس سسر کے ہاتھوں میں پہنچیں تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔نعمان کے ڈیڈی کو شدت سے اپنی توہین کا احساس ہوا۔ وہ تڑپ کر بولے۔ ''نہیں...... یہ نہیں ہوسکتا۔ میں اس رپورٹ کو نہیں مانتا۔''

نعمان نے کہا۔''ڈیڈ! کیا آپ میڈیکل رپورٹ کی سچائی کو جھٹلا سکیں گے؟''

بی آپا نے کہا۔''ڈاکٹر نے گھاس کھا کر معائنہ کیا ہوگا۔کسی اچھے ڈاکٹر سے رپورٹ لی جائے۔نعمان کو کسی بڑے اور مشہور ڈاکٹر سے معائنہ کرانا چاہیے۔''

صدف ان سب کے درمیان نہیں تھی،اس کی رپورٹ پوزیٹو آئی تھی،ایسے میں تو اسے فخر سے سر اٹھا کر ان سب کے درمیان ہونا چاہیے تھا،لیکن وہ ڈرائنگ روم کے باہر کومن روم میں ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی اپنے سسرالی بزرگوں کی جھنجھلاہٹ بھری باتیں سن رہی تھی۔وہ دوبارہ اپنے بیٹے کا میڈیکل چیک اَپ کرانا چاہتے تھے۔نعمان کی آواز سنائی دی۔''آپ سب کیوں جھنجھلا رہے ہیں؟ آپ حقیقت جاننا چاہتے تھے،اب جبکہ وہ سامنے آچکی ہے تو کیوں اسے تسلیم نہیں کر رہے ہیں؟''

بی پاشا نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔''بیٹا! حقیقت یہ نہیں ہے......ہم ایسی کسی حقیقت کے بارے میں نہیں سوچ رہے تھے۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔''ممی! آپ کی سوچ میڈیکل رپورٹ کو نہیں بدل سکتی۔ایک بات بتائیں......اگر میرے بجائے صدف نیگیٹو ہوتی تو کیا تب بھی آپ سب کا یہی فیصلہ ہوتا کہ اسے کسی دوسرے ڈاکٹر کو دکھایا جائے؟ کیا آپ اس کی نیگیٹو رپورٹ کو بھی یہی کہتے کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے؟''

ماں نے جھنجھلا کر کہا۔''صدف کی بات بیچ میں مت لاؤ۔ ہم اپنی تسلی کے لیے تمہارا ایک بار پھر میڈیکل چیک اَپ کرائیں گے۔''

وہ ماں کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ایک جھٹکے سے اٹھ کر ذرا تیز آواز میں بولا۔''آپ اپنی تسلی نہیں کرنا چاہتیں...... مجھے تماشا بنانا چاہتی ہیں۔اگر دوسرے ڈاکٹر کی دی گئی رپورٹ بھی مجھے نیگیٹو ثابت کرے گی،پھر آپ کیا کریں گی؟ ڈاکٹر پر ڈاکٹر بدلے جائیں گے لیکن حقیقت کو نہیں بدلا جاسکے گا۔''

بی پاشا نے اٹھ کر بیٹے سے کچھ کہنا چاہا۔اسے منانا چاہا ایسے ہی وقت ان کی نظر اپنے

میاں کی طرف گئی۔ وہ چپ تھے،سر جھکا ہوا تھا،چہرے کے تاثرات ایسے تھے جیسے بیٹے کی حقیقت جان کر اندر ہی اندر ٹوٹ رہے ہوں اور خود کو سنبھالنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

بی پاشا بیٹے سے کچھ نہ کہہ سکیں۔ جھاگ کی طرح صوفے پر بیٹھتی چلی گئیں۔نعمان تینوں بزرگوں سے منہ پھیر کر ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ وہ تینوں بہو کی چوری پکڑنا چاہتے تھے لیکن اپنے بیٹے کی کمزوری ہاتھ آ گئی تھی۔

صدف اٹھ کر اندر آنا چاہتی تھی۔ چیخ چیخ کر پوچھنا چاہتی تھی۔''اگر میں نیگیٹو ہوتی تو اس گھر میں دوسری بہو لائی جاتی......لیکن نعمان کی نیگیٹو رپورٹ نے آپ سب کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ وہ پوزیٹو ہوتے تو بچے کی خاطر دوسری شادی کر لیتے لیکن پوزیٹو وہ نہیں...... میں ہوں،اب کوئی مجھے بتائے،کہ میں ماں بننے کے لیے کون سا راستہ اختیار کروں؟ اگر میں بانجھ ہوتی تو اس کا حل بیٹے کی دوسری شادی کی صورت میں آپ کے سامنے تھا مگر میں بانجھ نہیں ہوں،کیا میرے لیے کوئی حل آپ بزرگوں کے سامنے ہے؟''

یہ ایسا سوال تھا،جس کا جواب ان میں سے کوئی نہیں دے سکتا تھا۔ ڈرائنگ روم کی خاموشی اسے سمجھا رہی تھی کہ اس کے سوال پوچھنے سے پہلے ہی بزرگوں کو چپ لگ گئی ہے۔وہ بڑے فخریہ انداز میں مسکرائی پھر سوچنے لگی۔''سوری نعمان! میں مجبور تھی،ایسی حکمتِ عملی پر عمل نہ کرتی تو نقصان اٹھاتی......اب کوئی میرے آگے دم نہیں مار سکے گا۔''

وہ صوفے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔حقارت بھری نظروں سے ڈرائنگ روم کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگی۔شوہر کی دلجوئی بھی تو کرنی تھی۔

☆======☆======☆

گھر میں سکون اور امن و امان کی فضا قائم رہے تو دنیا کا ہر گوشہ پُرسکون محسوس ہونے لگتا ہے۔نعمان کو اپنی رپورٹ پڑھنے کے بعد اندر سے ایک جھٹکا تو لگا تھا لیکن باہر سے بالکل شانت رہنے کی کوشش کر رہا تھا۔ایک طرح سے یہ بات توہین آمیز تھی کہ وہ مرد ہے،مگر باپ نہیں بن سکتا لیکن سچ کا زہر تو پینا ہی پڑتا ہے۔ یہ مجبوری ہوتی ہے کہ آدمی سچ کو بدل نہیں سکتا۔

اس کی دانست میں وہ دس بار میڈیکل چیک اَپ کراتا تو دس بار سچ سامنے آتا لہٰذا اس نے جھوٹ میں لپٹے ہوئے اس سچ سے ہار مان لی تھی۔ حالات سے سمجھوتا کرنا ہی تھا۔ یہ سوچ کر سمجھوتا کرنے لگا کہ اب گھر میں امن و امان قائم رہے گا۔

واقعی یہی ہو رہا تھا، لڑائی جھگڑے ختم ہو گئے تھے۔ ہر طرف سکون ہی سکون چھا گیا تھا۔صدف اپنی جگہ مطمئن تھی۔

رشتے بدلتے ہیں، موسم بدلتے ہیں، انسان بدلتے ہیں، تقدیر بدلتی ہے، حالات بدلتے ہیں۔ یہ دنیا اسی لیے خوبصورت اور پُرکشش لگتی ہے کہ اس کے اندر چھوٹی بڑی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔خدا کا یہ نظامِ کائنات اَزل سے ہے اور اَبد تک رہے گا۔

نعمان، صدف اور ان کی ذات سے وابستہ سب ہی افراد پہلے بھی زندگی گزار رہے تھے اور اب بھی گزارتے جا رہے تھے۔فرق صرف اتنا تھا کہ اب ان کے اندر کے موسم بدل گئے تھے۔

بی آپا اور بی پاشا نے اپنی ایک الگ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنالی تھی۔صدف سے کترانے لگی تھیں۔اس سے بات بھی کیا کرتیں؟ بات کرنے کے لیے اولاد کا موضوع نہیں رہا تھا۔ یہ دائمی فکر بی پاشا کو کھا رہی تھی کہ بیٹا بانجھ ہی رہے گا تو نسل آگے کیسے بڑھے گی؟ بیٹے کو بچے کا باپ بنانے کی کوئی صورت نہیں رہ گئی تھی۔ بی آپا بھی ہار مان کر واپس جانے کی تیاریاں کر رہی تھیں۔صدف نے ایسی چال چلی تھی کہ اب وہ اپنی بیٹی کو اس پر سوکن بنا کر نہیں لا سکتی تھیں۔

اس روز نعمان اپنے منیجر کے ساتھ شہر سے دور ایک گاؤں میں زمین کا سودا کرنے گیا ہوا تھا۔ وہ وہاں شوگر مل قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس نے منیجر سے کہا۔"یہ جگہ شوگر مل کے لیے آئیڈیل ہے۔ گنے کے کھیت یہاں سے قریب ہیں۔انہیں کیری(CARRY) کرنے میں آسانی رہے گی۔"

نعمان اس جگہ کی اہمیت کو سمجھنے کے بعد ہی اس نئے پروجیکٹ پر عمل درآمد کرنے والا تھا۔ یہ قائم ہونے والی نئی شوگر مل ان کے کاروبار کو کروڑوں کا منافع دینے والی تھی لیکن انسان سوچتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ اور ہے۔

شام ہونے تک زمین کے مالکان سے تمام معاملات طے ہو گئے۔نعمان کو گوٹھ کا پُرسکون ماحول بہت اچھا لگ رہا تھا۔اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنے اردگرد تک پھیلے ہوئے ہرے بھرے کھیتوں کو دیکھا۔ایسے ہی وقت اس کی نظر اپنی طرف آتی ہوئی تین گاڑیوں پر پڑی۔ وہ دور سے چلی آ رہی تھیں۔ ان میں دو ویگن کاریں تھیں اور ان کے درمیان ایک پجارو نظر آ رہی تھی۔

وہ تینوں گاڑیاں ان کے چاروں طرف آ کر یوں رک گئیں۔ جیسے محاصرہ کر رہی ہوں اور واقعی انہوں نے محاصرہ کیا تھا۔ یکبارگی ان گاڑیوں کے دروازے دھڑا دھڑ کھلنے لگے اور مسلح افراد باہر آنے لگے۔ایک دم سے بھگدڑ مچ گئی۔ زمین کے مالکان، گوٹھ کے پنچ اور نمبردار وغیرہ سب ہی ڈر کر خوف سے تھر تھر کانپتے ہوئے دور بھاگنے لگے۔

مسلح افراد نے انہیں بھاگنے دیا لیکن نعمان، اس کے ڈرائیور اور منیجر کو گھیر کر رکھا۔ ایک نے نعمان سے کہا۔"سالا! کروڑ پتی بزنس مین بنتا ہے۔ یہاں شوگر مل بنانے آیا ہے۔"

ڈرائیور نے آگے بڑھ کر کہا۔"اے خبردار! صاحب کو گالی نہ دینا۔"

اس کے منہ پر ایک گھونسا پڑا۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا پھر ایک دم سے اچھل کر گھونسا مارنے والے سے لپٹ گیا۔ایک گن والے نے اس کا نشانہ لیا۔ جب وہ مار کھاتا ہوا پھر الگ ہوا تو اس گن مین نے اسے گولی ماردی۔ وہ ایک دم سے اچھل کر زمین پر گرا پھر تڑپ تڑپ کر ٹھنڈا پڑ گیا۔

منیجر دہشت زدہ ہو کر چیخنے لگا۔ وہاں سے بھاگنے لگا۔ یہ خوف طاری ہو گیا تھا کہ اب اسے بھی مار ڈالا جائے گا۔ ایک گن مین نے کہا۔"یہ کتا بھونکتا ہوا شہر جائے گا تو ہماری نشاندہی کرے گا۔" "اسے اُڑا دو۔"

اسے بھی اُڑا دیا گیا۔ایک گولی چلی وہ دوڑتے دوڑتے اچھل کر اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ اس کے بعد بھاگنے کے تو کیا...... اٹھنے کے بھی قابل نہ رہا۔ ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گیا۔

نعمان گم صم کھڑا تھا۔ اس پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا، یہ جانتا تھا کہ ایک دن تو مرنا ہی ہے لیکن حرام موت، مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے گن مین سے کہا۔"اب میری باری ہے لیکن یہ تو بتا دو، ہم سے دشمنی کیا ہے؟ میرے کاروباری معاملات سے تم لوگوں کا کیا تعلق ہے؟"

وہ سخت کھردرے لہجے میں بولا۔"ہم نہیں جانتے، کاروبار کیا ہوتا ہے؟ ہم تو اس ہاتھ سے رقم لیتے ہیں اور اُس ہاتھ سے بندے کو اُڑا دیتے ہیں۔"

"تم نے جتنا کسی سے لیا ہے، اس سے دگنا میں تمہیں دوں گا اور زیادہ مانگو گے اور زیادہ دوں گا۔ مجھے گولی نہ مارو۔ میں یہاں سے جاتے ہی تمہاری ادائیگی کر دوں گا۔"

"ہم مجرم ہیں، مگر بے ایمان نہیں ہیں ہمیں دوغلا نہ سمجھو۔ جس سے پہلے...

ہے اسی کا کام کرتے ہیں۔"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر بولا۔ "تو پھر مجھے بھی بھاگنے دو۔ بچ گیا تو میری قسمت، مر گیا تو تمہارا کام پورا ہو جائے گا۔"

"نہ تم بھاگنے کی کوشش کرو اور نہ ہی میں تمہیں گولی ماروں گا، یہ صاف کہہ دوں کہ میں نے تمہیں مارنے کا سودا نہیں کیا ہے۔ بس...... یہاں سے تمہیں کہیں پہنچانا ہے۔ اس کے بعد تمہارے مقدر میں زندگی ہوگی تو واپس آ سکو گے۔ چلو...... گاڑی میں بیٹھ جاؤ۔"

پیچھے سے ایک گن مین نے اسے اپنی رائفل سے ٹہوکا دیا۔ دوسرے نے دروازہ کھولا۔ وہ بڑی خاموشی سے اندر جا کر بیٹھ گیا۔ یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ اسے جان سے نہیں ماریں گے لیکن کسی ایسی جگہ پہنچائیں گے، جہاں جان کے لالے پڑ سکتے ہیں۔ ان کا سرغنہ اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔ اس کا موبائل فون لے کر کھڑکی سے باہر پھینکتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے بولا۔ "چلو......"

وہ سب اپنی اپنی گاڑیوں میں سوار ہو گئے ان کے دروازے بند ہو گئے۔ زمین کے مالکان، اس گوٹھ کے پنچ اور نمبردار وغیرہ بہت دور کھڑے ہوئے، ادھر اُدھر چھپے ہوئے سہم کر دیکھ رہے تھے۔ ان کے سامنے دو لاشیں پڑی تھیں۔ کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ جانے والوں کا راستہ روکتے۔ گاڑیاں اسٹارٹ ہو کر جا رہی تھیں۔ وہ جب تک دکھائی دیتی رہیں، وہ سب اپنی جگہ دبکے رہے۔ یہ خوف تھا کہ گولی مارنے والے واپس بھی آ سکتے ہیں۔

جب وہ گاڑیوں سمیت نظروں سے اوجھل ہو گئے تو وہ سب ڈرتے ہوئے ان لاشوں کے قریب آئے اور پریشان ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگے۔ "یہ دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا؟ یہاں دو لاشیں پڑی ہیں۔ تھانے والوں کو اطلاع دینی چاہیے۔"

نمبردار نے ایک طرف پڑے ہوئے موبائل فون کو اٹھا لیا پھر وہاں کے پنچوں اور زمین کے مالکان کے ساتھ قریبی ٹاؤن کے تھانے کی طرف جانے لگا۔

☆=====☆=====☆

رات کو سب ہی کھانے کی میز کی اطراف بیٹھے ہوئے تھے۔ صدف اپنے ساس اور سسر سے ذرا کھنچی رہتی تھی۔ وہ بھی اس سے کتراتے رہتے تھے۔ دوسری صبح بی آپا اسلام آباد جانے والی تھیں۔ نعمان جاتے وقت صدف سے کہہ گیا تھا۔ "خالہ جان جانے والی ہیں، پھر نہ جانے کب آئیں گی۔ تم اپنا دل ان کی طرف سے صاف کر لو۔"

وہ نعمان کی ہدایت کے مطابق ان سے گھلنے ملنے کی کوشش کر رہی تھی۔ رات کا کھانا کھانے کے لیے ان کے ساتھ ڈائننگ ٹیبل پر آ گئی تھی۔ ایسے ہی وقت کال بیل کی آواز سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک ملازم نے آ کر نعمان کے ڈیڈی سے کہا۔ "صاحب جی! پولیس والے آئے ہیں۔"

یہ ایسی اطلاع تھی کہ سب کے ہاتھ کھاتے کھاتے رک گئے۔ نعمان کے ڈیڈی اپنی جگہ سے اٹھ کر بڑبڑاتے ہوئے جانے لگے۔ "یہ پولیس کیوں آئی ہے؟"

ان کے پیچھے بی پاشا بھی جانے لگیں۔ ان کے دروازے پر پہلے کبھی پولیس والے نہیں آئے تھے۔ یہ ان کے لیے حیرانی اور پریشانی کی بات تھی۔ صدف کے دل میں بھی تجسس پیدا ہوا۔ وہ بھی ان کے پیچھے جانے لگی پھر بی آپا کب پیچھے رہنے والی تھیں۔ وہ بھی ڈرائنگ روم میں پہنچ گئیں۔

اس وقت تک ایک پولیس انسپکٹر گوٹھ کے نمبردار کے ساتھ اندر آ گیا تھا اور نعمان کے ڈیڈی سے پوچھ رہا تھا۔ "آپ مسٹر نعمان کے کون ہیں؟"

"میں اس کا باپ ہوں۔"

نمبردار نے کہا۔ "جناب! آپ کے لیے بری خبر ہے۔ آپ کے صاحبزادے کو اغوا

کرلیا گیا ہے۔"

یہ سن کر سب ہی کے دماغوں کو جھٹکا لگا۔ بی پاشا اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر چیخ پڑیں۔ "نہیں...... یہ نہیں ہوسکتا...... میرے بیٹے کو بھلا کوئی کیوں اغوا کرے گا؟"

انسپکٹر نے کہا۔ "آپ صاحبِ دولت و جائیداد ہیں۔ آپ جیسوں سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرنے کے لیے اکثر اغوا کی وارداتیں ہوتی رہتی ہیں۔"

پھر انسپکٹر اور نمبردار نے انہیں بتایا کہ وہاں گوٹھ میں نعمان کے ساتھ کیسے حالات پیش آئے تھے۔ اس کے منیجر اور ڈرائیور کو گولی ماردی گئی ہے لیکن نعمان سے کہا گیا ہے کہ اسے جان سے نہیں مارا جائے گا۔ کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جائے گا جہاں سے وہ شاید ہی واپس آسکے۔

یہ ساری روداد سنتے ہی بی آپا اور بی پاشا چھاتی پیٹ کر رونے لگیں۔ صدف بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ نعمان کے ڈیڈی پریشان ہو کر انسپکٹر سے کہہ رہے تھے۔ "کسی بھی طرح میرے بیٹے کا سراغ لگایا جائے۔ اسے کہاں لے جایا گیا ہے؟ میں اس کی واپسی کے لیے لاکھوں روپے تاوان کے طور پر ادا کرسکتا ہوں۔"

نمبردار نے کہا۔ "جناب! یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے۔ ان کا سرغنہ کہہ رہا تھا کہ نعمان صاحب کو ایسی جگہ پہنچایا جائے گا جہاں سے وہ خوش نصیب ہوئے تو واپس آسکیں گے۔"

صدف روتے روتے سن رہی تھی۔ یہ آخری بات سنتے ہی صدمے سے سر چکرا گیا پھر اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے؟ جب ہوش میں آئی تو اس نے خود کو اپنے بیڈروم میں پایا۔ وہ چھت کو تکنے لگی، سوچنے لگی پھر اسے یاد آیا کہ اس نے نعمان کے اغوا ہونے کی بری خبر سنی تھی۔ اسی وقت چکرا کر گر پڑی تھی۔

وہ ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ بے ہوش ہوگئی تھی۔ بے ہوشی کی حالت میں اسے بیڈروم میں پہنچایا گیا تھا۔ وہ پہنچانے والے اس کے آس پاس نہیں تھے، اسے تنہا چھوڑ گئے تھے۔

وہ بڑی حیران ہوئی۔ کسی کو تو اس کے پاس رہنا چاہیے تھا۔ وہ بیڈ سے اُتر کر کھڑی ہو گئی۔ کمزوری سی محسوس کر رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہاں سے ڈرائنگ روم میں آ گئی۔

اسی وقت بی پاشا غصے میں اپنے میاں سے کہہ رہی تھیں۔ "یہ سراسر بے حیائی ہے میں تو اس بے حیا کو اس گھر سے دھکے مار کر نکالوں گی۔"

وہ کہتے کہتے رک گئیں۔ صدف کی طرف دیکھنے لگیں۔ نعمان کے ڈیڈی نے صدف کی طرف سے منہ پھیرتے ہوئے بی پاشا سے کہا۔ "اس سے پوچھو...... یہ کیا گل کھلا رہی ہے؟"

بی آپا نے صدف کی طرف گھوم کر پوچھا۔ "تم نے کہاں جا کر منہ کالا کیا ہے؟"

وہ ایک دم سے بھنا گئی۔ "خالہ جان! آپ یہ کیسی زبان استعمال کر رہی ہیں؟"

بی پاشا نے کہا۔ "ہم تو صرف زبان سے بول رہے ہیں۔ ابھی دنیا والوں کو معلوم ہوگا تو سب تم پر تھوکیں گے۔"

وہ پریشان ہو کر ایک ایک کا منہ تکنے لگی پھر اس نے پوچھا۔ "میں نے ایسا کیا کیا ہے؟ آپ لوگوں کے تیور کیوں بدل گئے ہیں؟"

نعمان کے ڈیڈی نے کہا۔ "ہم سے کچھ نہ پوچھو...... اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھو اور بوریا بستر سمیٹ کر یہاں سے جاؤ۔"

"میں کیوں جاؤں؟ یہ میرے شوہر کا گھر ہے۔ میں یہاں بیاہ کر آئی ہوں۔ گھر سے بھاگ کر نہیں آئی ہوں۔"

"بیاہ کر آنے والی شریف زادیاں تمہاری طرح بدچلن اور فاحشہ نہیں ہوتیں۔"

وہ چیخ کر بولی۔ "یوشٹ اَپ...... آپ سب گالیاں دیئے جا رہے ہیں اور میں آپ کی بزرگی کا لحاظ کر رہی ہوں۔"

بی آپا نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ "اری او لحاظ کرنے والی کی بچی! یہ تو بتا یہ کس کا گناہ اپنے پیٹ میں اٹھائے پھر رہی ہے۔"

صدف کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ "آپ یہ کیا بکواس کر رہی ہیں؟"

"بکواس تو تُو کر رہی ہے۔ اب تک ہمارے بیٹے کو محبت کے جال میں پھنسا کر دھوکا دیتی رہی اور چوری چھپے کسی یار سے ملتی رہی۔"

بی پاشا نے کہا۔ "تُو بے ہوش ہوگئی تھی۔ ہم نے لیڈی ڈاکٹر کو بلایا تھا۔ اس نے تیرا معائنہ کیا تھا۔ اس نے صاف صاف کہا ہے کہ تُو ماں بننے والی ہے۔"

صدف کا سر چکرانے لگا۔ وہ دھپ سے صوفے پر بیٹھ گئی۔ وہ تو ماں نہیں بننا چاہتی تھی پھر کسی لیڈی ڈاکٹر نے یہ رپورٹ کیسے دی ہے؟ اس نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "نہیں...... یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔ لیڈی ڈاکٹر اناڑی ہوگی۔ اس نے اچھی طرح معائنہ نہیں کیا

ہوگا۔"

"تو اب اپنے میکے جا کر معائنہ کرالے۔ ایک نہیں...... دس سے کرالے۔ چاند چڑھنے والا ہے سب ہی دیکھیں گے۔ پہلے تو ہی دیکھ لے تو اچھا ہے۔"

نعمان کے ڈیڈی نے کہا۔ "میں نے تمہارے چچا کو بتا دیا ہے وہ کہہ رہے تھے صبح کی ٹرین سے سوار ہوں گے اور شام تک یہاں پہنچ جائیں گے۔ ہم نے گیسٹ ہاؤس کا دروازہ کھلوا دیا ہے۔ تم ابھی اپنا ضروری سامان سمیٹو اور یہاں سے نکل جاؤ۔ تمہیں کل شام تک اس گیسٹ ہاؤس میں رہنے کی اجازت ہے۔"

وہ غصے سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ ماں بننے والی ہے۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے جانے لگی۔ "میرے شوہر کے جاتے ہی آپ لوگوں نے میرے خلاف محاذ بنا لیا ہے۔ یہ سب آپ کی سوچی سمجھی اسکیم ہے۔ میں کل صبح ہی اپنی میڈیکل رپورٹ کے ذریعے ثابت کردوں گی کہ آپ کی لیڈی ڈاکٹر نے جھوٹ کہا ہے۔"

نعمان کے ڈیڈی نے گرج کر کہا۔ "رک جاؤ۔ ہمیں نادان نہ سمجھو۔ تم کل شام تک اس کوٹھی کے احاطے سے باہر نہیں جاؤ گی۔"

بی پاشا نے کہا۔ "تم اپنی مکاری سے حمل ضائع کرسکتی ہو۔ ہمارے سچ کو جھوٹ بنا سکتی ہو اور ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ پہلے تمہارے چچا کے سامنے تمہیں گناہ گار ثابت کریں گے۔ اس کے بعد ہی تمہیں یہاں سے جانے دیں گے۔"

صدف پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا۔ اسے قیدی بنا کر رکھا جا رہا تھا۔ اسے اپنی سہیلی ڈاکٹر رملا کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔

رملا نے کہا تھا۔ "اگر تمہاری قسمت میں اولاد ہوئی تو اسے کیسے بدلو گی؟ اس وقت کوئی حکمتِ عملی کام نہیں آئے گی۔ میں تمہارا ساتھ دیتی آ رہی ہوں لیکن کبھی اونچ نیچ ہوسکتی ہے اور تم اتفاقاً ماں بن سکتی ہو۔"

رملا کی یہ بات درست ثابت ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ اگر وہ واقعی ماں بن رہی تھی تو یہ ثابت نہیں کرسکتی تھی کہ اس ہونے والے بچے کا باپ نعمان ہے کیونکہ وہ میڈیکل رپورٹ کے ذریعے اسے بانجھ اور ناکارہ بنا چکی تھی۔

وہ جتنی حکمتِ عملی اور دانائی سے کامیاب ہوتی آئی تھی، اتنی ہی نادانی سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار چکی تھی۔

☆======☆======☆

غلطی کرنے والا ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ وہ پورے ہوش و حواس میں رہ کر ایسا کر رہا ہے۔ اس لیے اس غلطی کا خمیازہ بھگتنا نہیں پڑے گا۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ وہ اپنی من مانی کرکے کامیابی حاصل کرکے آگے نکل جائے گا۔ پیچھے سے کوئی اس کے گلے میں پھندا ڈالنے نہیں آئے گا۔

صدف بھی اسی زعم میں پہلے ساس سسر کو دھوکا دیتی رہی پھر شوہر کو بھی دھوکا دینے لگی۔ اس کی ایک ہی ضد تھی کہ وہ ماں نہیں بنے گی۔ سر سے پاؤں تک اپنے فیگر کو پُرکشش بنائے رکھے گی اور سدا بہار کہلاتی رہے گی۔

اپنے شوہر نعمان کو میڈیکل رپورٹ کے ذریعے بانجھ ثابت کرنے کے بعد تو اسے ساری زندگی کے لیے آزادی مل گئی تھی۔ وہ بچے کی روک تھام کے لیے چوری چھپے دوائیں استعمال کرتی رہتی تو آگے پیچھے جھولنے والے بچوں سے نجات حاصل کرتی رہتی۔

انسان ہزار تدبیریں کرے لیکن تقدیر کے ایک ہی وار سے اس کی تمام تدابیر خاک میں مل جاتی ہیں۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انسان قدرت کے آگے بے بس ہو جاتا ہے۔ اس وقت بھی وہ پوری طرح بے بس ہوگئی تھی پھر بھی دل کو سمجھا رہی تھی کہ ساس سسر جھوٹ کہہ رہے ہیں یا پھر لیڈی ڈاکٹر نے غلط معائنہ کیا ہے۔ وہ کبھی ماں نہیں بن سکتی جب دوائیں استعمال کر رہی تھی۔ تو ماں بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ہمیشہ برے وقت میں ہی خدا یاد آتا ہے لیکن اسے ڈاکٹر رملا یاد آیا کرتی تھی۔ اس نے فوراً ہی اپنے موبائل کے ذریعے رابطہ کیا پھر اس کی آواز سن کر بولی۔ "میں بول رہی ہوں۔ اس وقت بڑی مصیبت میں پھنسی ہوئی ہوں۔"

اس نے پوچھا۔ "ایسی کیا بات ہوگئی ہے؟ تم تو بہت ہی پریشان لگ رہی ہو۔"

"کیا بتاؤں کچھ نامعلوم افراد نے نعمان کو اغوا کرلیا ہے۔ ان کے منیجر اور ڈرائیور کو گولی ماردی ہے۔"

رملا نے شدید حیرانی و پریشانی سے کہا۔ "یا اللہ خیر...... یہ کب ہوا؟ کیسے ہوا......"

وہ نعمان کے اغوا کے سلسلے میں مختصر سی باتیں بتانے کے بعد بولی۔ "مجھ پر تو قیامت آ رہی ہے۔ میں نعمان کے اغوا کی خبر سن کر چکرا کر گر گئی تھی۔ بے ہوش ہوگئی۔ جب ہوش میں آئی تو میرے ساس سسر کے تیور بدلے ہوئے تھے۔ وہ کہہ رہے تھے کہ میں ماں

بننے والی ہوں۔''

رملا نے چونک کر پوچھا۔'' کیا......انہوں نے کیا کہا......؟''

''تمہیں بھی حیرانی ہو رہی ہے ناں......؟ وہ کہہ رہی تھیں کہ بے ہوشی کے دوران میں کوئی لیڈی ڈاکٹر آئی تھی۔ اس نے معائنہ کیا تھا۔اس نے ہی یہ خبر سنائی ہے کہ میں ماں بننے والی ہوں۔''

''ارے یہ تو بہت بڑی خوش خبری ہے۔نعمان آج نہیں تو کل واپس ضرور آئیں گے۔ اغوا کرنے والے تاوان کے طور پر اچھی خاصی رقم طلب کرتے ہیں۔تم لوگوں کے پاس دولت کی کیا کمی ہے؟ تاوان ادا کر کے اپنے میاں کو واپس لاسکتی ہو پھر خوشیاں ہی خوشیاں ہیں۔تمہارے ساس سسر بھی تم پر صدقے واری جائیں گے۔''

وہ جھنجھلا کر بولی۔''تم میری تو سن نہیں رہی ہو۔اپنی کہے جا رہی ہو۔''

''اب بولنے کے لیے کیا رہ گیا ہے۔تم ماں بننے سے جھنجھلا رہی ہو نا.....؟ میں تمہاری فطرت کو اچھی طرح سمجھتی ہوں۔''

''کیا میں اسی دن کے لیے تمہارا تعاون حاصل کر رہی تھی؟ اور چوری چھپے دوائیں کھا رہی تھی......؟''

''ہاں یہ تو ہے۔دوائیں تم استعمال کر رہی تھیں۔''

''یہ تو میں پوچھ رہی ہوں کہ میں ماں کیسے بن سکتی ہوں؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ میرے ساس سسر درست کہہ رہے ہیں اور کسی لیڈی ڈاکٹر نے میرا معائنہ کیا ہے۔''

''یقین نہیں آ رہا ہے تو میرے پاس آ جاؤ۔ میں معائنہ کرتی ہوں۔اب تو کافی رات ہو چکی ہے۔کل صبح کلینک کے وقت تم میرے پاس چلی آنا۔''

''میں نہیں آ سکتی۔ یہاں مجھے قیدی بنا کر رکھا گیا ہے۔وہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ اگر مجھے موقع ملا تو میں باہر جا کر اپنی ماتا کو ضائع کرا دوں گی۔ یہ لوگ مجھے الزام دے رہے ہیں کہ میں بدچلن ہوں، فاحشہ ہوں، میں نے کہیں کسی کے پاس جا کر منہ کالا کیا ہے اور اس کے بچے کی ماں بن رہی ہوں۔''

رملا نے پوچھا۔'' یہ کیا بکواس ہے؟ وہ ایسا کیوں کہہ رہے ہیں؟''

''وہ ایسا اس لیے کہہ رہے ہیں کہ نعمان کی میڈیکل رپورٹ کے مطابق وہ بانجھ ہیں۔ باپ بننے کے قابل نہیں ہیں۔اس کا مطلب تو یہی ہوا نا...... یہ بچہ کسی اور کا ہے؟ میں تو بری

طرح بدنام ہو جاؤں گی۔ایک تو ماں بننا نہیں چاہتی۔دوسرے ذلت اور رسوائی الگ ہو گی۔ پلیز رملا!...... مجھے تسلی دو کہ میں ماں بننے والی نہیں ہوں۔یہ سب کچھ جو ہو رہا ہے، جھوٹ ہے، ایک خواب ہے۔بھیانک خواب۔''

''میں اسی طرح تسلی دے سکتی ہوں کہ تمہارا معائنہ کر کے سچ و جھوٹ بتا سکوں۔اگر سچ ہوا تو میں کچھ نہیں کر سکوں گی۔''

''یہ بات نہ کہو۔میرے لیے تم بہت کچھ کر سکتی ہو۔اگر یہ سچ ہوا تو مجھے ماں بننے سے نجات دلا سکتی ہو۔''

وہ سخت لہجے میں بولی۔'' بکواس نہیں کرو۔آج تک میں تمہاری ہر بات مانتی آئی ہوں لیکن ایک نئی جان تمہارے اندر پیدا ہو چکی ہے میں اسے نہیں ماروں گی۔اتنا بڑا گناہ کبھی نہیں کروں گی۔''

''کیا مجھے دنیا والوں کے سامنے ذلیل کرو گی؟ میڈیکل رپورٹ کے مطابق نعمان باپ نہیں بن سکتے۔سب یہ پوچھیں گے کہ یہ بچہ کس کا ہے......؟ میں کس کس کو جواب دیتی پھروں گی کہ یہ نعمان کا ہے۔کیسے ثابت کروں گی؟ میری پارسائی کا یقین دلانے کے لیے نعمان بھی نہیں ہیں۔''

''وہ آج نہیں ہیں لیکن چند دنوں میں آ جائیں گے۔پریشان کیوں ہو رہی ہو۔''

''اگر وہ آ جائیں گے تو وہ بھی یقین نہیں کریں گے۔ وہ بھی مجھے بدچلن اور فاحشہ سمجھیں گے۔''

''تم خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہو۔ان سے ضد کرو گی کہ وہ دوبارہ میڈیکل چیک اَپ کرائیں تو سچ سامنے آ جائے گا۔''

''تم ایسے کہہ رہی ہو جیسے میں سچ مچ ماں بننے والی ہوں۔''

''دیکھو صدف! جب تمہارے ساس سسر کہہ رہے ہیں کہ لیڈی ڈاکٹر آئی تھی اور اس نے معائنہ کیا تھا تو پھر یہ درست ہی ہو گا پھر یہ کہ کل میں تمہارا معائنہ کروں گی۔''

''نہیں کر سکو گی۔کل شام تک جب میرے چچا یہاں نہ آ جائیں۔ مجھے کسی سے ملنے کی اجازت نہیں دی جائے گی اور ڈاکٹروں سے تو ملنے ہی نہیں دیا جائے گا۔''

''بے شک...... حالات ایسے ہیں کہ تمہیں ساس اور سسر کی پابندی میں ابھی رہنا ہو گا۔ ان کا یہ شبہ درست ہو گا کہ تم بچے کو ضائع کرا سکتی ہو۔اس لیے وہ تمہارے میکے والوں کے

سامنے یہ ثابت کریں گے کہ تم ماں بننے والی ہو۔ اس کے باعث وہ جو بدچلنی کا الزام تم پر لگا رہے ہیں، وہ صحیح ثابت ہو جائے گا۔"

"یہ لوگ تو اپنا فیصلہ سنا چکے ہیں۔ کل شام کے بعد مجھے اس گھر میں رہنے نہیں دیں گے۔ چچا کے ساتھ مجھے یہاں سے رخصت کر دیں گے۔"

"تم تو بہت ہی مجبور ہو گئی ہو۔"

"تم تو میرے مزاج کو جانتی ہو کہ میں کسی دباؤ میں نہیں آتی لیکن حالات ایسے ہیں کہ اگر سر اٹھاؤں گی، ان لوگوں کی بات سے انکار کروں گی تو پھر میرے چچا کی موجودگی میں میرا معائنہ کرائیں گے اور یہ ثابت کریں گے کہ میں بدچلن ہوں۔ اپنی عزت رکھنے اور ذلت سے بچنے والی بات ہی ایسی ہے کہ مجھے ان کے دباؤ میں رہنا پڑے گا۔"

"تو اب تم ہی بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟"

"میں ابھی جا کر اپنی ساس سے بات کرتی ہوں اور انہیں راضی کرتی ہوں کہ تم یہاں آ کر میرا معائنہ کرو گی۔ اس کے بعد میں تمہیں فون کروں گی۔ تم ابھی سونے نہ جاؤ۔"

وہ فون بند کر کے اپنی ساس کے پاس آئی۔ وہاں بی آپا ان سے لگی بیٹھی تھیں۔ جلتی پر تیل چھڑک رہی تھیں۔ دونوں نے اسے گھور کر دیکھا۔ وہ بولی۔ "آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میں کبھی کسی کے دباؤ میں نہیں رہتی لیکن یہ بات ایسی ہے کہ مجھے اپنی پارسائی ثابت کرنی ہے۔ اس لیے میں چاہتی ہوں کہ آپ ڈاکٹر رملا کو بلائیں۔ وہ سب کے سامنے معائنہ کرے گی اور حقیقت بتائے گی۔"

بی پاشا نے کہا۔ "ہم ڈاکٹر رملا کو یہاں قدم بھی نہیں رکھنے دیں گے۔ ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ تمہاری سہیلی ہے۔ تم جیسی رپورٹ چاہو گی وہ ویسی ہی رپورٹ پیش کرے گی۔"

"آپ اسے غلط سمجھ رہی ہیں۔ میری بات کا یقین کریں۔"

"آگے نہ بولو۔ تمہاری بات کا کیا یقین کریں۔ تم نے تو ہمارے اعتماد کے منہ پر جوتے مارے ہیں۔ کل تمہارے چچا کی موجودگی میں پھر کسی ڈاکٹر سے معائنہ کروایا جائے گا۔ تاکہ انہیں بھی یقین ہو جائے کہ تم ماں بننے والی ہو اور کہیں سے منہ کالا کر کے آئی ہو۔"

وہ غصے سے بولی۔ "اگر میں ابھی یہاں سے بھاگ جاؤں تو آپ میرا کیا بگاڑ لیں گی؟"

"یہاں سے باہر قدم نکال کر دیکھو۔ سکیورٹی گارڈز کو سختی سے کہہ دیا گیا ہے کہ تمہیں کہیں باہر جانے کی اجازت نہ دیں۔ جب بھی تم جانا چاہو تو ہمیں اطلاع دی جائے۔ تمہیں پکڑ کر اندر لے آئیں گے۔ اگر تم ملازموں کے سامنے اپنی بے عزتی چاہتی ہو، تو یہ بھی کر کے دیکھ لو۔"

وہ غصے سے پیر پٹختی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی پھر فون کے ذریعے رملا سے کہا۔

"یہاں بات بہت بگڑ چکی ہے۔ یہ تم پر بھروسا نہیں کر رہے ہیں۔ ان کی ضد ہے کہ چچا جان کے سامنے ہی معائنہ کرایا جائے گا پھر مجھے اس گھر سے نکال دیا جائے گا۔"

"صدف!...... یہ کچھ دنوں کی پریشانی ہے۔ نعمان کو واپس آ جانے دو پھر ساری بگڑی ہوئی باتیں بن جائیں گی۔ جو تمہیں گھر سے نکال رہے ہیں، وہی تمہیں گلے لگائیں گے۔ انہیں تسلیم کرنا ہوگا کہ تم نعمان کے بچے کی ماں بننے والی ہو۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو کہ تم نعمان کا اعتماد حاصل کر کے اسے بچے کی خوشیاں دے کر ہی اس کی حمایت حاصل کر سکو گی۔"

وہ تھوڑی دیر تک باتیں کرتی رہی پھر رابطہ ختم ہو گیا۔ وہ فون بند کرنے کے بعد ایک جگہ بیٹھ گئی۔ سر کو جھکا کر سوچنے لگی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے اندر ایک بیماری پیدا ہو رہی ہے۔ پیٹ میں ایک پھنسی ہو گئی ہے اور یہ پھنسی بڑھتے بڑھتے پھوڑا بننے والی ہے اور یہ پھوڑا پک کر پھوٹنے والا ہے۔ جو بچہ پیدا ہوگا وہ اس کی زندگی کو ایک ناسور کی طرح کھاتا رہے گا۔ اس کے حسن کو خزاں رسیدہ بناتا جائے گا۔

مشکل یہ تھی کہ اب وہ اسے ضائع نہیں کر سکتی تھی۔ اگر اس بچے کو ختم کرنا چاہتی اور نعمان کی دوبارہ میڈیکل رپورٹ سے یہ ثابت ہو جاتا کہ وہ باپ بن سکتا تھا اور آئندہ بھی بن سکتا ہے تو پھر وہ اسے ہی الزام دے گا، کہ اس نے بچے کو قتل کیا ہے۔ وہ بچے کی دشمن ہے اور ماں نہ بننے کے لیے ایسی الٹی سیدھی حرکتیں کرتی آ رہی ہے۔

وہ اٹھ کر اِدھر سے اُدھر ٹہلنے لگی۔ آنکھوں سے نیند اُڑ گئی تھی۔ ادھر ساس سسر اپنے وسیع ذرائع استعمال کر کے اپنے بیٹے کے لیے جدوجہد کر رہے تھے۔ جن بڑے بڑے افسران سے تعلقات اور شناسائی تھی، ان سے بی پاشا فون کے ذریعے باتیں کر رہی تھیں اور نعمان کے ڈیڈی خود کار میں بیٹھ کر کہیں گئے ہوئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ صبح تک نعمان کی واپسی ہو جائے۔ چاہے کتنے ہی روپے تاوان کے طور پر ادا کرنے پڑیں۔

شادی سے پہلے صدف کے والدین کا انتقال ہو گیا تھا۔ انہوں نے اس کے لیے اچھی

خاصی جائیداد چھوڑی تھی۔ وہ سب اس کے نام تھی لیکن کنواری تھی اس لیے اسے چچا اور چچی کے ساتھ جا کر رہنا پڑا تھا۔ بچپن سے شہری زندگی گزارنے والی کو وہاں کا ماحول پسند نہیں آیا تھا۔ ایک بڑے سے باڑے میں بھینسیں بندھی رہتی تھیں اور بھینسوں کے گوبر کی بو سے سانس لینا مشکل ہوتا تھا اور ان گوبروں سے اپلے تھاپے جاتے تھے۔ پھر ان سے چولہا جلایا جاتا تھا۔ اس پر کھانا پکتا تھا۔ صبح سے شام تک بھینسوں کی دیکھ بھال کی جاتی تھی۔ ایسی بندھی ہوئی زندگی تھی کہ اس کا دل گھبرانے لگا۔

نہ کوئی تفریح کی جگہ تھی۔ نہ کوئی پارک تھا اور نہ کوئی کلب تھا۔ نہ ہوٹلز تھے اور نہ سہیلیوں اور دوستوں کے جمگھٹے تھے۔

ایک ہی برس کے بعد اسے وہاں کی زندگی سے نجات مل گئی تھی۔ نعمان سے شادی کے بعد وہ پھر شہر میں آ گئی تھی۔ اس کے بعد سے توبہ کی تھی کہ کبھی پنڈ کی طرف رخ نہیں کرے گی لیکن اب حالات نے اس کا رخ پھر اس کی طرف موڑ دیا تھا۔

نعمان کے ڈیڈی اچھے خاصے ذرائع استعمال کر رہے تھے۔ رقم بھی خرچ کر رہے تھے لیکن یہ پتا نہیں چل رہا تھا کہ ان کے بیٹے کو کون لوگ لے گئے ہیں؟ اور کہاں لے گئے ہیں؟

شام کو اس کے چچا اپنی شریکِ حیات کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ اس کے چچا کا نام یوں تو کفایت اللہ تھا لیکن اسے کاپڑیا کہہ کر پکارا جاتا تھا۔ اس کی بیوی کا نام شاہدہ تھا لیکن شیدن کہلاتی تھی۔ بچوں کے نام بھی اچھے خاصے تھے لیکن سب کے نام بگڑے ہوئے تھے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ صدف کو بھی صدو کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ وہ اپنا نام سنتی تھی تو جل بھن جاتی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس کی پوری شخصیت کو بگاڑا جا رہا ہے۔ اس نے کئی بار اعتراض کیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ اسے صدو کہہ کر نہ پکارا جائے۔ چچا اور چچی دونوں ہی گرم مزاج تھے۔

آتے ہی انہوں نے جھگڑا شروع کر دیا۔ ”آپ لوگوں نے ہماری بیٹی کو کیا سمجھا ہے؟ کیا یہ آوارہ اور بدچلن ہے؟ فون پر ایسی باتیں کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟“

ادھر سے بی پاشا اور بی آپا نے بھی گرمی دکھائی۔ نعمان کا باپ بھی غصہ دکھانے لگا۔ اس کے چچا نے تن کر کہا۔ ”میرا نام کاپڑیا ہے کاپڑیا۔ میری صدو کے خلاف اگر ایک لفظ بھی زبان سے نکالا تو میں منہ توڑ کر رکھ دوں گا۔“

شیدن نے بھی کہا۔ ”اگر میری صدو ماں بن رہی ہے تو وہ تمہارے پوتے کی ماں بن

رہی ہے۔ اگر اس پر کوئی جھوٹا الزام دیا تو پھر ہم سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ ہم بھی تم لوگوں پر ایسا کیچڑ اچھالیں گے کہ تم لوگوں سے اسے چھپانا مشکل ہو جائے گا۔“

نعمان کے ڈیڈی ان لوگوں کے تیور دیکھتے ہی سہم کر پیچھے ہٹ گئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ”بھئی...... ہم کچھ نہیں کہیں گے۔ ہم اپنے بیٹے کا میڈیکل سرٹیفکیٹ تمہیں دیتے ہیں۔ وہ تم کسی کو بھی دکھاؤ اسے پڑھوا کر معلوم کرو۔ اس میں صاف صاف لکھا ہے کہ ہمارا بیٹا باپ نہیں بن سکتا۔ جب باپ نہیں بن سکتا تو پھر تمہاری یہ صدو کیسے ماں بن رہی ہے؟“

چچی شیدن نے کہا۔ ”تم لوگ صدو کو ماں بننے اور اپنے بیٹے کو باپ بننے سے نہیں روک سکتے۔ تم کہتے ہو تو ہم اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں لیکن جیسے ہی نعمان یہاں آئے گا تو اسے ہمارے پاس بھیجنا۔ ہم اس سے دوٹوک بات کریں گے اور اسے قبول کرائیں گے کہ وہ ہونے والے بچے کا باپ ہے۔ اس کے بعد ہی ہم اپنی صدو کو یہاں بھیجیں گے۔ چلو بیٹی صدو! ہم ابھی رات کی گاڑی سے واپس جائیں گے۔“

وہ پریشان ہو کر سوچنے لگی۔ وہ اتنی جلدی جانا نہیں چاہتی تھی۔ اسے امید تھی کہ نعمان ابھی نہیں آیا ہے تو کل آ جائے گا۔ اس نے کہا۔ ”اس شہر میں میری جو کوٹھی ہے۔ وہ پچھلے پانچ برس سے کرائے پر ہے۔ وہ ان لوگوں سے فوراً ہی خالی نہیں کروا سکتی لیکن ہم یہاں کرائے کا مکان لے کر رہ سکتے ہیں۔ میں نعمان کے آنے تک جانا نہیں چاہتی۔“

”بیٹی!...... جب نعمان آئے گا تو ہم تجھے یہاں لے آئیں گے یا اسے وہاں بلا لیں گے لیکن ہم تمہارے ساتھ یہاں نہیں رہ سکتے اور تم کو تنہا چھوڑ نہیں سکتے۔ ہمارا جانا ضروری ہے۔ فصل کی کٹائی شروع ہونے والی ہے۔ چلو اپنا سامان باندھو۔“

وہ اپنا ضروری سامان پہلے ہی اپنے بیگ اور اٹیچی میں رکھ چکی تھی۔ یہ جانتی تھی کہ نعمان نہیں آئے گا تو اسے یہاں سے جانا ہوگا۔ اس نے فون کے ذریعے رملا کو مخاطب کیا پھر کہا۔

”میں یہاں سے جا رہی ہوں۔ میرا دھیان نعمان کی طرف ہی رہے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ جیسے ہی نعمان واپس آئے۔ تو تم مجھے فوراً اطلاع دو۔“

”میں اس بات کی خبر رکھوں گی اور معلوم کرتی رہوں گی کہ نعمان یہاں کب پہنچ رہا ہے؟ جیسے ہی وہ پہنچے گا تو میں تمہیں فون کروں گی۔“

”اور جب وہ آئے گا تم اس سے ضرور ملاقات کرو اور اسے سمجھاؤ کہ اس کی وہ جو میڈیکل رپورٹ تھی وہ غلط تھی۔“

"یہ کیسی باتیں کر رہی ہو؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم نے اسے جھوٹی رپورٹ کے ذریعے بے وقوف بنایا تھا اور تمہارے اس جھوٹ میں، میں بھی شریک رہی ہوں؟"

"اب یہ جھوٹ تو کھلنے ہی والا ہے۔ وہ دوبارہ میڈیکل چیک اَپ کرائے گا تو سچ سامنے آجائے گا۔"

"وہ سچ سامنے آئے گا تو کہا جائے گا کہ قدرتی طور پر انسان کے اندر تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور اس کے اندر حال ہی میں یہ تبدیلی ہوئی ہے۔ تم اپنے چچا کے ساتھ جاؤ۔ اگر نعمان یہاں آئے گا تو میں اس سے بات کرلوں گی۔ اسے مطمئن کر دوں گی کہ تم اس کے بچے کی ہی ماں بننے والی ہو۔"

"ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں۔ فون کے ذریعے تم سے رابطہ رکھوں گی۔"

"جا تو رہی ہو لیکن میری ایک بات کو گرہ میں باندھ لو کہ ہونے والے بچے کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اب اس کی حفاظت لازمی ہوگئی ہے۔ اس کی زندگی سے ہی تمہاری عزت بنی رہے گی اور نعمان آئندہ تمہاری قدر کرے گا اور تمہارے لیے اپنے ماں باپ سے لڑے گا۔ جس گھر سے تم ہار کر جا رہی ہو۔ تم پھر اسی گھر میں واپس آؤ گی۔"

اس سے رابطہ ختم ہوگیا۔ اس نے چچا سے کہا۔ "آپ جا کر ٹیکسی لے آئیں ہم بس نکلتے ہیں۔"

اس کا چچا ٹیکسی لینے چلا گیا۔ صدف کو امید تھی کہ نعمان آ ہی جائے گا اور اس کے آتے ہی وہ پھر یہاں عزت و آبرو کے ساتھ واپس آجائے گی اور پہلے سے زیادہ اس کا مان بڑھ جائے گا۔ اس کے ساس سسر کو تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ واقعی دادا دادی بننے والے ہیں۔

بس نعمان کے آنے کی دیر تھی...... لیکن وہ کب آئے گا، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ دو دن گزر گئے، دو ہفتے گزر گئے۔ بی پاشا دہاڑیں مار مار کر رونے لگیں۔ باپ کا سر بھی جھکا ہوا تھا۔ آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ ان کے دلوں میں یہ بات پیدا ہونے لگی تھی کہ منیجر اور ڈرائیور کی طرح ان کے بیٹے کو بھی مار دیا گیا ہے۔ پولیس کے ایک اعلیٰ افسر نے کہا تھا کہ اگر اغوا کرنے والے آپ کے بیٹے کو علاقہ غیر لے گئے ہیں تو پھر ہم مجبور ہیں۔ وہاں نہیں جا سکتے۔ علاقہ غیر اور پاکستان کے درمیان ایک پولیٹیکل ایجنٹ ہوتا ہے جس کے ذریعے وہاں کے سرداروں سے گفتگو کی جاتی ہے۔ کوئی مسئلہ ہو تو اس کے ذریعے تصفیہ ہوتا ہے۔ آپ میرے ساتھ وہاں چلیں۔ پولیٹیکل ایجنٹ سے ملاقات کریں۔

نعمان کے باپ نے کہا۔ "وہ جتنی رقم مانگتے ہیں، میں دینے کے لیے تیار ہوں لیکن معلوم تو ہو کہ اسے کہاں لے جا کر رکھا گیا ہے؟ اس کے ساتھ کیا سلوک کیا گیا ہے؟"

اعلیٰ افسر نے کہا۔ "میں صوبہ سرحد کے ایک اعلیٰ افسر سے بات کرتا ہوں اور آپ کا غائبانہ تعارف کراؤں گا۔ وہاں جا کر آپ ان سے ملاقات کریں۔ وہ آپ کو وہاں پولیٹیکل ایجنٹ کے پاس لے جائیں گے۔"

وہ بے چارے اس کی واپسی کے لیے دعائیں بھی مانگ رہے تھے اور دوائیں بھی کر رہے تھے۔ دن رات اسی فکر میں مبتلا رہتے تھے اور بھاگ دوڑ میں لگے رہتے تھے۔

ادھر صدف پنڈ پہنچی ہوئی تھی۔ ایک کھلے مکان میں رہتی تھی لیکن وہاں کا ماحول اس کے مزاج پر گراں گزر رہا تھا۔ وہ ہر نئے دن کے آغاز کے ساتھ یہی سوچتی رہتی تھی کہ اسے نعمان کی آمد کی خبر ملے گی لیکن اسے نعمان کی آمد کی اطلاع نہیں مل رہی تھی۔ اب اس کا دل بھی ڈوبنے لگا تھا۔ "پتا نہیں ظالموں نے نعمان کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ وہ واپس نہیں آ رہا ہے۔ اس کا مطلب کیا ہے؟"

اس کا مطلب اگر دماغ سمجھتا تھا تو دل ڈوبنے لگتا تھا۔

☆======☆======☆

چاروں طرف حدِ نظر تک اونچی نیچی پہاڑیاں تھیں۔ دور دور تک بھاری بھاری پتھر پڑے ہوئے تھے اور اونچی اونچی چٹانیں تھیں۔ ان پہاڑیوں کے دامن میں کتنے ہی مزدور پتھر توڑ رہے تھے۔ ان ہی میں نعمان بھی تھا۔

اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دی گئی تھیں۔ ان بیڑیوں کے درمیان جو مضبوط زنجیر بندھی ہوئی تھی، وہ اتنی چھوٹی تھی کہ وہ صرف ایک فٹ کے فاصلے تک اپنا پاؤں بڑھا سکتا تھا پھر آگے بڑھنے کے لیے دوسرا پاؤں ایک فٹ کے فاصلے پر بڑھا سکتا تھا۔ اگر بھاگنا چاہتا، فرار ہونا چاہتا تو اس زنجیر سے الجھ کر گر پڑتا۔

وہ بچپن سے ذہنی محنت کرتا آیا تھا۔ گھر میں اتنی خوشحالی تھی کہ کبھی جسمانی محنت کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ جوان ہونے کے بعد اس نے باپ کے ساتھ کاروبار میں دل لگایا، دماغ لگایا۔ وہاں ذہنی صلاحیتوں کی ضرورت تھی اور اس نے کاروباری دنیا میں بھرپور صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا۔ وہ یہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پتھر توڑنے والی جسمانی محنت کرنی پڑے گی۔ دو دنوں میں اس کی ہتھیلیوں پر چھالے پڑ گئے تھے۔ اس نے گڑگڑا کر

التجائیں کیں کہ اسے آرام کرنے دیا جائے۔ اس کا علاج کرایا جائے لیکن جواب میں اسے ٹھوکریں ماری جاتی تھیں یا چابک رسید کیا جاتا تھا۔

صرف رات کا کھانا دیا جاتا تھا اور آرام کرنے کی اجازت دی جاتی تھی۔ صبح ہوتے ہی پھر کام پر لگنا پڑتا تھا اور اندھیرا ہونے تک وہ مشقت کرتا رہتا تھا۔ اس کی طرح اور بھی وہاں مشقت کرنے والے قیدی تھے۔ جوان بوڑھے اور بچے بھی تھے۔ دور دور تک پہاڑیوں میں اور چٹانوں میں گن مین بیٹھے رہتے تھے۔ تاکہ فرار ہونے والوں کو دور ہی سے گولی مار سکیں۔

ویسے پیروں کی زنجیریں اتنی تنگ ہوتی تھیں کہ کوئی وہاں سے بھاگ نہیں سکتا تھا۔

نعمان شروع شروع میں رحم کی بھیک مانگتے مانگتے اتنی مار کھا چکا تھا کہ اب رحم کا لفظ بھی زبان پر نہیں آتا تھا۔ ہاتھوں کے چھالے بڑے ہو کر پھوٹ گئے تھے۔ ان میں سے لہو اور پانی رسنے لگا تھا۔ رات کے وقت اس کی ہتھیلیوں پر دوا لگا دی جاتی تھی۔ صبح اسے محنت و مشقت کے لیے مجبور کیا جاتا تھا۔ وہ مار کھا کر سہم گیا تھا۔ اب ان سے رحم کی بھیک نہیں مانگتا تھا۔ فوراً ہی پتھر توڑنے لگتا تھا۔

اسے یہاں تک پہنچانے والے نے درست کہا تھا کہ اسے ایسی جگہ لے جایا جا رہا ہے جہاں سے وہ کبھی واپس نہیں آ سکے گا۔ اگر قسمت اچھی رہی تو شاید وہ اپنے گھر والوں کا منہ دیکھ سکے۔ دو ہفتے گزرنے کے بعد نعمان کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ واقعی اب کبھی گھر والوں کا منہ نہیں دیکھ سکے گا۔ وہ خوش قسمت نہیں ہے۔ اس کی بدقسمتی یہاں لے آئی ہے۔

وہ ایسی جگہ تھی جہاں اس کی دولت کام نہیں آ سکتی تھی۔ وہ کسی کو رشوت نہیں دے سکتا تھا۔ ان کا سردار کون تھا، کہاں رہتا تھا، کوئی نہیں جانتا تھا۔ اس کے ساتھ مشقت کرنے والے ایک بوڑھے نے اسے نصیحت کی۔ ''بیٹے! یہاں کبھی کسی سے یہ نہیں کہنا کہ تم بہت زیادہ دولت مند ہو۔ اگر یہاں کے سردار کو معلوم ہو گیا تو وہ تمہیں کبھی نہیں جانے دے گا اور تمہارے ذریعے تمہارے گھر والوں سے بڑی بڑی رقمیں منگوایا کرے گا اور تمہارے ساتھ صرف یہ رعایت کرے گا کہ تم سے یہاں مشقت نہیں کروائے گا۔ کسی اور جگہ قیدی بنا کر رکھے گا مگر تمہاری رہائی ممکن نہیں ہوگی۔''

وہ سوچنے لگا کہ کیا کیا جائے؟ اب کیا سردار تک یہ بات پہنچائی جائے کہ وہ دولت مند ہے اور اس کی مطلوبہ رقمیں ادا کر سکتا ہے؟

سوال یہ پیدا ہوا کہ کب تک رقمیں ادا کرتا رہے گا۔ سردار تو لالچی ہے مہینے دو مہینے میں

بڑی بڑی رقمیں طلب کرتا رہے گا۔ وہ کب تک دیتا رہے گا؟ آخر اس کا بینک بیلنس ختم ہو جائے گا۔ تو پھر کیا ہوگا؟ کیا پھر اسے پتھر توڑنے کے لیے یہاں واپس بھیج دیا جائے گا؟

وہاں کی ایک پہاڑی میں بہت بڑا دور تک پھیلا ہوا ایک غار تھا۔ جہاں قیدیوں کو رات میں رکھا جاتا ہے۔ وہیں انہیں کھانا دیا جاتا تھا اور وہیں زمین پر انہیں سونا پڑتا تھا۔ سردیوں میں ایک آدھ کمبل اوڑھنے کے لیے دے دیا جاتا تھا۔ بس اس حد تک ان کا خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ زندہ رہیں اور محنت مزدوری کرتے رہیں۔

غار کے دہانے سے اس کے آخری سرے تک تین شبینہ چوکیدار گن لیے گھومتے رہتے تھے۔ جگہ جگہ مشعلیں روشن رہتی تھیں۔ جس بوڑھے نے نعمان کو نصیحت کی تھی۔ اس کا نام صمد یار خان تھا۔ اس کے ساتھ اس کا ایک جوان بیٹا بھی قیدی تھا۔ اس کا نام احمد یار خان تھا۔

بوڑھے صمد یار خان نے بتایا کہ وہ لوگ علاقہ غیر کے رہنے والے ہیں اور یہ جو بیگار کیمپ یہاں قائم کیا گیا ہے، یہ علاقہ غیر کے قریب ہی کہیں ہے۔

نعمان نے پوچھا۔ ''کیا تمہارے علاقے کا سردار تمہیں یہاں سے چھڑوا کر نہیں لے جا سکتا؟''

''اول تو ہمارے سردار کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ ہمیں کہاں لا کر رکھا گیا ہے پھر یہ کہ ایک علاقے کا سردار دوسرے علاقے کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتا ہے۔''

اس کے بیٹے احمد یار خان نے کہا۔ ''اگر ہم کسی طرح یہاں سے نکل کر اپنے علاقے میں پہنچ جائیں تو پھر یہاں کا سردار اور اس کے آدمی اس علاقے میں قدم نہیں رکھ سکیں گے۔''

بوڑھے نے کہا۔ ''یہاں کے ایک شبینہ چوکیدار سے معاملات طے کر رہا ہوں۔ وہ پچیس ہزار روپے مانگ رہا ہے۔ میں بہت مشکل میں پڑ گیا ہوں کہ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

نعمان نے کہا۔ ''اگر کوئی ایسا ذریعہ ہو کہ میری لکھی ہوئی ایک پرچی میرے گھر تک پہنچ جائے تو وہاں سے لاکھوں روپے مل سکتے ہیں۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔ یہ لوگ ایسے نادان نہیں ہیں کہ یہاں سے پرچی لے کر جائیں اور وہاں گرفتار ہو جائیں۔''

بوڑھے نے کہا۔ ''میرے پاس پچیس ہزار روپے ہیں۔ گھر میں چھپا کر رکھے ہیں۔ میں نے جوانی سے اب تک محنت و مشقت کر کے وہ رقم جمع کی ہے۔ جوان بیٹی کی شادی کرنی ہے۔ اگر وہ رقم اپنی رہائی کے لیے خرچ کی تو پھر بیٹی کی شادی کیسے ہوگی۔''

احمد یار خاں نے کہا۔ ''بابا!...... میں کتنی بار سمجھا چکا ہوں کہ بہن کی فکر نہ کرو جب ہم یہاں سے رہائی پا کر جائیں گے تو دونوں مل کر محنت مزدوری کریں گے پھر سے اتنی رقم جمع کر لیں گے۔''

''اتنی رقم جمع کرنا آسان کام سمجھتے ہو؟ جب تک یہ رقم جمع ہو گی۔ اس وقت تک بیٹی بوڑھی ہو جائے گی۔''

نعمان نے کہا۔ ''ایسا ہو سکتا ہے کہ تم وہ رقم اس نائٹ چوکیدار کو دے کر رہائی حاصل کر لو۔ اپنے علاقے میں جاؤ۔ وہاں تمہیں آزادی ہو گی پھر وہاں سے میری لکھی ہوئی پرچی میرے گھر دے سکتے ہو۔ میرے گھر والوں اور وہاں کے قانون کے محافظوں کو بتایا جا سکتا ہے کہ مجھے یہاں لا کر قید کیا گیا ہے؟''

بوڑھے نے انکار میں سر کو ہلایا پھر کہا۔ ''ہمارے علاقے سے بھی کوئی پرچی پاکستان کے کسی حصے میں نہیں جا سکتی۔ کسی بھی پولیس والے تک نہیں پہنچائی جا سکتی۔ یہاں علاقہ غیر کے سردار ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ دشمنی رکھتے ہیں لیکن کسی بھی ملک اور شہر کی پولیس اور فوج کو اپنے علاقے میں آنے نہیں دیتے۔''

احمد یار خان نے کہا۔ ''حکومت پاکستان سے بہت سے معاملات میں ان سرداروں کی اچھی دوستی ہے لیکن وہ پولیس اور فوج کو ادھر نہیں آنے دیتے۔ کوئی پیچیدہ مسئلہ ہو تو پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعے ایک دوسرے سے سمجھوتا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کی بات مانتے ہیں اور جو بھی شکایت ہوتی ہے اسے دوستانہ ماحول میں رہ کر دور کر دیتے ہیں۔''

صمد یار خان نے کہا۔ ''مختصر یہ کہ علاقہ غیر کا کوئی بھی سردار آپس کی دشمنی کے باوجود کسی کی مخبری دوسری جگہ نہیں کرتا ہے۔ ہمارے علاقے کا سردار بھی کسی کو نہیں بتائے گا کہ یہ بیگار کیمپ کہاں قائم ہے۔''

نعمان مایوس ہو گیا۔ رہائی کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہاں کوئی تدبیر کام نہیں آ سکتی تھی۔ وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اسے خراٹوں کی آوازیں سنائی دیں۔ بوڑھا گہری سو گیا تھا۔ آس پاس دور تک بوڑھے جوان بچے سب ہی ہاتھ پاؤں پھیلا کر تھکے ہوئے سو رہے تھے۔ تمام دن کی مشقت کے بعد ایک دوسرے سے بات کرنے کا دل بھی نہیں چاہتا تھا۔ دل چاہتا تھا کہ بس پیٹ کی آگ بجھے اور فوراً ہی ہاتھ پاؤں پھیلا کر سو جائیں۔

نعمان نے ایک گہری سانس لی پھر سوچا کہ میری صدف کتنے مزے سے ٹھنڈے کمرے میں سو رہی ہو گی۔ میری ممی اور ڈیڈی بھی سو رہے ہوں گے۔ اگرچہ سب ہی میرے لیے پریشان ہوں گے، مجھے تلاش کر رہے ہوں گے لیکن ہزاروں پریشانیوں کے باوجود انسان کو نیند آ ہی جاتی ہے۔ لہٰذا وہ فوم کے لچک دار آرام دہ گدے پر آرام سے سو رہے ہوں گے اور میں یہاں پتھریلی زمین پر پڑا ہوا ہوں۔

پھولوں کی سیج ہو یا کانٹوں کا بستر ہو۔ نیند تو آ ہی جاتی ہے۔ نعمان بھی آخر سو گیا۔

☆======☆======☆

انتظار بڑا تھکا دینے والا تھا۔ ایک ایک دن ایک ایک برس اور کبھی کبھی ایک ایک صدی کی طرح گزرتا ہوا لگتا تھا۔ صدف رملا سے نعمان کے بارے میں پوچھتی رہتی تھی۔ اور ادھر نعمان کے ماں باپ کی امیدیں دم توڑ رہی تھیں۔ ایک مہینہ گزر چکا تھا اور کہیں سے اس کا سراغ نہیں مل رہا تھا۔

نعمان کے ڈیڈی ایک پولیس افسر کے ساتھ سرحدی علاقے میں بھی گئے تھے۔ پولیٹیکل ایجنٹ سے بھی ملاقات کی تھی اور اس نے یقین دلایا تھا کہ وہ ملاقات کا موقع حاصل کر لے گا۔ وہ پریشانی میں تقریباً ایک مہینے رہے۔ ہر صبح یہ امید ہوتی تھی کہ شاید اس کے بارے میں کچھ معلوم ہو سکے لیکن پولیٹیکل ایجنٹ نے مایوسی ظاہر کی اور کہا۔ ''میں علاقہ غیر کے تمام سرداروں سے بات کر چکا ہوں۔ آپ کا بیٹا کسی کے علاقے میں نہیں ہے۔ اگر ادھر کوئی بیگار کیمپ ہے تو ہم نہیں جانتے۔ ان علاقوں میں جو مجرمانہ دھندے ہوتے ہیں، وہ ساری دنیا سے چھپائے جاتے ہیں۔ ہمیں بھی ان کے بہت سے راز معلوم نہیں ہوتے۔''

نعمان کے ڈیڈی مایوس ہو کر واپس آ گئے تھے۔ گھر میں رونا پیٹنا لگا ہوا تھا۔ اولاد مر جائے تو صبر آ جاتا ہے لیکن زندہ ہو یا لاپتا ہو اور اس کے مرنے کی خبر ملتی ہو نہ جینے کی تو ایسے میں صبر نہیں ہوتا۔ انتہائی مایوسی کے باوجود یہ امید رہتی ہے کہ وہ اچانک ہی کہیں سے چلا آئے گا۔

صدف اس طویل انتظار کے دوران میں مایوس ہوتی جا رہی تھی اور سوچتی تھی کہ اب اسے شہر میں اپنی دولت اور جائیداد کا حساب خود ہی رکھنا ہے۔ اپنے مستقبل کی فکر کرنی ہے۔ پتا نہیں نعمان کب آئیں گے؟ میرا دل کہتا ہے کہ وہ کہیں بھی ہیں زندہ ہیں مگر بہت مجبور ہیں، مجھ سے رابطہ نہیں کر پا رہے ہیں۔

اس نے اپنی شہر والی کوٹھی خالی کروالی تھی۔ اپنی چچی اور ان کے جوان بیٹے اور بیٹی کو لے کر وہاں آ گئی تھی۔ چچی شیدن نے خود ہی کہا تھا کہ میں تمہیں تنہا نہیں رہنے دوں گی۔ جب زچگی ہو جائے گی۔ بچہ و زچہ دونوں خیریت سے ہوں گے تو پھر میں پنڈ واپس چلی جاؤں گی۔

صدف اس لیے بھی شہر آ گئی تھی کہ وہاں ڈاکٹر رملا اس کا بہت خیال رکھنے والی تھی اور وہ واقعی ہر دوسرے تیسرے دن اس کا معائنہ کیا کرتی تھی۔ اس کی دواؤں میں تبدیلیاں کرتی تھی اور اس کی خوراک کا خاص خیال رکھتی تھی۔

صدف نے کہا۔ ''میں کبھی ماں بننا نہیں چاہتی تھی مگر حالات نے مجبور کر دیا ہے۔ میں بدچلنی کا الزام نہیں اٹھاؤں گی۔ بس نعمان کا انتظار ہے، وہ آئیں گے ان کا دوبارہ میڈیکل چیک اَپ ہوگا تو مان جائیں گے کہ میں ان کے بچے کی ہی ماں بننے والی ہوں اور یہ ثابت کرنے کے لیے مجھے ماں بننا ہی ہوگا۔''

''میں پہلے بھی تمہیں سمجھاتی تھی کہ فطری تقاضوں کے مطابق زندگی گزارو۔ ایک میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں جو ہوتا ہے اسے ہوتے رہنے دو۔ اس کی روک تھام نہیں ہونی چاہیے۔''

وہ بولی۔ ''ایک بات بتاؤ کہ زچگی کے بعد میرا فیگر ایسا ہی رہے گا ناں......؟ ایسا تو نہیں لگے گا ناں...... کہ میرے بدن سے دوشیزگی اور خوبصورتی کو نچوڑ لیا گیا ہو......؟''

''ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ جو دوائیں دے رہی ہوں انہیں باقاعدگی سے استعمال کرتی رہو اور اچھی خوراک کھاتی رہو۔ تم تندرست رہو گی تو بچہ بھی تندرست رہے گا۔''

''میں بچے کی نہیں اپنی بات کر رہی ہوں۔ اگر زچگی کے بعد کچھ اونچ نیچ ہوئی تو تم اپنی دواؤں سے اپنے علاج سے اسی طرح میرا فیگر بنا کر رکھ سکو گی؟''

''اچھی دواؤں سے اچھی خوراک سے اور ہلکی پھلکی ورزش سے تم اپنے موجودہ فیگر کو قائم رکھ سکو گی۔ کتنی ہی تعلیم یافتہ عورتیں ہیں جو زچگی کے بعد بھی صحت مند، خوبصورت اور پُرکشش لگتی ہیں۔ تم بھی ایسی ہی دکھائی دو گی۔''

''ٹھیک ہے...... اب ماں تو بننا ہی ہے، مجبوری ہے لیکن میں بچے کو دودھ نہیں پلاؤں گی۔''

''یہ کیسی باتیں کر رہی ہو...... کیا اپنے بچے سے دشمنی کرو گی؟ اسے بھوکا مارو گی؟''

''اپنا دودھ نہ پلانے کا مطلب یہ تو نہ ہوا کہ میں بچے کو بھوکا مار ڈالوں گی؟ کیا بازار میں ایک سے ایک اچھی کوالٹی کا دودھ نہیں ملتا؟''

''چاہے کتنی ہی اچھی کوالٹی کے دودھ ملیں وہ ماں کے دودھ کا نعم البدل نہیں ہو سکتے۔''

''اب تم یہ کیوں چاہتی ہو کہ میں بچے کو دودھ پلاؤں؟''

''میں ڈاکٹر ہوں۔ اچھی طرح جانتی ہوں کہ جو قدرتی نظام ہے اس کے مطابق مرد اور عورت کو زندگی گزارنی چاہیے۔ پتا ہے جو عورتیں بچوں کو اپنا دودھ نہیں پلاتیں وہ سینے کی طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔''

''اور جن ماؤں کو دودھ نہیں آتا وہ فیڈر سے دودھ پلاتیں ہیں انہیں بیماری نہیں ہوتی؟''

''وہ مائیں قدرتی طور پر مجبور ہوتی ہیں اس لیے فیڈر سے دودھ پلاتی ہیں اور جب قدرتی طور پر دودھ نہیں آتا ہے تو پھر بیماری بھی نہیں ہوتی ہے۔ تم قدرت کے نظام کو کیا سمجھو گی؟ ہم ڈاکٹر تم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔''

''رملا...... میں نے دودھ پلانے والی ماؤں کو دیکھا ہے ان کا فیگر عجیب سا ہو جاتا ہے۔''

''میں تمہیں ایسی درجنوں مائیں دکھاؤں گی۔ جو دودھ پلانے کے باوجود اپنا حسن و دلکشی اور اپنا فیگر برقرار رکھتی ہیں۔ تم نے ایسی غریب عورتوں کو بیمار اور کمزور دیکھا ہے جو اپنی غربت کے باعث اچھی خوراک استعمال نہیں کر سکتیں اور نہ ہی ڈاکٹر سے باقاعدہ علاج کروا سکتی ہیں۔ نہ باقاعدہ علاج کرا سکتی ہیں نہ اچھی خوراک کھا سکتی ہیں۔ زندگی میں خوشحالی نہ ہو تو فکر و پریشانی ایسی عورتوں کو کھا جاتی ہے۔ خدا کا شکر کرو کہ تم دولت مند ہو۔ خوشحال ہو۔ بچے کو اپنا دودھ پلانے کے باوجود تندرست و توانا اور خوبصورت دکھائی دیتی رہو گی۔''

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''پہلے مجھے زچگی کے مرحلے سے گزرنے تو دو۔ خوامخواہ ایک نئے مسئلے میں الجھا رہی ہو۔''

''تم مجھے الجھا رہی ہو۔ پہلے تو ماں بننے سے انکار کرتی رہیں۔ اب حالات نے مجبور کیا ہے تو ماں بن رہی ہو مگر بچے کو دودھ پلانے سے انکار کر رہی ہو۔ آخر تمہیں یہ کیا ہوتا رہتا ہے۔''

''میں کچھ نہیں جانتی۔ میں ابھی جیسی چارمنگ اور اسمارٹ ہوں۔ ویسے ہی رہنا چاہتی

ہوں۔ضروری تو نہیں کہ دنیا کی ہر عورت کے اندر ممتا کے جذبات بھڑکتے ہوں اور وہ ماں بننا چاہتی ہو اگر مجبوراً بن بھی رہی ہو تو یہ ضروری نہیں ہے کہ بچے کو دودھ ہی پلائے ، بہتر ہے کہ ہم اس موضوع پر بحث نہ کریں۔نو ماہ کے بعد دیکھا جائے گا۔''

''میں نے جب پہلی بار چیک کیا تو تمہیں ایک ماہ کا حمل تھا۔ایک ماہ اب اور گزر چکا ہے۔اس کا مطلب ہے کہ زچگی کے لیے صرف سات ماہ رہ گئے ہیں۔تم ابھی تک نو ماہ کی گنتی کر رہی ہو۔اب جاؤ......اور ذہن میں کوئی بری سوچ نہ رکھو۔اللہ پر بھروسا رکھو۔نعمان ضرور واپس آئے گا۔ان حالات میں تمہیں خوش رہنا چاہیے اور تمام فکر و پریشانی کو ذہن سے نکال دینا چاہیے۔خوش رہنے کی کوشش کرو گی تو دکھ اور بیماری تم سے دور رہیں گے۔''

وہ گھر آئی تو اسے یاد آیا کہ اس کی ماں نے بھی اسے دودھ نہیں پلایا تھا۔اس سے کہا کرتی تھی کہ اس نے غلطی کی ہے۔اسے دودھ پلانا چاہیے تھا۔جب وہ جوان ہوئی تھی تو ماں نے کہا تھا کہ تمہاری شادی ہو گی۔تم بھی کبھی ماں بنو گی تو یاد رکھنا کہ اپنے بچے کو اپنا دودھ ضرور پلانا۔

اس نے اسٹور روم میں آ کر ایک الماری کو کھول کر ایک فائل نکالی۔کئی برس تک اس کی ماں کا علاج ہوتا رہا تھا۔کتنے ہی ای سی جی ، ایکسرے رپورٹ وغیرہ اس فائل میں موجود تھے۔اسی میں یہ میڈیکل رپورٹ بھی تھی کہ اس کی ماں کو کینسر ہو گیا تھا اور وہ اس مہلک مرض میں مبتلا ہو کر مر گئی تھی۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر رملا سے اس کی بحث ہوئی تھی۔اور صدف نے کہا تھا کہ میں نہیں مانتی کہ ممی نے مجھے دودھ نہیں پلایا تھا۔فیڈر کا دودھ پلاتی تھیں۔اس لیے انہیں کینسر ہو گیا تھا۔ایسی تو بے شمار مائیں ہیں جو اپنے بچوں کو اپنا دودھ نہیں پلاتی ہیں۔سب کو تو کینسر کا مرض نہیں ہوتا ہے؟

ڈاکٹر رملا نے کہا۔''ہاں......ضروری نہیں ہے کہ کینسر ہو جائے لیکن طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ایک بیماری ختم ہوتی ہے تو دوسری لگ جاتی ہے۔سینے کا مرض بڑا ہی مہلک ہوتا ہے۔اندرونی نظام میں گڑبڑ ہوتی ہے ، یہ ہم ڈاکٹر ہی بہتر سمجھتے ہیں جو کچھ نہیں جانتے وہ بہت زیادہ بحث کرتے ہیں۔تم بھی اس سلسلے میں کچھ نہیں جانتی ہو لیکن بحث کرتی رہو گی۔سینے کے اندر کیسے کیسے امراض مسئلہ بنتے رہتے ہیں۔یہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا۔خدا نہ کرے اگر کبھی ایسے بدترین مراحل سے گزرو گی تب ہی تمہاری آنکھیں کھلیں

گی لیکن اس وقت تک پانی سر سے گزر چکا ہو گا۔''

جن عورتوں کو اپنے حسن پر ناز ہوتا ہے۔وہ صرف اپنا آپ دیکھتی ہیں۔بعض عورتیں تو سدا بہار رہنے کے لیے شادی ہی نہیں کرتیں اور جو شوبز کی دنیا میں ہوتی ہیں۔وہ اول تو شادی سے کتراتی ہیں اور اگر کر بھی لیتی ہیں تو بچے پیدا نہیں کرتیں۔اگر کسی مجبوری سے بچہ ہو جائے تو اسے اپنا دودھ نہیں پلاتیں۔انہیں اپنے حسن اور گلیمر کو برقرار رکھنے کے لیے سو سو جتن کرنے پڑتے ہیں۔

صدف کوئی ماڈل گرل نہیں تھی۔شوبز سے بھی اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔اس کے باوجود وہ انیسویں صدی کی ان خواتین میں سے تھی جو خود کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کے لیے دن رات بیوٹی پارلر جاتی ہیں اور ہیلتھ کلب جا کر اپنے بدن کے نشیب و فراز کو برقرار رکھنے کے لیے کوشش کرتی رہتی ہیں۔

اس نے پہلے تو ماں بننے سے انکار کیا تھا اور اب حالات نے مجبور کیا تھا تو وہ بچے کو دودھ پلانے سے انکار کر رہی تھی۔یہ المیہ اس کے اپنے گھر میں ہو چکا تھا۔اس کی ماں کے ساتھ ہو چکا تھا کہ وہ بچے کو دودھ نہ پلانے کی وجہ سے کتنی مہلک بیماری میں مبتلا رہ کر مر گئی تھیں۔

سینے کا سرطان ایسی ہی عاقبت نا اندیشی سے ہوا کرتا ہے اور اگر نہ بھی ہو تو چھوٹی بڑی بیماریاں عذاب بنتی رہتی ہیں۔نظام فطرت کے خلاف کبھی زندگی گزاری نہیں جاتی۔

لیکن ایسے مرد و عورتیں بے شمار ہیں جن پر نصیحتیں بے اثر ہوتی ہیں۔انہیں حالات کی ٹھوکریں کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور انہیں اس وقت معلوم ہوتا ہے جب سیکھنے کا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

☆======☆======☆

سورج ایسے چمک رہا تھا اور ایسی تپش دے رہا تھا کہ جیسے سوا نیزے پر آ گیا ہو۔دن کے بارہ بج رہے تھے اور سورج واقعی سر پر آ کر جل رہا تھا۔تمام بیگار کرنے والے ہاتھوں میں بڑے ہتھوڑے اور کدال لیے کہیں پتھر توڑ رہے تھے اور کہیں چٹانوں کو توڑتے توڑتے ہانپ رہے تھے ، کانپ رہے تھے ، تھرتھرا رہے تھے۔کبھی چابک کھا کر گر رہے تھے۔کاتب تقدیر نے ان کے لیے مظلومیت اوز مشقت لکھ دی تھی اور وہ تقدیر کا لکھا پورا کر رہے تھے۔

بوڑھے صمد یار خان کے ساتھ بھی یہ ہوا۔وہ اپنے جوان بیٹے احمد یار خان اور نعمان کے

ساتھ پتھر توڑ رہا تھا۔ پہلے اس بوڑھے کو چٹان توڑنے کے لیے کہا گیا تھا۔اس کے ہاتھوں میں کدال دی گئی تھی۔اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔''میں بہت بوڑھا ہوں۔ چٹان کو توڑ نہیں سکوں گا۔کدال نہیں چلاسکوں گا۔ مجھے پتھر ہی توڑنے دو۔''

کدال چلا کر یا بڑے بڑے ہتھوڑے مار کر چٹان توڑنے کے لیے بڑی محنت اور طاقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ چابک مارنے والے نے کہا۔''سپروائزر نے جسے جو کام دیا ہے،اسے وہی کرنا ہوگا۔''

یہ کہہ کر اس نے بوڑھے کو ایک ہاتھ مارا۔وہ لڑکھڑا کر گر گیا۔اس کا بیٹا احمد یار خان چیختا ہوا آیا۔''تم کیوں ایک بوڑھے پر ظلم کر رہے ہو؟ دیکھ رہے ہو کہ وہ بیمار اور کمزور ہے۔''

وہ آگے بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ایک گن مین نے رائفل کی نال اس کے سینے سے لگا دی تھی۔اس پہرے دار نے پھر اس بوڑھے کو مارنا چاہا۔اس بار نعمان ڈھال بن گیا۔ بوڑھے سے لپٹ کر بولا۔''خدا کے لیے اسے نہ مارو۔اس کے بڑھاپے کا خیال کرو۔ یہ چٹان نہیں توڑ سکے گا۔''

پہرے دار نے نعمان کو ایک چابک مارتے ہوئے کہا۔''تو پھر اٹھو یہ کدال اٹھاؤ اور اس چٹان کو توڑنا شروع کرو۔''

نعمان نے بوڑھے کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا۔''بابا......آپ وہاں چھاؤں میں میری جگہ چلیں اور ان پتھروں کو توڑتے رہیں۔ دھیرے دھیرے کام کرتے رہیں۔ ورنہ یہ ظالم پھر آپ پر ظلم کریں گے۔''

وہ بوڑھے کو اپنی جگہ پہنچا کر کدال اٹھا کر ایک چٹان پر ضربیں لگانے لگا۔ بڑی محنت کا کام تھا۔ایک تو کدال بھاری تھی پھر اسے سر کی بلندی سے اوپر اٹھا کر کدال کو چٹان پر مارنا اور پھر بار بار ضربیں لگا کر اسے توڑنا بہت ہی مشکل کام تھا۔

وہ اس عرصے میں پہلے بھی کئی بار چٹانیں توڑ چکا تھا۔اس کے ساتھ دوسرے قیدی بھی ہوا کرتے تھے۔سب مل کر دن بھر میں بڑی سی ایک چٹان کو توڑ دیتے تھے۔وہ ظالم محنت تو کراتے تھے مگر ایک اور ظلم یہ کرتے تھے کہ دوپہر کا کھانا نہیں دیتے تھے۔صبح کو کچھ کھانے کے لیے دے دیا کرتے تھے پھر رات کو انہیں پیٹ بھر کر کھانا دیا جاتا تھا۔

نعمان ایک وقت بھوکا رہ کر مشقت کرنے کا عادی ہو گیا تھا۔کدال بھی چلا لیتا تھا لیکن شام تک وہ بالکل ہی نڈھال سا ہو گیا۔تھک کر ایک طرف بیٹھ گیا۔کام ختم ہو چکا تھا۔اندھیرا

ہونے والا تھا۔سب کو آرام کرنے اور ستانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔

صمد یار خان اپنے بیٹے کے ساتھ آکر اس کے قریب بیٹھ گیا پھر اس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔''بیٹے!......تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔اگر تم نہ ہوتے تو وہ ظالم مجھے ضرور کدال چلانے پر مجبور کرتے۔میری عمر اور بیماری کا خیال نہیں کرتے۔''

نعمان نے اس کا ہاتھ گھٹنے سے اٹھا کر اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر کہا۔''آپ میرے بزرگ ہیں۔میرے باپ کے برابر ہیں۔آپ کا بیٹا بھی آپ کی مدد کے لیے آنا چاہتا تھا لیکن اسے روک دیا گیا تھا۔مجھے موقع ملا تو میں نے آپ کی حمایت کی۔یوں بھی آپ مجھے بیٹا ہی کہتے ہیں۔میں نے محض ایک بیٹے کا فرض ادا کیا ہے۔''

''خوش رہو بیٹے!......اللہ تمہیں رہائی دے۔آزادی دے۔اپنوں سے ملائے، یہاں رہ کر تو بس دعائیں مانگی جا سکتی ہیں۔''

نعمان نے کہا۔''یہ تو اللہ کی مرضی ہے کہ وہ کب دعائیں قبول کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ لازمی ہے کہ کوئی تدبیر بھی کی جائے۔''

وہ بوڑھا سر کو انکار میں ہلاتے ہوئے بولا۔''یہاں کوئی تدبیر کام نہیں آئے گی۔یہ لوگ بہت چالاک ہیں بہت دور دور تک پھیلے ہوئے ہیں پھر سب ہی مسلح ہیں اور کسی کا بھی لحاظ نہیں کرتے ہیں۔جیسے ہی پتا چلتا ہے کہ کوئی بھاگنے کی کوشش کر رہا ہے تو اس سے کچھ پوچھتے نہیں ہیں۔فوراً گولی مار دیتے ہیں۔''

''آپ نے کہا تھا کہ ایک نائٹ چوکیدار پچیس ہزار روپے لے کر آپ دونوں کو یہاں سے نکال لے جا سکتا ہے۔میں کہتا ہوں کہ یہی کرنا چاہیے۔آپ دونوں سلامت رہیں گے۔ وہاں جا کر پھر سے محنت کریں گے تو بیٹی کی شادی کر سکیں گے۔شادی نہ بھی ہوئی تو یہ بات مناسب نہیں ہے کہ ایک بیٹی کو بیاہنے کے لیے باپ اور بیٹے دونوں ہی یہاں مشقت کرتے کرتے اپنی جان دے دیں۔آپ لوگوں کے بغیر وہاں پتا نہیں آپ کی بیٹی کا کیا حال ہو رہا ہوگا؟''

بیٹے نے کہا۔''میں بابا کو سمجھاتا ہوں۔ان کا بڑھاپا دیکھ کر بہت دکھ ہوتا ہے۔مجھے فکر نہیں ہے۔میں اپنی ساری جوانی یہاں قیدی بن کر گزار سکتا ہوں لیکن انہیں پچیس ہزار روپے کی فکر ہے کہ یہ دوبارہ اتنی رقم جمع نہیں کر سکیں گے۔''

نعمان نے کہا۔''میں نے آپ دونوں کو بتایا ہے کہ پچیس ہزار میرے سامنے کچھ بھی

نہیں ہیں۔ میں لاکھوں روپے خرچ کر سکتا ہوں۔ اگر آپ میری لکھی ہوئی ایک پرچی یہاں سے لے کر جائیں اور اسے کسی طرح میرے گھر والوں تک پہنچا دیں تو آپ کو منہ مانگی رقم ملے گی۔ اتنا تو ہوگا کہ انہیں پتا چل جائے گا کہ میں کسی بیگار کیمپ میں ہوں اور زندہ ہوں۔ وہ مجھے نکال سکیں یا نہیں نکال سکیں لیکن مجھے مردہ سمجھ کر ماتم تو نہیں کریں گے۔''

صمد یار خان نے اسے ہمدردی سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میرا جی چاہتا ہے کہ میں تمہارے لیے کچھ کروں۔ تم اور احمد یار خان ٹھیک کہتے ہو۔ مجھے اس نائٹ چوکیدار سے معاملات طے کر کے یہاں سے جانا چاہیے اور میں جب بھی یہاں سے جاؤں گا تو تمہارے ہاتھ کی لکھی ہوئی پرچی ضرور لے جاؤں گا۔ کوشش کروں گا کہ اسے تمہارے گھر تک پہنچاؤں مگر اس کے لیے بھی مجھے اپنے سردار سے اجازت لینی ہوگی۔ کیوں کہ ہم اپنے سردار کی مرضی کے بغیر ایسا کوئی کام نہیں کر سکتے۔ جس کا تعلق علاقہ غیر سے نہ ہو۔ باہر کی دنیا سے ہو۔''

''کیا تمہارا سردار راضی ہو جائے گا؟''

''اسے بتانا ہوگا کہ تمہارے پاس کچھ بچی ہوئی رقم ہے اور وہ شہر میں ہے مگر یہ بات چھپانی ہوگی کہ تم بہت زیادہ دولت مند ہو۔ اسے معلوم ہوگا تو وہ بیگار کیمپ والے سردار سے تمہیں حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اور پھر تمہیں اپنا قیدی بنا لے گا پھر تمہارے گھر والوں سے لاکھوں روپے طلب کرے گا۔''

''آپ اس کی فکر نہ کریں۔ میں لاکھوں روپے دے کر وہاں سے نجات حاصل کر لوں گا اور اپنے گھر جا سکوں گا۔''

''بیٹے! ...... تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ یہ سردار بڑے لالچی ہوتے ہیں۔ جب انہیں لاکھ دو لاکھ دو گے۔ تو اس کے بعد سوچتے ہیں کہ یہ مرغی آئندہ بھی سونے کا انڈا دینے والی ہے۔ لہٰذا پھر اسے اپنے علاقے سے جانے نہیں دیتے۔ قیدی بنا کر رکھتے ہیں۔''

احمد یار خان نے کہا۔ ''نعمان بھائی ...... یہ بات ہم پر چھوڑ دو۔ اگر ہم یہاں سے نکل گئے اور بخیریت اپنے گھر پہنچ گئے تو آپ کو ضرور اپنے پاس بلائیں گے اور آپ کی دولت مندی والی بات تو ہمیں چھپانی ہی ہوگی ورنہ وہ کہتے ہیں ناں ...... کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا ...... تو آپ یہاں سے نکل کر وہاں پھنس جائیں گے۔''

رات کا کھانا کھانے کے بعد وہ بوڑھا صمد یار خان نائٹ چوکیدار کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہیں آیا۔ صبح پتا چلا کہ وہ چھٹی پر تھا۔ آج رات آئے گا۔ صبح ہوتے ہی وہ اپنے حصے کی

مشقت کرنے لگے۔ دوپہر کو صمد یار خان نے کہا۔ ''میں نے معلوم کیا ہے وہ نائٹ چوکیدار آ گیا ہے۔ آج رات کو ضرور آئے گا۔ میری کوشش ہوگی کہ وہ راضی ہو جائے اور ہمیں یہاں سے نکال کر لے جائے۔''

دور سے پہرے دار نے چیختے ہوئے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''ارے او بڈھے! تُو باتیں زیادہ کرتا ہے۔ کام کم کرتا ہے اور دوسروں کو بھی باتوں میں لگا دیتا ہے۔''

اس نے آتے ہی اسے چابک سے مارنا شروع کر دیا۔ نعمان گڑگڑانے لگا۔ ''خدا کے لیے رحم کرو۔ اس بوڑھے پر ایسا ظلم نہ کرو۔''

وہ آگے بڑھ کر اسے بچانا چاہتا تھا لیکن گن مین نے اسے پکڑ کر پیچھے کی طرف دھکا دیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا ایک پتھر سے ٹکرایا۔ سر پر چوٹ لگی۔ خون بہنے لگا۔ ادھر احمد یار خان باپ کو مار کھاتے دیکھ کر چلاتا ہوا آیا۔ ''بابا ...... بابا!''

ایک گن مین نے رائفل کے دستے سے اس پر ضرب لگائی۔ وہ آتے آتے اوندھے منہ گرا پھر اٹھ کر جانا چاہتا تھا۔ پہرے دار نے دوسری بار رائفل کے دستے کو اس کے سر پر مارا۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ ایک دم سے وہ پیچھے کی طرف الٹ پڑا۔ پیچھے ایک ڈھلان تھی وہ نیچے گرتا چلا گیا۔ ڈھلان میں کئی چھوٹے بڑے پتھر تھے۔ وہ ان سے ٹکراتا رہا اور نیچے جاتا رہا۔ بوڑھا صمد یار خان دونوں ہاتھ پھیلا کر چیخنے لگا۔ ''میرے بچے! ...... میرے بچے! ...... اسے پکڑو ...... اسے روکو ......''

اسے کوئی روکنے والا نہیں تھا۔ وہ ڈھلان سے لڑھکتا ہوا پتھر سے ٹکراتا جب نیچے پہنچا تو اس کا سر پھٹ چکا تھا۔ ہر طرف زخم تھے۔ لہولہان ہو چکا تھا۔ جب دو پہرے دار اس کے قریب آئے تو اس کا دم نکل چکا تھا۔

دور کھڑے ہوئے سپروائزر نے پوچھا۔ ''کیا ہوا ......؟''

ایک پہرے دار نے اوپر کھڑے سپروائزر کو دیکھ کر چیختے ہوئے کہا۔ ''یہ مر گیا ہے۔''

اس نے ہاتھ جھٹک کر کہا۔ ''اس کی لاش نیچے کھائی میں پھینک دو۔''

جوان بیٹے کی موت کی خبر سنتے ہی بوڑھے نے ایک زور کی چیخ ماری اور اپنا سینہ کوٹنے لگا۔ سر کے بالوں کو مٹھیوں میں جکڑ کر ماتم کرنے لگا۔

نعمان بھی لہولہان ہو چکا تھا۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا اپنے زخم سے لہو پونچھ رہا تھا اور بڑے دکھ سے دور نیچے ڈھلان میں پڑی ہوئی اس نوجوان کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ جس کا ماتم

صرف بوڑھا باپ کر رہا تھا اور کوئی اس کے پیچھے رونے والا نہیں تھا۔ حتیٰ کہ کوئی اس کی لاش کو اٹھانے والا بھی نہیں تھا۔

ایک پہرے دار نے حکم دیا...... تو دو قیدیوں نے اس نوجوان کی لاش کو اٹھا کر ایک گہری کھائی میں پھینک دیا۔

نعمان نے اپنا منہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا۔ تھوڑی دیر پہلے وہ اس نوجوان سے باتیں کر رہا تھا۔ اب تک اس جوان اور بوڑھے کا ساتھ دے رہا تھا۔ کیسی مجبوری تھی کہ وہ اسے ڈھلان کی طرف گرنے سے بھی نہ بچا سکا۔ اس کے اندر ایک جذبہ تھا کہ اگر وہ کچھ نہیں کر پایا ہے تو کم از کم ایک قبر کھود کر اسے دفن کر سکے لیکن اس کے کچھ کرنے سے پہلے ہی اسے کھائی میں پھینک دیا گیا تھا۔ یہ منظر دیکھ کر اس کا ماتم کرنے والا باپ صدمے سے بے ہوش ہو گیا تھا۔ سپروائزر نے آ کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ”کیا یہ بڈھا بھی مر گیا؟“

ایک پہرے دار نے کہا۔ ”نہیں...... یہ بے ہوش ہو گیا ہے۔“

سپروائزر نے کہا۔ ”اسے اٹھا کر غار میں پہنچا دو اور آرام کرنے دو۔“ اس کے حکم کی تعمیل کی گئی۔ جب شام کو کام ختم ہو گیا اور نعمان تھک ہار کر غار کے اندر آیا تو بوڑھا صمد یار خان سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ”بابا!...... میں صرف افسوس کا اظہار کر سکتا ہوں۔ آپ کے لیے کچھ نہیں کر سکتا اور کرنے کا وقت تو گزر ہی گیا۔ آپ کی آنکھوں کے سامنے آپ کا جوان سال بیٹا کس طرح سے موت کے منہ میں گیا ہے۔ یہ سوچتا ہوں تو زندگی سے نفرت ہونے لگتی ہے۔“

صمد یار خان نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”تمہارے ماں باپ تو بے چارے بہت مجبور ہوں گے۔ سوچتے ہوں گے کہ ان کا جوان بیٹا کہاں ہے؟ آج میں اپنے جوان بیٹے کو کھو کر تمہارے بارے میں اور بھی شدت سے سوچنے لگا ہوں۔ وہ مر چکا ہے میں اسے بچا نہ سکا لیکن تمہیں تو بچا سکتا ہوں۔ اس کی جگہ تمہیں یہاں سے لے جا سکتا ہوں۔“

نعمان نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ ہاتھ تھپک کر بولا۔ ”ہاں ...... بیٹے! میں یہاں پچھلے کئی گھنٹوں سے تنہا سوچ رہا ہوں کہ آئندہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ میری مشکل تو یہی تھی ناں کہ ایک جوان بیٹی کو بیاہنا ہے۔ اگر پچیس ہزار یہاں خرچ کروں گا تو اس کی شادی نہیں کر سکوں گا۔ اگر تم میرے ساتھ تعاون کرو گے تو سارے مسئلے حل ہو جائیں گے۔“

”میں آپ سے ہر طرح کا تعاون کروں گا۔ آپ کیا چاہتے ہیں؟“

اس بوڑھے نے سوچتے ہوئے نعمان کو دیکھا پھر بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔ ”اگر میں تمہیں یہاں سے لے جاؤں۔ اپنے علاقے میں تمہیں اپنے ساتھ رکھوں۔ تو کیا تم میری بیٹی سے شادی کرو گے؟“

یہ ایسا سوال تھا کہ وہ ایک دم سے چونک گیا۔ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ بوڑھا اسے کبھی یوں بھی داماد بنانا چاہے گا۔

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”بابا!...... میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ میری شادی ہو چکی ہے۔“

”ہاں ...... مجھے یاد ہے۔ تم نے بتایا تھا۔ اس کے باوجود میں تم سے ایسی بات کر رہا ہوں۔ کیا تم دوسری شادی نہیں کر سکتے؟ کیا یہاں سے نکلنا نہیں چاہتے؟ ہم ایک دوسرے کے تعاون سے ایک دوسرے کی مشکل آسان کر سکتے ہیں۔ تم میرے داماد بن جاؤ گے۔ تو میری بیٹی کی شادی کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ کسی کو پچیس ہزار روپے نہیں دینے پڑیں گے۔ یہ رقم نائٹ چوکیدار کو ادا کر دی جائے گی۔“

وہ تو صبح کو ہی یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ آج رات نائٹ چوکیدار کو راضی کر کے اپنے بیٹے کے ساتھ یہاں سے چلا جائے گا لیکن آدمی سوچتا کچھ ہے، ہوتا کچھ ہے۔ وہ گھر جانے کے لیے تنہا رہ گیا تھا۔ اتنا بد نصیب تھا کہ جوان بیٹے کی لاش بھی جوان بہن اور بوڑھی ماں کے پاس لے جا نہیں سکتا تھا۔

یہ مقدر میں لکھا تھا کہ جوان بیٹا واپس نہ جائے۔ اس کی جگہ دوسرا جائے اور وہ دوسرا نعمان تھا۔ وہی ان پچیس ہزار میں اس بوڑھے کے ساتھ جا سکتا تھا۔ تا حیات قیدی بنا کر رکھنے والے ظالموں سے نجات حاصل کرنے کا راستہ کھل رہا تھا۔

☆======☆======☆

بی پاشا ایسی بیمار پڑیں کہ بستر سے لگ گئیں۔ بیٹے کی جدائی کا صدمہ برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ نہ اس کے مرنے کی خبر مل رہی تھی نہ جینے کی لیکن اندر سے ممتا چیخ چیخ کر کہتی تھی۔ وہ زندہ ہے، وہ آئے گا۔ وہ ضرور واپس آئے گا۔

ڈاکٹرز آ رہے تھے اور علاج کر رہے تھے لیکن ممتا کا جو روگ تھا، اس کا علاج کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں تھا۔ وہ آپ ہی آپ بڑبڑاتی رہتی تھیں۔ کبھی نعمان کے ڈیڈی کو آوازیں دیتیں کہ ذرا دیکھیں کال بیل کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ وہ شاید آ گیا ہے۔

باپ سر جھکا کر کہتا تھا۔ ”نہیں باہر دودھ والا آیا تھا۔ ملازم اس سے دودھ لے رہا

ہے۔"

وہ بڑبڑاتی تھیں۔ "میرا دودھ پینے والا کہاں گیا ہے؟ میں اس سے اپنے دودھ کا حساب مانگوں گی۔ وہ حساب کرنے آئے گا۔ میں معاف کردوں گی۔ اپنا دودھ بخش دوں گی۔"

ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تو بیڈ پر سے چیخ پڑتیں۔ "ارے کوئی جاؤ دوڑو کوئی فون اٹینڈ کرو۔ میرا بیٹا فون کررہا ہے۔ وہ مجھے کسی وقت بھی فون کرسکتا ہے۔"

وہ ایک صبح نعمان کے ڈیڈی سے بولیں۔ "میں نے ابھی اسے خواب میں دیکھا ہے۔ وہ بہت پریشان تھا۔ بہت بیمار لگ رہا تھا۔ دبلا پتلا سا ہوگیا ہے۔ داڑھی بڑھی ہوئی ہے۔ پتا نہیں میرا بیٹا کس حال میں ہے؟ کہاں ہے؟"

وہ تسلی دینے لگے کہ بیگم صبر رکھو۔ وہ ایک دن ضرور آئے گا۔ "آپ اسی طرح جھوٹی تسلیاں دیتے رہتے ہیں۔ یہ نہیں پوچھتے کہ وہ پریشان نظر کیوں آرہا تھا؟ وہ مجھ سے شکایت کررہا تھا"

"کیسی شکایت؟"

"مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ صدف کہاں ہے؟ مجھے اس گھر میں صدف نظر کیوں نہیں آرہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا...... کہ کیا تم اِس گھر میں آئے تھے؟ کیا تم نے صدف کو یہاں نہیں پایا ہے وہ کسی بات کا جواب نہیں دے رہا تھا۔ بس ایک ہی بات کی رٹ لگائے ہوئے تھا کہ صدف کہاں ہے؟"

نعمان کے ڈیڈی نے کہا۔ "اس عورت کا نام نہ لو۔ وہ بہو بن کر آئی اور میرے بیٹے کے اعتماد کو دھوکا دیتی رہی۔ ہم نے اس کی بدچلنی اور ماں بننے کا ذکر اپنے رشتے داروں سے بھی نہیں کیا ہے۔ اس کی عزت رکھ لی ہے۔ ہماری عزت بھی اسی میں ہے کہ ہم صدف کو آوارہ اور بدچلن نہ کہیں۔ جو کچھ ہورہا ہے اسے چپ دیکھتے رہیں اللہ کرے بچے کی پیدائش سے پہلے ہی نعمان آجائے۔"

بی پاشا اپنے میاں کو بہت توجہ سے دیکھ رہی تھیں۔ سوچ رہی تھیں۔ انہوں نے پوچھا۔

"مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟"

"ایک بات کہوں؟"

"ہاں...... ہاں تمہارے دل میں جو بھی ہے اسے کہہ دو۔ میں جانتا ہوں کہ اپنے بیٹے

کے بارے میں ہی بات کروگی۔"

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ "نہیں...... میں صدف کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔"

وہ پیشانی پر بل ڈال کر حیرانی سے بولے۔ "تم اس بہو کے بارے میں سوچ رہی ہو جو ہم سب کو دھوکا دیتی رہی۔"

"آپ ذرا ٹھنڈے دماغ سے سوچیں۔ ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ ہمیں دھوکا دیتی رہی ہے؟"

"کیا ہمارے بیٹے کا سرٹیفکیٹ ہمارے پاس نہیں ہے؟ یہ بات پتھر پر لکیر ہے کہ وہ باپ نہیں بن سکے گا پھر یہ ماں کیسے بن رہی ہے؟"

"آپ ابھی غصے سے یہ باتیں سوچ رہے ہیں۔ اتنے دن گزر گئے ہیں دماغ ٹھنڈا کریں۔ یہ بھی تو سوچیں کہ خدا کی قدرت کے آگے یہ میڈیکل سائنس کیا چیز ہے؟ بانجھ عورتیں اور مرد ماں باپ بن جاتے ہیں اور میڈیکل رپورٹ دھری کی دھری رہ جاتی ہے"

وہ ذرا چونک کر انہیں دیکھنے لگے۔ نہایت سنجیدگی سے غور کرنے لگے پھر بولے۔ "میں مانتا ہوں کہ خدا کے آگے یہ میڈیکل رپورٹ جھوٹی پڑسکتی ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت تو ہونا چاہئے کہ یہ میڈیکل رپورٹ جھوٹی ہے؟ اگر ہمارا بیٹا موجود ہوتا تو ہم پھر اس کا میڈیکل چیک اَپ کرواتے۔ اس کے بعد بات صاف ہوجاتی۔ جو سچ ہے وہ سامنے آجاتا۔"

"پتا نہیں میرا نعمان کب آئے گا؟ لیکن وہ جب تک نہیں آئے گا تو کیا وہ بہو جو ہمارے پوتے کو جنم دینے والی ہے وہ گھر سے باہر ہی بھٹکتی رہے گی؟ اپنے رشتے داروں میں جائے گی تو کیا بدنامی نہیں ہوگی؟ بعد میں اگر یہ ثابت ہوجائے کہ وہ بچہ ہمارے بیٹے کا ہی ہے تو کیا ہمیں شرمندگی نہیں ہوگی؟

نعمان کے ڈیڈی نے الجھتے ہوئے کہا۔ "بی پاشا!...... تم تو مجھے الجھا رہی ہو۔ میں نے اس پہلو سے نہیں سوچا تھا لیکن تمہاری بات کچھ دل کو لگ رہی ہے۔ اگر میڈیکل رپورٹ غلط ہوئی اور یہ ثابت ہوگیا کہ ہمارا بیٹا باپ بن سکتا ہے تو ہمیں صدف کے میکے والوں کے سامنے بڑی شرمندگی ہوگی پھر یہ بات ہمارے خاندان والوں تک پہنچے گی کہ ہم نے بہو پر شبہ کیا۔ اسے بدچلن سمجھ کر گھر سے نکال دیا۔ ابھی تو یہ بات چھپی ہوئی ہے۔ کسی کو خبر نہیں ہے۔ سب یہی سمجھ رہے ہیں کہ صدف ایک خودسر بہو ہے۔ اپنے میاں کے لاپتا ہوتے ہی اپنے طور پر زندگی گزار رہی ہے۔"

بی پاشا نے پوچھا۔ ''آپ سوچ سمجھ کر جواب دیں۔ کیا صدف سے کوئی سمجھوتا ہوسکتا ہے؟''

''کیسا سمجھوتا؟''

''صدف سے یہ کہا جائے کہ اسے یہاں آکر رہنا چاہیے اور یہیں بچے کو جنم دینا چاہیے۔ اگر نعمان کے آنے پر یہ ثابت ہوجائے کہ یہ ہمارے بیٹے کی ہی اولاد ہے تو ہم اسے گلے لگالیں گے۔ اگر میڈیکل رپورٹ دوسری بار بھی درست نہ ہوئی تو پھر ہم اسے گھر میں رہنے نہیں دیں گے۔ اس کے بچے کے ساتھ اسے باہر کردیں گے۔ جیسا کہ ابھی کر رکھا ہے۔''

وہ تائید میں سر ہلا کر بولے۔ ''ہاں...... ہم نے غصے میں یہ نہیں سوچا کہ ہم اس پر کیچڑ اچھال رہے ہیں تو یہ بات پورے خاندان میں بھی پہنچے گی۔ سب ہی طرح طرح کی باتیں کریں گے بعد میں یہ ثابت بھی ہوجائے کہ صدف نے ہمارے پوتے یا پوتی کو جنم دیا ہے تو ہم پر نکتہ چینی کرنے والے رشتے دار طرح طرح کی باتیں بنائیں گے کہ وہ بچہ نعمان کا نہیں تھا مگر الٹی سیدھی رپورٹ کے ذریعے اسے اپنا بنالیا گیا ہے۔''

بی پاشا نے ناگواری سے منہ بنا کر کہا۔ ''آپ کے خاندان والے تو بہانہ ڈھونڈتے ہیں کہ بس کسی کی کوئی کمزوری نظر میں آجائے پھر وہ اسے ایسے اچھالتے ہیں کہ اللہ کی پناہ......''

وہ اس پہلو پر غور کرتے رہے کہ صدف سے مصلحتاً سمجھوتا کرنا چاہیے یا نہیں؟ اس میں کیا اچھائی ہے کیا برائی ہے؟ وہ تقریباً دو چار روز تک آپس میں بحث کرتے رہے۔ ہر پہلو پر غور کرتے رہے پھر بی پاشا نے کہا۔ ''آپ ڈاکٹر رملا سے فون پر رابطہ کریں۔ اسے یہاں بلائیں۔ یہ بہانہ کریں کہ میری طبیعت خراب ہے۔ میں بلا رہی ہوں۔''

نعمان کے ڈیڈی نے فون کے ذریعے ڈاکٹر رملا سے پوچھا۔ ''کیا تم ہم سے ملنے آسکتی ہو۔ نعمان کی ممی بہت بیمار ہیں۔ وہ تم سے ایک ملاقات کرنا چاہتی ہیں۔''

''ضرور کروں گی۔ شام کو اسپتال کی ڈیوٹی سے فارغ ہوتے ہی آپ کے گھر آؤں گی۔''

وہ وعدے کے مطابق شام چھ بجے ان کے گھر آئی۔ نعمان کے ڈیڈی اسے بی پاشا کے پاس بیڈروم میں لے گئے۔ رملا نے انہیں سلام کیا۔ وہ بولیں۔ ''بیٹھو...... میں تم سے ضروری باتیں کرنا چاہتی ہو۔''

''میں بھی آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی تھی لیکن آپ صدف سے اس بری طرح ناراض تھیں کہ مجھ سے ملنا گوارا نہیں کرتی تھیں۔''

''اس وقت ہم بہت غصے میں تھے۔ ہمیں تم سے ملنا چاہیے تھا۔ بہرحال دیر آید درست آید...... ابھی تم مجھے یہ بتاؤ کہ صدف کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟''

''میں آپ کو کیا بتاؤں؟ آپ یہی سمجھیں گی کہ وہ میری بچپن کی سہیلی ہے اس لئے میں اس کی تعریف کررہی ہوں۔''

''بیٹی!...... صرف تعریف نہ کرو۔ اس کی اچھائیاں اور برائیاں دونوں بتاؤ؟''

''اس کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ وہ بہت ضدی اور خودسر ہے۔ اپنی کوئی بات خواہ وہ جائز ہو یا ناجائز ہو۔ اسے کسی نہ کسی طرح منوالیتی ہے لیکن جہاں تک اس کے کردار کا تعلق ہے۔ تو وہ بے داغ ہے۔ بہت باحیا ہے۔ بچے کے سلسلے میں آپ لوگوں کا شبہ بے بنیاد ہے۔''

نعمان کے ڈیڈی نے پوچھا۔ ''کیا تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ میڈیکل رپورٹ جھوٹی ہے؟ اور ہمارا بیٹا باپ بن سکتا ہے اور صدف اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے؟''

وہ ذرا سوچ میں پڑ گئی۔ یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ نعمان کی میڈیکل رپورٹ سراسر جھوٹی تھی۔ وہ باپ نہیں بن سکتا ہے۔

اگر وہ ایسا کہتی تو اس سے پوچھا جاتا کہ یہ بات تم کیسے جانتی ہو؟ پھر اسے کہنا پڑتا کہ صدف نے اس سچی رپورٹ کو جھوٹی بنایا تھا۔ ایک جعلی میڈیکل سرٹیفکیٹ رپورٹ پیش کی تھی اور ایسا کرنے میں اس نے خود ڈاکٹر ہوتے ہوئے اس کا ساتھ دیا تھا۔ وہ بھی اس کے ساتھ برابر کی مجرم ہے۔

ڈاکٹر رملا سچ بول کر اپنے کردار پر دھبا لگانا نہیں چاہتی تھی۔ نہ ہی مجرم کہلانا چاہتی تھی۔ اگر یہ بات نعمان کے ڈیڈی اچھالتے اور اس کے خلاف قانونی کارروائی کرتے تو رملا کا میڈیکل کیریئر بالکل تباہ ہوجاتا۔ وہ اپنا کوئی نقصان نہیں چاہتی تھی۔ سوچ میں پڑی ہوئی تھی۔

نعمان کے ڈیڈی نے کہا۔ ''میں نے تم سے کچھ پوچھا ہے؟''

وہ سنبھل کر بولی۔ ''میڈیکل رپورٹ غلط نہیں تھی لیکن غلط ہوسکتی ہے۔ انسان کے جسمانی نظام میں قدرتی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ نعمان کے اندر ایسی ہی تبدیلی ہوئی ہوگی

آپ دونوں تعلیم یافتہ ہیں۔ یہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ قدرتی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ آپ کے بیٹے کے اندر ایسا ہی کچھ ہوا ہوگا۔''

ان دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ڈاکٹر رملا نے کہا۔''جہاں تک صدف کا تعلق ہے تو میں قسم کھا کر کہنے کے لئے تیار ہوں کہ وہ نیک چلن ہے پارسا ہے۔ اس نے نعمان کے سوا کسی مرد کا منہ نہیں دیکھا ہے۔ آپ اپنی بہو پر خواہ مخواہ شبہ نہ کریں۔ ہو سکے تو اسے اپنا لیں۔ نعمان جب آئیں گے تو سچائی آپ کے سامنے آجائے گی۔ اس وقت آپ بہو کو گھر سے نکالنے کے باعث پچھتائیں گے۔ بعد میں نادم ہونے سے بہتر ہے کہ اسے ابھی بلا کر گلے لگا لیں۔''

بی پاشا نے پوچھا۔''اگر میرا بیٹا آجائے اور یہ ثابت ہو جائے کہ وہ باپ نہیں بن سکتا ہے تو پھر کیا ہوگا؟ کیا ہم اسے پھر گھر سے نکال لیں گے؟''

''ہاں......اس وقت آپ جو چاہیں گے صدف کے ساتھ کر سکیں گے لیکن ابھی تو ایسا نہ کریں۔ جب میں قسم کھا رہی ہوں۔ یقین دلا رہی ہوں کہ صدف آپ کی ایک نیک چلن بہو ہے......''

صدف کے معاملے میں بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ بی پاشا اور نعمان کے ڈیڈی پہلے ہی ذہنی طور پر اس بات پر آمادہ تھے کہ بہو سے سمجھوتا کر لیا جائے۔ لہٰذا بی پاشا نے کہا۔''کیا تم صدف کو یہاں ہمارے پاس بھیج سکتی ہو؟ کیا وہ یہاں آنا چاہے گی؟''

وہ خوش ہو کر بولی۔''میں آپ کے اس فیصلے سے بہت خوش ہوں۔ میں پوری کوشش کروں گی کہ اسے یہاں ضرور آنا چاہیے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں ابھی یہاں سے فون پر بات کرتی ہوں۔''

''بے شک......تم ابھی بات کرو۔''

اس نے اپنے موبائل فون کے ذریعے صدف سے رابطہ کیا۔ پتا چلا کہ وہ گھر میں نہیں ہے اور اس کا موبائل فون بھی بند ہے۔ رملا نے کہا۔''میں پھر ایک آدھ گھنٹے کے بعد اس رابطہ کروں گی اور اسے یہاں لے کر آؤں گی۔ مجھے اب اجازت دیں۔''

وہ بی پاشا سے رخصت ہو کر بیڈ روم سے باہر آئی۔ نعمان کے ڈیڈی اس کے ساتھ کوٹھی سے باہر آتے ہوئے بولے۔''میں اپنی وائف کی بیماری سے بہت پریشان ہوں۔ بیٹے کا صدمہ انہیں اندر ہی اندر آہستہ آہستہ مارے ڈال رہا ہے۔''

''یہ تو واقعی پریشانی کی بات ہے۔ نعمان کا بھی کچھ پتا نہیں چل رہا ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کب تک اپنی وائف کو جھوٹی تسلیاں دیتا رہوں گا اور وہ کب تک بہلتی رہیں گی؟ لیکن یہ اچھی طرح سمجھ رہا ہوں کہ اوپر سے بہل رہی ہیں، اندر ہی اندر مرتی جا رہی ہیں۔''

''آپ ایسا نہ کہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں سلامت رکھے اور مسٹر نعمان کو جلدی یہاں لے آئے۔''

''اور وہ جب تک یہاں نہیں آئے گا تب تک کیا ہوگا؟ کیا یہ بوڑھی ماں اس کے آنے تک زندہ رہے گی؟''

ڈاکٹر رملا نے صدمے سے سر کو جھکا لیا پھر بولی۔''آپ چاہیں تو ان کا نفسیاتی ٹریٹ منٹ کر سکتے ہیں۔''

''کیسا ٹریٹمنٹ؟''

''ایک بیمار کو زندہ رکھنے کے لئے اس کا دکھ درد کم کرنے کے لئے ڈاکٹر جھوٹ بولتے ہیں۔ آپ بھی جھوٹ بول سکتے ہیں۔''

''مجھے کیا جھوٹ بولنا ہوگا؟''

''آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کو کسی نے اطلاع دی ہے کہ نعمان صاحب زندہ ہیں لیکن اغوا کرنے والے انہیں دوسرے ملک میں لے گئے ہیں۔ وہاں سے واپس آنے میں مشکل ہو رہی ہے لیکن وہ جلد آجائیں گے۔''

نعمان کے ڈیڈی نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔''یہ تدبیر اچھی ہے یہ جھوٹ بولنے سے بی پاشا کو اتنی تسلی تو ہو جائے گی کہ بیٹا جہاں بھی ہے زندہ سلامت ہے اور کبھی نہ کبھی یہاں آئے گا۔ تم نے اچھا مشورہ دیا ہے میں اس پر عمل کروں گا۔''

ڈاکٹر رملا یہ کہہ کر رخصت ہو گئی کہ وہ جلد ہی صدف کو یہاں اپنے ساتھ لائے گی۔ اس کے جانے کے بعد نعمان کے ڈیڈی سنجیدگی سے سوچنے لگ گئے۔ ڈرائنگ روم میں ٹہلنے لگے۔ بڑی دیر تک سوچتے رہنے کے بعد یہ بات ذہن میں آئی کہ وہ خود ہی آواز بدل کر بی پاشا سے فون پر باتیں کر سکتے ہیں۔ اپنی شریک حیات کو صدمات سے دور رکھنے اور زندہ رکھنے کے لئے لازمی تھا کہ وہ ایسا کوئی جھوٹ ضرور بولیں۔

وہ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کوٹھی کی چھت پر آئے پھر اپنا موبائل فون نکال کر اپنے گھر کا

فون نمبر پنچ کرنے لگے۔ گھر کے فون میں سی ایل آئی لگا ہوا نہیں تھا۔ اس طرح بی پاشا یہ معلوم نہیں کر سکتی تھیں کہ انہیں کس نمبر سے فون کیا جا رہا ہے۔

رابطہ ہونے پر انہوں نے فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے بی پاشا کی آواز سنائی دی۔ ''ہیلو...... کون......؟''

وہ بہت ہی دبی دبی آواز میں ایسے بولے جیسے کہیں دور سے بول رہے ہوں۔ ''ہیلو کون ہے؟...... میں نعمان کے باپ سے بات کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ تو ابھی باہر گئے ہیں۔ آپ کون ہیں......؟''

''میں نعمان کا پیغام دینا چاہتا ہوں۔''

وہ ایک دم تڑپ کر بولیں۔ ''کیا میرے بیٹے کی کوئی اطلاع ہے؟ کیا تم میرے بیٹے کو جانتے ہو؟''

''جی ہاں...... میری ان سے ایک مختصر سی ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بہت مجبور ہیں وہ ایک دوسرے ملک میں ہیں۔ وہاں سے آنے میں دشواری ہو رہی ہے لیکن وہ کوشش کر رہے ہیں۔ جلد ہی اپنے گھر چلے جائیں...... ہیلو......''

دوسری طرف سے بی پاشا نے بے چین ہو کر کہا۔ ''ہیلو، ہاں...... میں سن رہی ہوں۔ بولو میرا بیٹا کہاں ہیں؟ کس ملک میں ہے؟ اسے کیا دشواری ہے؟''

نعمان کے ڈیڈی نے کہا۔ ''ہیلو...... کیا ہوا سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ میرے فون کا سگنل کچھ خراب ہے۔ ہیلو...... ہیلو......''

دوسری طرف سے بی پاشا تڑپ تڑپ کر کہہ رہی تھیں۔ ''ہیلو...... مجھے آواز آ رہی ہے کیا آپ میری آواز نہیں سن رہے ہیں؟ ہیلو......''

دوسری طرف سے بھی ہیلو ہیلو کہتے کہتے نعمان کے ڈیڈی نے فون بند کر دیا اور اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ وہ بیوی کو ایک نئی زندگی کی پہلی خوراک دے چکے تھے۔ جب وہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آئے تو بی پاشا کے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ ملازموں کو پکار رہی تھیں کہہ رہی تھیں کہ نعمان کے ڈیڈی کو فوراً بلایا جائے۔ بہت ضروری فون آیا تھا۔

انہوں نے بیڈ روم میں آ کر پوچھا۔ ''تم اس طرح کیوں چیخ رہی ہو؟ بات کیا ہے؟''

وہ خوشی سے کانپتے ہوئے لہجے میں بولیں۔ ''ابھی...... ابھی کسی نے فون کیا تھا کہ میرا بیٹا زندہ ہے میرا بیٹا زندہ سلامت ہے۔ وہ کہیں ہے کسی دوسرے ملک میں پھنسا ہوا ہے۔

یہاں آنے میں پریشانی ہو رہی ہے لیکن اس نے کہا ہے کہ وہ آئے گا۔ یہاں جلد آئے گا۔''

وہ بے یقینی سے بولے۔ ''کیا...... کیا کہہ رہی ہو؟ یہ اچانک کس کا فون آ گیا؟ کس نے ہمارے بیٹے کے بارے میں اطلاع دی ہے؟''

وہ پریشان ہو کر بولیں۔ ''میں کیا جانوں؟ بات کرتے کرتے لائن کٹ گئی؟''

''کیا کہہ رہی ہو...... کیا تم نے اس کا نام بھی نہیں پوچھا؟ فون نمبر بھی معلوم نہیں کیا......؟''

''کیسے بات کرتی؟ وہ اپنے موبائل سے بات کر رہا تھا۔ کہہ رہا تھا کہ سگنل نہیں مل رہے ہیں۔ اسے میری آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ وہ بار بار ہیلو ہیلو کرتا رہا پھر فون بند ہو گیا۔''

وہ بولے۔ ''اوہ گاڈ!...... پتا نہیں کون تھا؟ مگر جو بھی تھا رحمت کا فرشتہ تھا۔ اس نے ایک بہت بڑی خوشخبری سنائی ہے اتنا تو معلوم ہو گیا کہ ہمارا بیٹا جہاں بھی ہے زندہ و سلامت ہے۔''

''یہی سن کر تو میرا خون بڑھ گیا ہے مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میں پھر سے جی اٹھی ہوں۔ اب اس فون کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ وہ پھر کسی وقت ضرور فون کرے گا۔''

''جب اسے سگنل نہیں مل رہا تھا تو نہیں کرے گا۔ بہر حال ہم نے اپنی ایک غلطی کا احساس کیا کہ بہو کو گھر سے نکالنا نہیں چاہیے تھا۔ نعمان کے آنے تک انتظار کرنا چاہیے تھا۔ ہم بہو سے سمجھوتا کرنے جا رہے ہیں تو ہماری اس نیک نیتی کا صلہ ہمیں مل رہا ہے۔ ہمارا بیٹا زندہ ہے، ہمارا بیٹا آئے گا۔ ضرور آئے گا۔''

وہ بے چینی سے فون کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔ ''وہ دوبارہ فون کیوں نہیں کر رہا ہے؟ اسے کہیں سے فون تو کرنا چاہیے تھا۔ اسے ہماری بے چینی اور خوشی کا کچھ تو خیال کرنا چاہیے۔''

''اس نے خیال کیا۔ جب ہی تو فون کیا۔ اب اس کی کوئی مجبوری ہو گی۔ تم اطمینان رکھو۔ جب بھی اسے سہولت ہو گی وہ ضرور فون کرے گا اور ہمیں اس کے متعلق بہت کچھ بتا سکے گا مگر اب تمہیں بہت زیادہ پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ خوش رہنے کی کوشش کرو۔ دوائیں وقت پر کھایا کرو۔ اچھی طرح کھاتی پیتی رہو گی تو بیٹا تمہیں صحت مند دیکھ کر خوش ہو گا۔''

وہ انہیں جھوٹی تسلیاں دیتے رہے۔ حقیقتاً وہ تسلیاں جھوٹی نہیں تھیں۔ ان کا بیٹا ان سے

دور کہیں زندہ تھا۔ وہ خود یہ بات نہیں جانتے تھے۔ انہوں نے سوچا کہ پھر دوسرے دن اسی طرح اجنبی بن کر اپنی وائف کو تسلی دیں گے اور کچھ ایسی باتیں کریں گے جس سے ظاہر ہوگا کہ فون کرنے والا مجبور ہے اور آئندہ ان سے رابطہ نہیں کر سکے گا۔

انہوں نے صدمات کی ماری ہوئی ماں سے جھوٹ کہا، اسے دھوکا دیا۔ یہ ایک مجبوری تھی۔ اس ماں کا علاج یہی تھا۔

☆======☆======☆

رات کے وقت اس غار میں تین نائٹ چوکیدار رہا کرتے تھے۔ وہ ایک ہاتھ میں گن اور دوسرے ہاتھ میں مشعلیں لے کر غار کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک وقفے وقفے سے گھومتے رہتے تھے اور ایک ایک قیدی پر نظر رکھتے تھے۔

بوڑھا صمد یار خان غار کے اس حصے میں تھا جہاں اس نائٹ چوکیدار کی ڈیوٹی تھی جس سے معاملہ طے ہو چکا تھا۔ اس حصے میں دوسرے نائٹ چوکیدار نہیں آتے تھے۔ غار کے آخری سرے پر ان سب کا سپروائزر شراب پینے، کھانا کھانے کے بعد سو جاتا تھا۔

جب وہ سو گیا تو اس نائٹ چوکیدار نے بھاری پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔ وہ پتھر اتنا بھاری تھا کہ اس کی چیخ بھی نہ نکل سکی۔ وہ چند سیکنڈ تڑپنے کے بعد مر گیا۔ چوکیدار نے اس کی جیب سے چابیاں نکال کر ان کی طرف اچھالیں۔ نعمان نے وہ چابیاں لے کر اپنی اور بوڑھے کی بیڑیاں کھولیں پھر اس کے پیچھے چلتے ہوئے پہاڑیوں کے نشیب و فراز سے گزرتے ہوئے ایک طرف جانے لگے۔ رات چاندنی نہیں تھی لیکن اتنے ستارے چمک رہے تھے کہ گہری تاریکی نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو انہیں تاریکی میں رہنے کی عادت ہوگئی تھی۔

وہ کبھی تیزی سے چلتے کبھی دوڑتے ہوئے جا رہے تھے۔ صمد یار خان بڑھاپے کے باعث زیادہ تیز نہیں چل سکتا تھا۔ اس کی خاطر ذرا رک کر سانس لے پھر دوڑنا پڑتا تھا۔ اس نے نائٹ چوکیدار سے پوچھا۔ ”تم نے سپروائزر کو مار ڈالا ہے واپس کیسے جاؤ گے؟“

”مجھے واپس نہیں جانا ہے۔ تم سے پچیس ہزار لے کر میں علاقہ غیر سے نکل جاؤں گا۔ پاکستان کے شہر کراچی چلا جاؤں گا۔“

وہ آہستہ آہستہ باتیں کرتے جا رہے تھے اور آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ رات کی تاریکی میں نائٹ چوکیدار کو وہاں کے پیچیدہ راستے معلوم تھے۔ وہ ان کے ساتھ رائفل لئے چل رہا تھا اور بار بار وارننگ دے رہا تھا۔ ”مجھ سے کوئی چالاکی نہ کرنا۔ مجھے چھوڑ کر بھاگنا چاہو گے یا

مجھ پر حملہ کرو گے تو میں فوراً گولی چلا دوں گا۔“

نعمان نے کہا۔ ”یہ بابا...... بہت بوڑھا ہے تم پر حملہ نہیں کر سکے گا۔ میں جوان ہوں لیکن بیگار کیمپ میں محنت و مشقت کرتے رہنے اور آدھے پیٹ کھانے کے بعد کمزور ہو گیا ہوں۔ پہلے بھی لڑائی جھگڑے والا آدمی نہیں تھا۔ اب بھی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکوں گا۔ میرے لئے یہی بہتر ہے کہ مجھے رہائی مل رہی ہے۔ اب میں آزاد فضاؤں میں سانس لے سکوں گا اور کسی بھی دن اپنے گھر پہنچ سکوں گا۔“

تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد وہ تینوں ایک جگہ رک گئے۔ نائٹ چوکیدار نے اپنے منہ سے ایک مخصوص آواز نکالی۔ اس کے جواب میں دور سے ایک آواز سنائی دی اس نے کہا۔ ”آؤ ہم ادھر چلیں۔“

جب وہ ادھر پہنچے تو ایک شخص تین خچر لئے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”چلو اس پر سوار ہو جاؤ۔ ہمیں تیزی سے آگے بڑھنا ہے۔“

وہ خچروں والا نائٹ چوکیدار کا کوئی رشتے دار تھا۔ ان تینوں کو خچروں پر سوار کرنے کے بعد انہیں ہانکتا اور ان کے ساتھ دوڑتا ہوا جانے لگا۔ تقریباً آدھے گھنٹے تک دوڑتے رہنے کے بعد وہ رک گئے۔ نائٹ چوکیدار خچر سے اُتر گیا۔ اس نے اپنی گن بھائی کو دی اور کہا۔ ”اب تم سوار ہو جاؤ۔ میں دوڑتا ہوا چلوں گا، وہ اس پر سوار ہو گیا پھر وہ نائٹ چوکیدار ان کے ساتھ دوڑتا ہوا جانے لگا۔

نعمان اور اس بوڑھے کو اب تھوڑا آرام مل رہا تھا۔ نعمان ایسی سواری کا عادی نہیں تھا۔ خچر کی پیٹھ پر سوار ہو کر اِدھر اُدھر ڈگمگا رہا تھا اور بڑی مشکلوں سے اپنے آپ کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اتنا تو ہوا تھا کہ وہ اندھیرے میں چلتے رہنے اور ٹھوکریں کھانے سے بچ رہا تھا۔

وہ پہاڑی علاقے کے دشوار گزار علاقوں سے گزر رہے تھے۔ بڑی پریشانی ہو رہی تھی لیکن یہ خوشی تھی کہ رہائی مل چکی ہے۔ صمد یار خان اب راستے پہچان رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے علاقے کے قریب پہنچ رہے ہیں۔

تقریباً چار گھنٹے کے بعد وہ ایک جھاڑیوں کے قریب آ کر رک گئے۔ نائٹ چوکیدار نے کہا۔ ”یہاں سے تمہارا علاقہ شروع ہوتا ہے۔ یہ بتاؤ کہ تمہارا گھر کتنی دور ہے؟“

بوڑھے نے کہا۔ ”یہاں سے صرف دو کلومیٹر کے فاصلے پر۔“

وہ بولا۔ ”میں تمہارے علاقے میں نہیں جاؤں گا۔ یہاں اس جھاڑی کے پیچھے اس

جوان کو رائفل کے نشانے پر رکھوں گا۔ دو گھنٹے میں صبح ہو جائے گی۔ تمہیں صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے یہاں پچیس ہزار روپے لے کر واپس آنا ہوگا۔ اگر نہیں آؤ گے اور دن نکل آئے گا تو میں اس جوان کو گولی مار کر چلا جاؤں گا۔''

بوڑھے نے نعمان کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔''جوان اطمینان رکھو۔ میں جا رہا ہوں۔ دو کلومیٹر کا فاصلہ کچھ نہیں ہوتا۔ میں جلد سے جلد واپس آنے کی کوشش کروں گا۔''

وہ وہاں سے جانے لگا۔ نیم تاریکی میں وہ تھوڑی دور تک دکھائی دیا پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ نعمان کو امید تھی کہ وہ دھوکا نہیں دے گا۔ پچیس ہزار روپے لے کر واپس آئے گا۔ اس نے اس بوڑھے کے ساتھ نیکی کی تھی۔ مصیبت کے وقت اس کے کام آ رہا تھا۔ اس کے حصے کا کام بھی کرتا رہا تھا۔ بوڑھا اس کا احسان مند تھا اور اسے اپنا داماد بنانے کے لئے اسے اپنے ساتھ لایا تھا۔

صمد یار خان تیزی سے چلتا ہوا ایک پہاڑی ٹیلے پر آیا۔ وہاں اس کا اپنا مکان تھا۔ وہ مکان آبادی سے کچھ دور تھا۔ اس وقت کسی کو معلوم نہیں ہوا کہ بوڑھا صمد یار خان واپس آ گیا ہے۔ اس نے دروازے پر دستک دی۔ اندر خاموشی تھی۔ دوسری دستک پر اسے اپنی بوڑھی بیوی کی آواز سنائی دی۔''کون ہے...... اتنی رات کو یہاں کون آیا ہے؟

بوڑھے نے کہا۔''اری نیک بخت!...... دروازہ کھول۔ میں ہوں صمد یار خان۔''

وہ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی۔ بیٹی کو آوازیں دینے لگی۔''نازاں!...... اُٹھ جا۔ دیکھ تیرا باپ آیا ہے۔''

نازاں دوڑتے ہوئے دروازے کے پاس آئی پھر رک کر بولی۔''تم میرے بابا ہو نا......؟''

''ہاں بیٹی!...... میں تمہارا بابا ہوں۔ دروازہ کھولو۔'' اس نے دروازہ کھول دیا۔ باپ کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ بیوی بھی آ کر اس سے لگ کر رونے لگی' پھر اس نے پوچھا۔''میرا بیٹا کہاں ہے؟''

''میں اس وقت زیادہ بات نہیں کر سکوں گا۔ ایک جوان مصیبت میں ہے۔ اگر میں فوراً واپس نہ گیا۔ تو اسے گولی مار دی جائے گی۔ وہ پچیس ہزار فوراً نکالو۔''

''اتنی رات کو پچیس ہزار کیوں مانگ رہے ہو؟''

''مجھ سے کوئی سوال نہ کرو فوراً نکالو۔''

وہ تیزی سے چلتے ہوئے صندوق کے پاس آئی۔ اسے کھول کر رقم نکالتے ہوئے بولی۔

''یہ بتاؤ کہ میرا بیٹا کہاں ہے؟''

''ابھی بتاتا ہوں۔''

نازاں نے کہا۔''معلوم ہوتا ہے کہ بھائی مصیبت میں ہے۔ اسے بچانے کے لئے بابا یہ رقم لے جا رہا ہے۔''

ایک چھوٹے سے کپڑے میں وہ پچیس ہزار روپے لپٹے ہوئے تھے۔ ماں نے وہ رقم لا کر دیتے ہوئے کہا۔''میرے بیٹے کے بارے میں تو کچھ بتاؤ۔''

صمد یار خان نے وہ رقم دونوں ہاتھوں سے تھام لی پھر ان دونوں کو بڑے دکھ سے دیکھتے ہوئے بولا۔''تم بیٹے اور تم بھائی کو بھول جاؤ۔ وہ اللہ کو پیارا ہو چکا ہے۔ میں ابھی آ رہا ہوں۔''

یہ سنتے ہی ماں نے ایک چیخ ماری۔ نازاں اس سے لپٹ کر رونے لگی۔ وہ ان دونوں کو روتا ہوا چھوڑ کر تیزی سے چلتا ہوا واپس اسی جھاڑی کے پاس آیا۔ نائٹ چوکیدار نے اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہوئے کہا۔''تم نے بڑھاپے میں بڑی تیزی دکھائی ہے مجھے یقین نہیں تھا کہ تم جلدی واپس آؤ گے۔''

صمد یار خان نے کپڑا کھول کر اس میں نوٹوں کی گڈیاں نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

''لو...... انہیں گن لو۔''

ایک نے اس پر رائفل تان رکھی تھی۔ دوسرا پنسل ٹارچ کی روشنی میں نوٹوں کو غور سے دیکھنے لگا پھر انہیں گننے لگا وہ پورے پچیس ہزار تھے۔ وہ مطمئن ہو کر رقم تھیلے میں رکھ کر بولا۔

''اب تم اپنے راستے جاؤ۔ ہم اپنے راستے جائیں گے لیکن پہلے ہمیں جانے دو۔''

یہ کہہ کر وہ اپنے بھائی اور تین خچروں کے ساتھ وہاں سے جانے لگا۔ جب وہ دور جا کر نیم تاریکی اوجھل ہو گیا۔ تو بوڑھے نے کہا۔''آؤ جوان...... میں تمہیں اپنے علاقے اور اپنے گھر میں خوش آمدید کہتا ہوں۔''

وہ اس کے ساتھ چلتا ہوا جب اس مکان کے دروازے پر پہنچا تو اندر سے عورتوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ صمد یار خان نے کہا۔''میری بیوی اور بیٹی احمد یار خان کے لیے رو رہی ہیں۔ ان کے آنسو اتنی جلدی نہیں رکیں گے۔ تم ساتھ والے کمرے میں آؤ۔ یہاں آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں کچھ کھانے کے لئے لاتا ہوں۔''

اس نے کہا۔ ''نہیں...... ہم نے رات کو تو کھایا تھا۔ پیٹ بھرا ہوا ہے۔ ابھی تو میں آرام سے سونا چاہتا ہوں۔''

صمد یار خان اسے ایک کمرے میں چھوڑ کر اپنی بیوی اور بیٹی کے پاس چلا گیا۔ ایک چار پائی پر بستر بچھا ہوا تھا۔ وہ تھکے ہوئے انداز میں ہاتھ پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا۔ بڑا ہی آرام دہ بستر تھا۔ وہ تقریباً دو ماہ تک پتھریلی زمین پر سوتا رہا تھا اور پتھر توڑتا رہا تھا۔ اتنے آرام دہ بستر پر لیٹتے ہی گہری نیند میں ڈوب گیا۔

صمد یار خان اپنی بیوی اور بیٹی کے قریب سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ ان کا جوان بیٹا اور بہن کا جوان بھائی مارا گیا تھا۔ وہ تینوں ماتم کر رہے تھے رو رہے تھے اور اس کے بارے میں کچھ نہ کچھ بولتے جا رہے تھے۔ ایک گھنٹے بعد صمد یار خان نے کہا۔ ''صبح ہونے والی ہے مجھے سردار کے پاس اطلاع دینی ہوگی کہ میں بیگار کیمپ والوں سے نجات پا کر یہاں آ گیا ہوں اور میرے ساتھ ایک اجنبی بھی آیا ہوا ہے۔''

وہ نعمان کے متعلق تفصیل سے بتانے لگا پھر آخر میں بولا۔ ''اس جوان کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ یہ میرے بہت کام آتا رہا ہے۔ ہمارے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ اگر ہم پچیس ہزار دے کر رہائی حاصل کریں گے تو ہماری نازاں کی شادی کیسے ہوگی؟ آخر یہ طے پایا کہ پچیس ہزار رہائی کے لئے دے دیئے جائیں۔''

اس کی بیوی نے کہا کہ تم نے اچھا کیا جو اسے رقم دے دی اور رہائی حاصل کر لی۔ جان سے بڑھ کر روپے نہیں ہوتے۔ رہی بیٹی تو اس کے نصیب میں ہوگا تو سہاگن بن جائے گی۔ نہیں تو گھر میں بیٹھی رہے گی۔

''بیٹی کی فکر نہ کرو۔ یہ جوان بہت ہی شریف ہے۔ ایماندار ہے یہ ہمارا داماد بنے گا۔ ہم اپنی بیٹی کو سہاگن ضرور بنائیں گے۔''

نازاں نے چونک کر باپ کو دیکھا پھر ماں سے نظر ملتے ہی شرما کر سر پر آنچل رکھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ صمد یار خان نے اپنے بیوی سے کہا۔ ''زیتون!...... لڑکا بہت اچھا ہے محنتی ہے۔ ہماری بیٹی خوش رہے گی۔''

''اگر یہ محنتی ہے اور محنت مزدوری کر سکے گا تو پھر سردار کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ یہ یہاں سے بھاگے گا تو نہیں؟''

''نہیں وہ یہاں سے کہیں نہیں جائے گا۔ اگر جائے گا تو ہماری بیٹی کو ساتھ لے جائے

گا۔ ہماری بیٹی اس کے ساتھ جہاں بھی جائے گی بہت خوش رہے گی۔''

زیتون نے اسے حیرانی سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا بیٹی کو پرائے آدمی کے ساتھ کہیں جانے دو گے؟''

''جب ہم بیٹی کو بیاہ دیتے ہیں تو وہ پرائی ہو جاتی ہے۔ پھر یہ اس کی قسمت ہوتی ہے کہ جہاں جائے گی وہاں اپنی قسمت بنائے گی یا بدنصیب ہوگی۔ یہ مسئلہ ماں باپ کا نہیں ہوتا۔''

''یہ کیوں بھول رہے ہو کہ سردار اسے یہاں سے کبھی جانے نہیں دے گا۔''

''یہ بعد کی باتیں ہیں دیکھا جائے گا۔ بہر حال سب سے یہی کہنا ہے کہ یہ جوان ہمارے ساتھ زندگی بھر یہیں رہے گا۔ اب میں سردار سے ملنے جا رہا ہوں''۔

وہ بولی۔ ''تم ابھی تھکے ہارے آ رہے ہو۔ پتا نہیں اس عرصے میں کتنی مشقت کرتے رہے؟ اپنی حالت دیکھو آئینہ دیکھو گے تو خود کو پہچان نہیں پاؤ گے۔ جا کر غسل کرو اور آرام سے لیٹ جاؤ۔ میں اپنے بھائی شبیر خان کو لے کر سردار کے پاس جاتی ہوں اور اسے تمہارے حالات سے آگاہ کرتی ہوں۔ اس نوجوان کے لئے عالی جرگہ بیٹھے گا۔ اس کا نام کیا ہے؟''

''اس کا نام نعمان ہے سردار سے کہنا کہ اس کے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔ اس لئے یہ کہیں نہیں جائے گا۔''

صمد یار نے غسل خانے میں جا کر بدن کو خوب رگڑ رگڑ کر صاف کیا پھر لباس تبدیل کر کے اپنی بیوی زیتون کے بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ زیتون چادر لپیٹ کر باہر جاتے ہوئے بولی۔ ''میں جا رہی ہوں بھائی شبیر خان کو اپنے ساتھ لے جاؤں گی۔ نازاں بیٹی! دروازہ اندر سے بند کر لے۔''

وہ دروازہ کھول کر چلی گئی۔ نازاں نے آ کر دروازے کو اندر سے بند کر دیا پھر باپ کی طرف دیکھا، وہ آنکھیں بند کر کے لیٹا تھا۔ وہ تھوڑی دیر وہاں کھڑی رہی اسے محبت سے دیکھتی رہی۔ بوڑھے باپ نے اس عمر میں بڑی مشقت کی تھی۔ مصیبتیں اٹھائی تھیں۔ اب وہ آرام کر رہا تھا۔ اس کے سوچنے کے دوران میں ہی خراٹے سنائی دینے لگے۔ وہ گہری نیند میں ڈوب چکا تھا۔

وہ دبے قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آئی۔ جب سے سنا تھا کہ آنے والے اجنبی سے اسے منسوب کیا جا رہا ہے۔ تب سے وہ اسے دیکھنے کے لیے بے تاب ہو رہی تھی۔ اب وہ جوان ہوتا یا بوڑھا ہوتا۔ شہ زور ہوتا یا کمزور ہوتا۔ ماں باپ جس سے منسوب کرتے اسی

کے ساتھ زندگی گزارنی تھی پھر بھی دل میں ایک بے چینی تھی کہ اس کا ہونے والا شوہر کیسا ہے؟

وہ پھر دروازے کے پاس آئی وہاں سے جھانک کر باپ کو دیکھا۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ وہ اپنے کمرے کا دوسرا دروازہ کھول کر اس تیسرے کمرے میں آئی جہاں نعمان بے خبر سویا ہوا تھا۔ دروازہ کھلتے ہی اس کا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ بے خبر تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ پہاڑوں کی گود میں پلنے والی ایک حسین دوشیزہ اسے دیکھ رہی ہے۔

جب وہ جوان ہوئی تھی تو بستی کے ایک جوان نے اس کے باپ سے کہا تھا کہ اگر مجھے پچاس ہزار دو گے تو میں تمہاری بیٹی سے شادی کرلوں گا۔

وہاں کا رواج یہی تھا کہ بیٹی کی شادی کرنے کے لئے داماد کو نقد رقم دینی پڑتی تھی۔ جہیز دینا لازمی نہیں ہوتا تھا۔ ہمارے معاشرے میں محض جہیز کی لعنت ہے وہاں نقد رقم دینے کا رواج تھا۔

--

قبیلے کا سردار دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کا مالک تھا۔ وہاں پوست کی کاشت ہوتی تھی۔ پوست سے ہیروئن اور افیون بنائی جاتی تھی اور کروڑوں روپے کا زرمبادلہ سردار کے ہاتھوں میں آتا تھا۔ وہاں کے لوگ ان کھیتوں میں اس فیکٹری میں مزدوری کرتے تھے۔ جہاں پوست کو مختلف مراحل سے گزار کر افیون اور ہیروئن بنائی جاتی تھی۔

نازاں جیسے جیسے جوان ہوتی جارہی تھی اس کا حسن اور دلکشی بڑھتی جارہی تھی اور بولی لگانے والے کم سے کم رقم کی طرف آرہے تھے۔ دوسرے شخص نے کہا۔ ''صمد یار خان!...... میں چالیس ہزار میں معاملہ طے کرسکتا ہوں۔ اپنی بیٹی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دے۔''

وہاں زر، زن، زمین کے لئے خون خرابا نہیں ہوتا تھا۔ سب سردار سے ڈرتے تھے اور اس کے جرگے کے مطابق امن وامان سے زندگی گزارتے تھے۔ اگر نازاں کے طلب گاروں کو ذرا چھوٹ مل جاتی تو وہ اس کے لئے خون خرابا کرسکتے تھے۔ ایک دوسرے کو قتل کرکے نازاں تک پہنچنے کی کوشش کرسکتے تھے لیکن ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

اس کا ریٹ گرتا جارہا تھا۔ صمد یار خان کے لئے اتنی ہی سہولت پیدا ہورہی تھی۔ اسے اب زیادہ رقم جمع کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ بیٹی اس کے لئے مسئلہ نہیں بن رہی تھی۔ آخر اس نے طے کرلیا تھا کہ پچیس ہزار روپے تک جمع کرلے گا اور ان پیسوں میں جو جوان راضی ہوگا اسی کے ہاتھ میں اپنی بیٹی کا ہاتھ دے دے گا۔

اس نے اور اس کے جوان بیٹے احمد یار خان نے دن رات کھیتوں میں مزدوری کی تھی اور تھوڑی تھوڑی کرکے رقم جمع کرتے رہے تھے۔ نازاں دروازے سے لگی کھڑی تھی اور نعمان کو ایک ٹک دیکھے جارہی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ وہ پچیس ہزار تو بابا نے اپنی اور اس جوان کی رہائی کے لیے دے دیئے۔ اب یہ جوان اپنی رہائی کے عوض اس سے شادی کرے گا۔ یہاں میرے ساتھ زندگی گزارے گا۔ دیکھنے میں تو اچھا لگ رہا ہے۔ پتا نہیں مزاج کیسا ہوگا۔ اب جیسا بھی ہو عورت کو درندہ نما مردوں کے ساتھ بھی گزارہ کرنا پڑتا ہے۔

دروازے پر دستک کی آواز سن کر وہ چونک گئی۔ اس نے جلدی سے نعمان کے کمرے کے دروازے کو بند کیا پھر اپنے کمرے سے گزرتی ہوئی باپ کے کمرے میں آکر دروازے کو اندر سے کھولا۔ ماں واپس آگئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا ماموں بھی تھا۔ اس نے کہا۔ ''سردار سے ملاقات ہوگئی؟ اسے سارے حالات بتا دیئے ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ یہ اجنبی ہمارا داماد بن کر اور سردار کا مزدور بن کر رہے گا اور کبھی واپس نہیں جائے گا تو اسے یہاں رہنے کی اجازت دے دی جائے گی لیکن اسے سختی سے سمجھا دیا جائے کہ یہاں سے فرار ہونے والوں کو گولی ماردی جاتی ہے۔ لہٰذا یہاں سے کبھی بھاگنے کی کوشش نہ کرے۔''

اسے گولی مارنے کے تصور سے ہی نازاں کا دل ڈرنے لگا۔ اس نے بے اختیار اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا پھر سوچنے لگی کہ جب شادی ہوگی، آپس میں محبت ہوگی تو میں اسے پیار کی زنجیروں سے باندھ کر رکھوں گی۔ جانے نہیں دوں گی پھر ہمارے بچے بھی ہوں گے۔ تب وہ مجھے اور اپنے بچوں کو چھوڑ کر نہیں جاسکے گا۔

اس کے ماموں نے اس کی ماں سے کہا۔ ''بھائی سو رہا ہے۔ اجنبی بھی سو رہا ہے۔ میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اچھا چلو پھر دیکھ لوں گا اور باتیں بھی کرلوں گا۔ دونوں سے کہہ دینا کہ شام پانچ بجے جرگہ بیٹھنے والا ہے۔ ان دونوں کو وہاں حاضر ہونا ہے۔ میں چار بجے یہاں آجاؤں گا۔ ابھی جارہا ہوں۔''

وہ وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ زیتون اپنے شوہر صمد یار خان کے قریب آکر بیٹھ گئی۔ وہ گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے محبت سے دیکھنے لگی اور اپنے جوان بیٹے کو یاد کرنے لگی۔ بیٹے کی موت کا صدمہ ایسا تھا کہ جو برسوں تک ختم نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر کم ہوجاتا تب بھی وہ ساری زندگی اسے یاد کرتی رہتی اور آہیں بھرتی رہتی۔

ماں کو روتا دیکھ کر نازاں کے بھی آنسو نکل پڑے۔ وہ سر جھکا کر اپنے کمرے میں آ

گئی۔ کبھی کبھی زندگی میں غم اور خوشی ایک ساتھ ملتے ہیں۔ ایک طرف جوان بھائی کی موت کا غم تھا۔ دوسری طرف ایک جیون ساتھی کو پالینے کی خوشی تھی۔

نعمان جہاں سو رہا تھا، وہ اس کے بھائی کا کمرہ تھا۔ اس نے آتے ہی اس کے بھائی کی جگہ لے لی تھی۔ بھائی کی جگہ گھر میں لی تھی مگر دل میں ہونے والے شوہر کی جگہ بنا چکا تھا۔

ماں نے کمرے میں آ کر کہا۔ ''یہ اجنبی بے سروسامان آیا ہے۔ اس کے پاس پہننے کے لیے لباس بھی نہیں ہے۔ اپنے باپ کا کوئی لباس اس کے لیے تیار کرو۔ آج سے اس کی ضرورتوں کا خیال رکھو۔ اب تمہیں زندگی بھر اس کی خدمت کرنی ہے۔''

وہاں ایک چھوٹا سا پاور ہاؤس قائم کیا گیا تھا۔ جس کے ذریعے علاقے کو بجلی سپلائی ہوتی تھی۔ یورپ، امریکا، چین اور جاپان دوسرے کئی ممالک سے قیمتی سامان اسمگل ہو کر وہاں آتا تھا اور وہاں سے پاکستان کی باڑا مارکیٹوں میں پہنچتا تھا۔ وہ لوگ اگرچہ تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن ریڈیو اور ٹی وی کے سیکڑوں چینلز کے ذریعے ساری دنیا کی خبر رکھتے تھے اور جدید ترین آلات کو استعمال کرنا جانتے تھے۔

جب وہاں دنیا جہاں کے نئے آلات پہنچ رہے تھے تو تعلیم بھی پہنچ سکتی تھی لیکن ان علاقوں کے سردار اپنے کھیت کے مزدوروں کو، اپنی رعایا کو پڑھنے لکھنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ تعلیم حاصل کرنے والے شہروں کی طرف بھاگنے لگتے ہیں۔ وہ ساری زندگی کھیت میں مزدور بن کر رہنا نہیں چاہتے۔

اس لیے نہ تو انہیں تعلیم حاصل کرنے کی اجازت تھی اور نہ ہی ایسے اسمگلروں سے ملنے اور بات کرنے کی اجازت تھی جو آئے دن وہاں قیمتی سامان لے کر آیا کرتے تھے۔ مال پہنچا کر اپنے دام وصول کر کے چلے جاتے تھے۔

صمد یار خان نے نعمان کو اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ یہاں رہ کر نہ تو اپنے دولت مند ہونے کا ذکر کرے اور نہ خود کو تعلیم یافتہ ظاہر کرے۔ یہ سردار بہت چالاک ہوتے ہیں، یہ سمجھتے ہیں کہ نیا زمانہ ہے۔ تعلیم حاصل کرنے والے کمپیوٹر کے ذریعے ایک ملک سے دوسرے ملک تک بڑے خفیہ رابطے رکھ سکتے ہیں۔

نعمان نے سوچا تھا کہ اس علاقے میں پہنچنے کے بعد یہاں سے بھی نکلنے اور اپنے گھر تک پہنچنے کا کوئی راستہ ڈھونڈ لے گا اور وہ راستہ یہاں مل سکتا تھا۔ وہ کمپیوٹر کو استعمال کر کے ای میل کے ذریعے اپنے والد اور صدف سے رابطہ کر سکتا تھا لیکن وہاں آنے کے بعد پتا چلا کہ

سردار کمپیوٹر جیسی چیزوں کو ہاتھ لگانے کی بھی اجازت نہیں دیتا۔ ایسی تمام چیزوں کو اپنی رعایا سے دور رکھتا ہے۔

وہ بڑی گہری نیند میں ڈوبا ہوا تھا۔ تقریباً تین ماہ تک بیگار کیمپ والوں نے اس کا خون نچوڑ لیا تھا۔ خوب مشقت کرائی تھی۔ اتنے عرصے کے بعد اسے خوب پھیل کر سونے کا موقع مل رہا تھا۔ اگر کوئی اسے نہ جگاتا تو وہ سارا دن ہی سوتا رہتا۔ شاید اگلی رات بھی سوتا رہتا لیکن ایک بھیانک خواب دیکھنے کے باعث اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اپنے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ سوچنے لگا کہ کہاں ہے؟...... پھر اسے یاد آیا کہ وہ صمد یار خان کے ساتھ اس کے گھر آیا ہوا ہے اور اس نے بیگار کیمپ والوں سے نجات حاصل کر لی ہے۔

یہ یاد آتے ہی اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور دعائیں مانگنے لگا کہ آئندہ بھی اسے مشکلوں سے نجات ملتی رہے اور وہ کسی طرح اپنے گھر پہنچ جائے۔

وہ دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا رہا اور دعائیں مانگتا رہا پھر بستر سے اُتر کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے ہی دیوار پر ایک آئینہ تھا۔ اس میں اپنی شکل دیکھتے ہی چونک گیا۔ ایسا لگا جیسے کوئی اجنبی سامنے آ گیا ہو۔ وہ خود کو پہچان نہ سکا۔ داڑھی بڑھی ہوئی تھی اور بھرا ہوا چہرہ مرجھا سا گیا تھا۔ گال پچک گئے تھے اور رخساروں کی ہڈیاں ابھر آئی تھیں اور آنکھوں کے گرد حلقے بھی پڑ گئے تھے۔ سر کے بال بھی بہت بڑے بڑے ہو رہے تھے۔ وہ بڑی دیر تک حیرانی سے اپنے آپ کو دیکھتا رہا۔ تقدیر نے اس کے حالات بھی بدتر کیے تھے، حالت بھی بدتر کر دی تھی۔ صورت تک بگاڑ دی تھی۔

وہ اس کمرے کو چاروں طرف گھوم کر دیکھنے لگا پھر دروازہ کھول کر باہر آیا۔ دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اور وہ کیسی جگہ ہے؟

آس پاس اور دور تک بلند پہاڑیاں تھیں۔ ہریالی بہت کم تھی۔ پتھر ہی پتھر اور چٹانیں ہی چٹانیں دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ مکان اونچے سے ٹیلے پر سایہ دار درختوں کے درمیان تھا۔ آس پاس ہریالی تھی۔ پھول کھلے ہوئے تھے۔ وہاں کا ماحول اور فضا اچھی لگ رہی تھی۔

ایسے پھولوں بھرے ماحول میں اچانک ہی پھول سا چہرہ دکھائی دیا۔ وہ اسی طرف آ رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اس نے بھی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ دل نے کہا۔ ''شاید یہی صمد یار خان کی بیٹی نازان ہے؟''

دونوں کی نظریں تھوڑی دیر تک ملی رہیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، وہ شرما کر وہاں

سے بھاگ گئی۔ نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ اسی وقت زیتون کی آواز سنائی دی۔ ''اجنبی!...... کیا تمہاری نیند پوری ہوگئی؟ تم کہاں ہو......؟''

وہ بولتی ہوئی دروازے پر آئی۔ نعمان نے اسے دیکھ کر سلام کیا۔ وہ بولی۔ ''وعلیکم السلام۔ اندر آجاؤ اور اپنا حلیہ درست کرلو۔ یہ میرے بیٹے کا کمرہ ہے۔''

وہ بولتے بولتے دکھی ہوگئی پھر اپنے آنسو ضبط کرتے ہوئے بولی۔ ''یہاں تمہیں ضرورت کا سب سامان مل جائے گا۔ غسل خانے میں نہانے دھونے کا سامان ہے۔ چاہو تو داڑھی بنا سکتے ہو۔ میں نے نازلی کے باپ کے ایک لباس پر استری کردی ہے۔ وہ لباس تمہارے کمرے میں ہے۔ تم اسے پہن سکتے ہو۔''

وہ دونوں کمرے میں آگئے۔ زیتون وہاں کی ایک ایک چیز بتا رہی تھی اور کہہ رہی تھی۔ ''یہ میرے بیٹے کا شوق تھا۔ ریڈیو بڑے شوق سے سنتا تھا۔ ٹی وی بھی شوق سے دیکھتا تھا۔ کھیتوں سے مزدوری کرکے آتا تو بڑی دیر تک ٹی وی دیکھتا تھا اور گانے سنتا رہتا تھا۔''

وہ بہت دیر تک محبت سے سرشار لہجے میں اپنے بیٹے کے بارے میں بولتی رہی پھر اس نے چونک کر کہا۔ ''او...... میں نے تمہیں باتوں میں لگالیا۔ جاؤ بیٹے!...... غسل کرو۔''

وہ اس کے کمرے سے چلی گئی۔ وہ دونوں طرف کے دروازے بند کرکے غسل خانے میں آیا۔ وہاں آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا پھر ایک قینچی سے اپنے سر کے بال کاٹنے لگا۔ انہیں چھوٹے کرنے لگا۔ اگرچہ وہ کسی حجام کی طرح ہیئر کٹنگ نہیں کرسکتا تھا پھر اس نے شیو کرکے غسل کیا۔ جب غسل سے فارغ ہوکر لباس بدل کر باہر آیا تو صمد یار خان بیدار ہوچکا تھا۔ وہ بھی منہ ہاتھ دھونے کے بعد اس کا انتظار کررہا تھا۔

دسترخوان پر کئی طرح کے پکوان دکھائی دے رہے تھے۔ وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ بڑے عرصے بعد اسے گھر کا لذیذ کھانا مل رہا تھا۔ اس نے خوب سیر ہوکر کھایا۔ نازاں اپنے کمرے سے چھپ چھپ کر اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کا حلیہ درست ہوگیا تھا۔ اب وہ ایک خوبرو جوان دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اسے دیکھ کر دل ہی میں مسکرا رہی تھی اور خدا کا شکر ادا کررہی تھی۔

شام کو اس کا ماموں آیا پھر وہ تینوں بستی کی طرف چلے گئے۔ سردار کی حویلی کے سامنے ایک سایہ دار درخت کے نیچے جرگہ بیٹھا ہوا تھا۔ بستی کے بہت سے جوان اور بوڑھے موجود تھے۔ سب نے نعمان اور صمد یار خان سے مصافحہ کیا۔ سب نے اس کے جوان بیٹے کی موت کے سلسلے میں تعزیت کی پھر سب نے مل کر ہاتھ اٹھا کر اس کی مغفرت کے لیے دعائیں مانگیں۔

سردار اپنی حویلی سے نکل کر آیا اور ایک اونچی کرسی پر بیٹھ گیا۔ وہ قدآور پہاڑ جیسا شخص تھا۔ بڑے رعب اور دبدبے والا تھا۔ اس کے پیچھے دو گن مین تھے۔ اس نے گھور کر نعمان کو دیکھا۔ صمد یار خان نے کہا۔ ''یہی وہ اجنبی ہے۔ اس کا نام نعمان ہے۔ دنیا میں اس کا کوئی آگے پیچھے نہیں ہے۔ اس نے بیگار کیمپ میں میری مدد کی تھی۔ میری بڑی خدمت کی تھی۔ اس لیے میں اسے یہاں لے آیا ہوں۔ آپ سے التجا کرتا ہوں کہ آپ اسے یہاں رہنے کی اجازت دیں۔ اگر آپ کی اجازت ہوگی تو میں اپنی بیٹی کی شادی اس سے کروں گا پھر یہ یہاں سے کہیں نہیں جائے گا۔''

سردار نے ہاتھ اٹھا کر صمد یار کو آگے بولنے سے روک دیا پھر نعمان سے سوال کرنے لگا۔ اس کے سوالوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اسے تعلیم یافتہ سمجھتا ہے۔ نعمان نے انکار میں سر ہلا کر کہا۔ ''میرے حالات بہت خراب تھے۔ ماں باپ نے مجھے تعلیم نہیں دلائی تھی۔ میں شہر میں بھی محنت مزدوری کرتا رہا تھا۔ میں اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرتا ہوں کہ مجھے بیگار کیمپ والوں سے نجات مل گئی۔ اگر آپ کی اجازت ہوگی، آپ حکم دیں گے تو میں یہاں صمد یار خان کا داماد بن کر ساری زندگی آپ کی خدمت کرتا رہوں گا۔''

نعمان نے اتنے اچھے انداز میں گفتگو کی کہ سردار متاثر ہوگیا۔ اس نے کہا۔ ''ٹھیک ہے...... صمد یار خان!...... میں اس جوان کو تمہارے پاس رہنے کی اجازت دوں گا۔ تمہارا جوان بیٹا مارا گیا ہے اور تمہیں ایک جوان کے سہارے کی ضرورت ہے۔ تم چالیس دنوں تک بیٹے کی موت کا سوگ مناؤ گے۔ جب اس کا چالیسواں ہوجائے تو اس کے ایک ہفتے کے بعد کسی جمعے کو بھی اپنی بیٹی کا نکاح اس جوان سے پڑھا سکتے ہو۔''

سب لوگ اٹھ کر نعمان کو مبارکباد دینے لگے۔ اس سے مصافحہ کرنے لگے۔ اسے دوسری شادی کا شوق نہیں تھا۔ اگرچہ اس نے نازاں کو دیکھ لیا تھا۔ وہ بہت خوبصورت تھی۔ اسے اچھی لگی تھی پھر بھی وہ شادی کرنا نہیں چاہتا تھا لیکن بہت مجبور ہوکر یہ زنجیر پہن رہا تھا۔

☆======☆======☆

ڈاکٹر رملا نے صدف کی کوٹھی میں آکر اس سے ملاقات کی پھر اس سے بولی۔ ''میں نے کئی بار فون کیا لیکن تمہارا موبائل فون بند تھا اور تم گھر میں نہیں تھیں۔''

''ہاں...... میں ابھی آئی ہوں۔ بات کیا ہے؟ آج اچانک کیسے چلی آئی ہو؟ وہ بھی رات کے نو بجے......؟''

''میں تو شام کے چھ بجے سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔ بہت بڑی خوشخبری ہے۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''کیا نعمان کی کوئی خبر ملی ہے؟''

''نہیں...... اس کی تو کوئی خبر نہیں ملی لیکن تمہارے ساس سسر کو اپنی غلطی کا احساس ہو رہا ہے۔ وہ تمہیں گھر سے نکال کر پچھتا رہے ہیں۔''

وہ ناگواری سے منہ بنا کر بولی۔ ''کیا یہ خوشخبری سنانے آئی ہو؟ اگر وہ پچھتا رہے ہیں تو میں کیا کروں؟''

''خدا کا شکر ادا کرو کہ وہ آئندہ تمہیں بدچلنی کا الزام نہیں دیں گے۔ جب تک نعمان نہیں آئیں گے وہ تمہارے بچے کو اپنے ہی بیٹے کی اولاد سمجھتے رہیں گے۔ اللہ کرے کہ نعمان آج اور ابھی آ جائیں تو سارے مسئلے ہی ختم ہو جائیں گے۔''

''تم یہ کہنے آئی ہو کہ مجھے اپنے ساس سسر سے صلح کر لینی چاہیے؟''

''فوراً ہی صلح کر لینی چاہیے بلکہ ابھی میرے ساتھ چلنا چاہیے۔ میں تمہیں لینے آئی ہوں۔''

''ایسی جلدی بھی کیا ہے؟ بیٹھ کر باتیں تو کرو۔ معلوم تو ہو کہ ان کے مزاج اچانک کیوں بدل گئے؟ کیسے بدل گئے؟''

''ان کے مزاج جیسے بھی بدل گئے ہوں، تمہیں خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ وہاں رہو گی تو نیک نام رہو گی۔ کوئی یہ نہیں کہے گا کہ شوہر کے جاتے ہی تمہیں گھر سے نکال دیا گیا۔''

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔ رملا نے کہا۔ ''میں تمہیں ہمیشہ اچھی بات سمجھاتی آئی ہوں۔ اس وقت بھی سمجھا رہی ہوں کہ تمہیں صرف اور صرف ایک ہی بات سوچنی ہے اور وہ یہ کہ اپنے بچے کی نیک نامی کے لیے اپنی نیک نامی کے لیے تمہیں سسرال میں جا کر رہنا چاہیے۔''

وہ بولی۔ ''جہاں تک نیک نامی کا تعلق ہے تو نعمان کبھی نہ کبھی تو واپس آئیں گے۔ مجھے نیک نامی مل ہی جائے گی۔ جو جھوٹ سمجھا جا رہا تھا، اسے سچ مان لیا جائے گا۔''

''تم نعمان کا انتظار کر رہی ہو۔ خدانخواستہ وہ نہ آ سکے تو کیا ہوگا؟''

اس نے چونک کر سر اٹھا کر رملا کو دیکھا پھر کہا۔ ''ایسی بات نہ کرو۔''

''کیوں نہ کروں......؟ کیا تمہارے اندر یہ اندیشہ نہیں ہے کہ وہ واپس نہیں آ سکتا ہے؟ اسے کچھ ہو سکتا ہے؟ ایک دن تو ہم سب کو ہی مرنا ہے۔ اس کی بھی موت آ سکتی ہے اور اگر وہ نہ آیا تو پھر کیا ہوگا؟''

''اگر وہ کبھی نہ آیا تو کیا اس کے دادی اور دادا میرے بچے کو اپنے بیٹے کی اولاد سمجھتے رہیں گے؟''

''انہیں ایک سہارا چاہیے۔ چاہے وہ سہارا ٹوٹا ہوا کیوں نہ ہو۔ وہ بیٹے کی غیر موجودگی میں اپنے پوتے یا پوتی کو دیکھ کر اپنی تسلی کر لیا کریں گے۔ انہیں ان کی صورت میں ایک نئی زندگی ملتی رہے گی۔ ایک نیا حوصلہ ملتا رہے گا۔ وہ ساری زندگی ان جھوٹی امیدوں کے سہارے اپنے بیٹے کا انتظار کرتے رہیں گے اور تم سے ہونے والی اولاد سے بہلتے رہیں گے۔''

رملا ایک صوفے پر بیٹھ گئی لیکن وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ بے چینی سے سوچنے لگی۔ رملا نے پوچھا۔ ''اب کیا بات ہو گئی؟ کیا پریشانی ہے۔ آخر اچھی نصیحتیں اور باتیں تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتیں؟''

''یہ بات نہیں ہے۔ میں سمجھ رہی ہوں کہ تم میری بھلائی کے لیے اچھا مشورہ دے رہی ہو اور واقعی مجھے وہاں جا کر رہنا چاہیے...... لیکن......''

وہ پھر ٹہلنے لگی۔ اس نے پوچھا۔ ''لیکن...... کیا......؟ تم اپنے اندر کی کوئی بات چھپا نہیں سکتیں۔ آج چھپاؤ گی تو کل اُگل دو گی۔ بہتر ہے صاف صاف بتاؤ......''

''وہ دراصل بات یہ ہے کہ میں اپنے سسرال میں رہوں گی۔ وہاں میری زچگی ہو گی۔ ساس میرے پیچھے پڑے گی کہ مجھے بچے کو اپنا دودھ پلانا چاہیے۔''

''بے شک تمہیں پلانا چاہیے۔ کیا تمہارے دماغ سے اب تک یہ خناس نہیں نکلا ہے کہ دودھ پلاؤ گی تو تمہارا فیگر خراب ہو جائے گا؟ لعنت ہے تمہارے فیگر پر، یہ چوتھا مہینہ ہے کیا آئینے میں دیکھتی ہو کہ کس طرح اِدھر اُدھر سے پھیل رہی ہو؟ کہاں گیا وہ تمہارا پہلے والا فیگر؟ کیا تم قدرت سے جنگ کر سکو گی؟''

''میں نے بیوٹی پارلر کی میڈم اور ہیلتھ کلب والوں سے اچھی طرح معلوم کیا ہے۔ میں زچگی کے بعد ہیلتھ کلب جایا کروں گی تو میری پہلے کی طرح فٹنس ہو جائے گی۔ میڈم نے بھی کہا ہے کہ میرے چہرے کی رونق لوٹ آئے گی۔''

''ایک نہیں کئی بچوں کے بعد بھی درجنوں عورتوں کی فٹنس برقرار رہتی ہے اور وہ ہمیشہ خوبصورت دکھائی دیتی ہیں لیکن تم تو ہمیشہ ہی جوان چھوکری نظر آنا چاہتی ہو۔ اپنے چہرے اور بدن کا ایسے خیال رکھتی ہو جیسے مقابلہ حسن میں شریک ہونے والی ہو۔ شادی شدہ عورتوں کو ایسی باتیں زیب نہیں دیتیں۔''

"تم کچھ بھی کہہ لو، میں ایک شرط پر اپنے ساس سسر کے پاس جاؤں گی کہ وہ بچے کو دودھ پلانے کے مسئلے میں مجھ سے بحث نہیں کریں گے اور مجھ سے اصرار نہیں کریں گے۔"

"کیسی باتیں کرتی ہو؟ وہ دادی دادا ہیں۔ ان کا حق بنتا ہے کہ وہ تمہیں اچھی باتیں سمجھائیں اور اپنی آئندہ نسل کو ماں کے دودھ سے پروان چڑھائیں۔ تم مجھ سے زیادہ بحث نہ کرو۔ ابھی میرے ساتھ چلو۔"

"میں چل رہی ہوں لیکن یہ کیا ضروری ہے کہ وہاں جا کر بچے کے مسئلے کو زیرِ بحث لایا جائے اور خاص طور پر دودھ پلانے والی بات کی جائے؟ جب زچگی ہوگی، بچہ ہوگا تب دیکھا جائے گا۔"

"ابھی یہ بحث نہیں چھیڑی جائے گی۔"

ڈاکٹر رملا اسے سمجھا بجھا کر بی پاشا کے پاس لے آئی۔ وہ اپنے بیڈروم میں بیمار پڑی تھیں۔ بہو کو دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ بہو سامنے آ کر سر جھکا کر کھڑی ہو گئی تھی۔ سلام کرنے کے بعد چپ تھی۔ کوئی بات نہیں کر رہی تھی۔ ساس اور سسر بھی شرمندہ سے تھے پھر صدف نے ہی کہا۔ "میرا سر اس لیے نہیں جھکا ہوا ہے کہ میں نے کوئی غلط کام کیا ہے اور اس پر پچھتا رہی ہوں۔ آپ میرے بزرگ ہیں۔ میرے ماں باپ کی جگہ ہیں اس لیے میں نے احتراماً سر جھکایا ہوا ہے۔"

بی پاشا نے کہا۔ "ہم نے تم پر الزام لگایا۔ یہ ہم سے غلطی ہوئی۔ ہمیں کسی ثبوت کے بغیر ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

نعمان کے ڈیڈی نے کہا۔ "اس وقت ہم صرف میڈیکل رپورٹ کو اہمیت دے رہے تھے، یہ بھول گئے تھے کہ قدرتی حالات کے مطابق میڈیکل رپورٹ میں بھی تبدیلی آ سکتی ہے۔ جو رپورٹ آج درست ہے وہ کل غلط بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ ہمارا نعمان واپس آئے گا۔ دوبارہ میڈیکل چیک اَپ ہوگا تو تمام شکوک شبہات دور ہو جائیں گے۔"

بی پاشا نے ذرا خوش ہو کر کہا۔ "ہمارے لیے ایک بہت بڑی خوشخبری ہے کہ ہمارا بیٹا زندہ سلامت ہے۔ وہ کسی دوسرے ملک میں ہے وہاں سے واپس آنے میں دشواری ہو رہی ہے۔"

صدف نے حیرانی اور خوشی سے اپنی ساس کو دیکھا پھر پوچھا۔ "آپ لوگوں کو یہ خوش خبری کس نے سنائی ہے؟"

"کسی نے فون کیا تھا۔ اس کے موبائل فون میں کچھ خرابی تھی۔ اس لیے کوئی بات بھی

تفصیل سے نہیں ہو سکی۔ بس اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ ہمارا بیٹا خیریت سے ہے اور یہاں آنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

یہ اتنی بڑی خوشی تھی کہ صدف کے دل میں رہا سہا میل بھی دھل گیا۔ وہ ساس کے پاس آ کر بیٹھ گئی پھر ان کے گلے لگ کر بولی۔ "آپ نے بہت بڑی خوشی خبری سنائی ہے۔ بس وہ آ جائیں تو ان شاءاللہ میری طرف سے آپ کا دل صاف ہو جائے گا۔"

بی پاشا بھی خوشی سے رونے لگی۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگیں۔ "بیٹی!...... مجھے معاف کر دو۔ میرا دل صاف ہو چکا ہے۔ اب ایسی کوئی بات زبان پر نہ لاؤ۔ تم میرے ہی بیٹے کی اولاد کو جنم دینے والی ہو اور ہم اسے اپنے کلیجے سے لگا کر رکھیں گے۔"

وہ دونوں گلے لگ کر رو رہی تھیں۔ وہ آنسو کسی صدمے سے نہیں خوشی سے بہہ رہے تھے۔ نعمان کے ڈیڈی سر جھکائے سوچ رہے تھے کہ میں نے انہیں ایک جھوٹی تسلی دی ہے۔ انہیں جھوٹی خوشی مل رہی ہے۔ یا میرے مولا! تو اسے سچ کر دے۔ آمین۔

☆======☆======☆

جرگے کے فیصلے کے بعد نعمان دوسرے ہی دن سے کھیتوں میں جانے لگا۔ صدیار خان بھی اس کے ساتھ کام کرتا تھا اور اسے بتاتا تھا کہ کھیتوں میں کس طرح سے کام کرنا چاہیے اور کس طرح سے اپنے مالک کو خوش رکھنا چاہیے۔

اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ زندگی میں ایسے ایسے کام بھی کرنے پڑیں گے۔ صبح سے شام تک مزدوری کرو تو آدمی تھک جاتا ہے لیکن نعمان اب تھکنا بھول چکا تھا۔ اس نے بیگار کیمپ میں اتنی محنت اور مشقت کی تھی کہ اس کے سامنے کھیت میں کام کرنا بہت آسان لگ رہا تھا۔

سب سے مشکل غلامی ہوتی ہے اور آزاد رہ کر زندگی گزارنے والے کو غلام بنا دیا جائے، پابندیوں میں جکڑ دیا جائے پھر وہ ذہنی الجھنوں میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کا سکون غارت ہو جاتا ہے۔ یہی حال نعمان کا تھا۔ وہ اس وسیع و عریض علاقے میں قیدی بن کر رہ گیا تھا۔ وہاں سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ وہاں کی پہاڑی گزرگاہیں اتنی پیچیدہ تھیں کہ ان راستوں سے واقفیت نہ رکھنے والا ساری عمر بھٹکتا رہ جاتا لیکن اس علاقے سے باہر نہیں نکل پاتا۔

ایک آس تھی جو بندھی ہوئی تھی کہ شاید کوئی ذریعہ نکل آئے۔ کوئی تدبیر کام آ جائے۔ کوئی شخص اس کا سہارا بن جائے۔ یا وہ وہاں رہتے رہتے وہاں کے راستوں کو اچھی طرح سمجھنے لگے۔ وہ شادی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ تنہا رہ کر وہاں سے کسی طرح نکل جانا چاہتا تھا لیکن

وہاں تو شرط یہی تھی کہ اسے صد یار خان کی بیٹی سے شادی کرنا ہی ہوگی۔ وہیں ازدواجی زندگی گزارنی ہوگی اور وہیں اپنی اولاد پیدا کرنی ہوگی۔

چالیس دنوں کے بعد سردار کے حکم سے ان کی شادی کر دی گئی۔ نازاں اس کی شریکِ حیات بن کر اس کے پہلو میں آ گئی۔ اس نے زندگی میں دوسری بار ایک دلہن کا منہ دیکھا۔ اور یہ اچھی طرح سے سمجھ گیا کہ اس پر بہت بڑی ذمے داری ڈال دی گئی ہے۔ اب اخلاقی تقاضا یہی تھا کہ وہ ساری زندگی اس کے ساتھ نبھا کرے۔ اسے کبھی دھوکا نہ دے۔ اسے کہیں چھوڑ کر نہ بھاگے۔ اب اس کے پیروں میں پھر سے زنجیر پڑ گئی تھی۔

زنجیر بہت خوبصورت تھی۔ بڑی وفا شعار تھی۔ اسے دل و جان سے چاہتی تھی۔ دن رات اس کی خدمت کرتی تھی اور اسی کے گن گاتی رہتی تھی۔ نعمان نے چند ہی دنوں میں محسوس کیا کہ وہ اس کی طرف مائل ہو رہا ہے اور وہ اس کا دل جیت رہی ہے۔ اس کے اندر صدف کی یادیں کمزور ہوتی جا رہی ہیں۔

اس نے نازاں اور صدف کا تجزیہ کیا کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ اسے یاد آیا کہ صدف اسے چاہتی ضرور تھی۔ محبت کرتی تھی اس کا خیال رکھتی تھی۔ اس کی ہر ضرورت کو پورا کرتی تھی لیکن جب قریب آنے کی بات ہوتی تو بہت محتاط ہو جاتی۔ بڑے سمجھانے اور نخرے اٹھانے کے بعد قریب آتی تھی اور خود کو اس طرح سے پیش کرتی تھی جیسے اپنے شوہر کو اپنی قربت کی بھیک دے رہی ہو۔

اس کے برعکس نازاں کھلے دل کی لڑکی تھی۔ ہمیشہ اس کی قربت چاہتی تھی۔ اس کی محبت اور اس کی ادائیں کہتی تھیں کہ وہ اسی کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ یہ بدن اسی کا ہے۔ اس کا دل و دماغ سارا وجود اور اس کی ساری زندگی صرف نعمان کے لیے ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ صدف کے مقابلے میں اسے زیادہ متاثر کر رہی تھی اور اس کے دل و دماغ کی گہرائیوں تک اُترتی جا رہی تھی۔

جب چار ماہ کے بعد نعمان کو روکا گیا کہ وہ کھیتوں پر نہیں جائے گا۔ آئندہ فیکٹری میں کام کرے گا۔ جہاں افیون اور ہیروئن تیار کی جاتی تھی۔ اس طرح سے اس کی ترقی ہوئی تھی۔ کھیتوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو ہفتے میں سو روپے ملتے تھے اب اسے ایک سو پچیس روپے ملنے لگے۔ نازاں بہت خوش تھی۔ اپنی قسمت پر رشک کر رہی تھی۔

نعمان اپنی خوش قسمتی سے مایوس ہو رہا تھا۔ چار ماہ گزرنے کے بعد بھی اسے بستی سے باہر قدم نکالنے کا ایک ذرا موقع نہیں مل رہا تھا۔ کسی بہانے وہ سیر و تفریح کے لیے یا ضروری

کام سے بھی بستی سے باہر نہیں گیا تھا۔ تقریباً آٹھ ماہ پہلے اسے اغوا کر کے لانے والے نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اسے ایسی جگہ پہنچایا جا رہا ہے جہاں سے واپسی ناممکن ہوگی اور واقعی اسے ایسا ہی لگ رہا تھا۔

اگر نازاں کی محبت اسے نہ بہلاتی تو وہ شاید فکر و پریشانی سے بیمار پڑ جاتا۔ وقت سے پہلے بوڑھا ہو جاتا یا مر جاتا۔ اس نے ایک رات اس سے پوچھا۔ ''تم مجھے کس قدر چاہتی ہو؟''

وہ بولی۔ ''میں نہیں جانتی، کتنا چاہتی ہوں۔ کبھی آزماؤ گے تو مجھے بھی معلوم ہوگا کہ میری چاہت کی انتہا کیا ہے؟''

''اگر میں تم سے کہوں کہ میری خاطر اپنے ماں باپ کو چھوڑ دو تو کیا کرو گی؟''

''دنیا کی ہر لڑکی اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر اپنے ماں باپ کو چھوڑتی ہے یہ تو تمہاری مجبوری تھی کہ تم یہاں آ کر آباد ہو گئے ہو۔ اگر تمہارا کوئی دوسرا گھر ہوتا تو میں کب کا اپنے گھر کو چھوڑ چکی ہوتی اور تمہارے پاس تمہارا رہتی۔''

''نازاں!......اس وقت یہ امید ہوتی کہ مہینے دو مہینے سال بھر کے بعد کبھی اپنے ماں باپ سے جا کر ملو گی لیکن ایسی جدائی ہو کہ پھر کبھی ملنا نہ ہو تب کیا کرو گی؟''

''میں سوچوں گی۔ موت کے بعد بھی تو ایسا ہوتا۔ اگر میرے ماں باپ اللہ کو پیارے ہو گئے تو پھر میں ان سے کیسے ملوں گی؟ ان حالات میں صبر کیا جا سکتا ہے۔ تو پھر شوہر کے ساتھ کہیں بھی دور دراز علاقے میں رہنے کے بعد صبر آ جاتا ہے۔''

''کیا تم میرے ساتھ یہاں سے کہیں دور جانا چاہو گی؟''

''آپ مجھے دنیا کے آخری سرے پر لے جائیں۔ میں کبھی اُف بھی نہیں کروں گی۔ کبھی نہیں پوچھوں گی کہ مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ کیوں لے جا رہے ہو؟''

نعمان نے خوش ہو کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اسے خوب پیار کرتا رہا۔ یہ اطمینان ہو گیا تھا کہ اس نے اپنی ساری زندگی اس کے نام کر دی ہے اور اس قدر وفادار ہے کہ ہر حال میں اس کی ہم راز بن کر رہ سکتی ہے۔ اس محبت کرنے والی بیوی نے اس کے سر سے ایک بہت بڑا بوجھ اُتار دیا تھا۔

☆======☆======☆

ادھر نو ماہ پورے ہو چکے تھے۔ صدف ماں بن چکی تھی۔ اس نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔ زچگی کے بعد وہ کچھ بیمار ہو گئی تھی۔ بیماری کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ ماں بننے کے سلسلے

میں ذہنی طور پر الجھتی رہتی تھی اور غیر شعوری طور پر دل و دماغ پر بوجھ اٹھائے پھرتی تھی۔ ایسی ہی حالت میں عورت اندر سے ٹوٹنے لگتی ہے اور ایسی ٹوٹ پھوٹ کا پتا رفتہ رفتہ چلتا ہے۔

نو ماہ گزر چکے تھے۔ نعمان کے واپس نہ آنے کا بھی صدمہ تھا۔ یہ فکر بھی تھی کہ وہ واپس نہیں آئے گا تو کیا اس کے ساس سسر اس کی پارسائی کا یقین کرتے رہیں گے۔ کب تک یقین کریں گے؟ ان کے دلوں میں پھر میل پیدا ہو سکتا ہے۔ رشتے دار پھر انہیں اس کے خلاف بھڑکا سکتے ہیں۔ اس کے اور نعمان کے بیٹے کو اس دولت و جائیداد سے محروم کر سکتے ہیں۔ اس کی ماں کو گھر سے نکال سکتے ہیں۔ اس نے زچگی کے بعد رملا سے کہا۔ ''یہ میری بیماری کا بہانہ بہت اچھا ہے۔ تم میرے ساس سسر کو یہ سمجھا سکتی ہو کہ ماں بیمار ہو تو بچے کو اس کا دودھ نہیں پلانا چاہیے۔''

رملا نے اسے غصے سے دیکھ کر کہا۔ ''تم نے پھر وہی بکواس شروع کر دی۔ تم ایسی بھی بیمار نہیں ہو کہ تمہارا دودھ بچے کو نہ پلایا جا سکے۔ اسے ضرور پلانا چاہیے۔''

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر عاجزی سے بولی۔ ''میری جان!...... تم میری راز دار سہیلی ہو۔ ہمیشہ میرے کام آتی رہی ہو۔ میری بات مانتی رہی ہو۔ پلیز...... آج یہ بات مان لو۔ بس یہ بہانہ کر دو۔ آئندہ میں اپنے ساس سسر سے نمٹ لیا کروں گی۔''

وہ بولی۔ ''صدف!...... تم نہیں جانتیں۔ تم اپنے آپ سے پھر دشمنی کر رہی ہو۔ تمہارے نہ چاہنے کے باوجود تمہارے سینے میں ممتا بھری ہوئی ہے۔ دودھ کے سوتے پھوٹ رہے ہیں اگر یہ دودھ بچے کو نہ ملا تو یہ اندر ہی اندر سوکھے گا۔ جب قدرتی طور پر اس کی نکاسی نہیں ہو گی تو اندر طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہونے لگیں گی۔''

''تم خواہ مخواہ مجھے ڈرا رہی ہو۔ ایک ذرا سی بات نہیں مان رہی ہو۔ دیکھو میری ساس آنے والی ہے۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ تم اسے وہی کہو گی جو میں چاہتی ہوں۔''

اس نے بے بسی سے صدف کو دیکھا پھر کہا۔ ''ٹھیک ہے...... تم یہ چاہتی ہو تو یہی سہی۔ پہلے بھی اپنے جھوٹ اور فریب کا خمیازہ بھگت چکی ہو۔ میں ابھی سے کہہ دیتی ہوں کہ تم آئندہ بھی پچھتاؤ گی۔''

''ٹھیک ہے...... میں پچھتاؤں گی لیکن تم سے کوئی شکایت نہیں کروں گی۔ پلیز میری بات مان لو۔'' اس نے پھر صدف کو بے بسی سے دیکھا پھر وہاں سے اٹھ کر کمرے سے باہر چلی گئی۔

وقت بہت بڑا معالج ہے، بڑے بڑے دکھ درد کا علاج کر دیتا ہے۔ انسان کو صبر کرنا سکھا دیتا ہے۔ ادھر صدف اور نعمان کے ماں باپ کو صبر آ گیا تھا کہ بیٹا کہیں زندہ ہے۔ کبھی نہ کبھی ضرور لوٹ کر آئے گا۔

ادھر نعمان کو صبر آ رہا تھا کہ تقدیر میں اگر محکومی اور پابندیاں لکھی ہوئی ہیں تو وہ ان پابندیوں میں رہ کر زندگی گزارے گا لیکن وہاں سے نکل کر گھر پہنچنے کا حوصلہ رکھے گا۔ تدبیریں سوچتا رہے گا۔ کوئی نہ کوئی صورت کبھی نہ کبھی نکل ہی آئے گی۔

نازاں سے شادی ہوئے ایک برس گزر گیا۔ نازاں کی ماں کو تشویش ہونے لگی۔ وہ بیٹی سے پوچھنے لگی۔ ''تیرے پاؤں بھاری کیوں نہیں ہو رہے ہیں؟''

''مجھے کیا معلوم؟ جو خدا کو منظور ہو گا وہی ہو گا۔''

ماں نے کہا۔ ''یوں صبر کر کے بیٹھے رہنے سے کام نہیں بنتا۔ عورت کو شادی کے فوراً بعد ماں بننا چاہیے۔ اس طرح وہ اپنے خاوند کو بچوں کی زنجیروں سے اور مضبوطی کے ساتھ باندھ لیتی ہے۔ میں آج بستی جا رہی ہوں۔ وہاں حکیم صاحب سے تیرے بارے میں بات کروں گی۔ کتنی ہی بانجھ عورتیں ان کی دوائیں استعمال کرنے کے بعد مائیں بن چکی ہیں۔ اللہ نے چاہا تو تیری بھی گود بھرے گی۔''

اس رات نازاں نے نعمان کے بازوؤں میں سما کر کہا۔ ''اماں کو تشویش ہے کہ میں ماں کیوں نہیں بن رہی ہوں؟''

اس بات پر وہ ذرا چونک گیا۔ اسے اپنی میڈیکل رپورٹ یاد آئی لیکن اس نے نازاں سے اس کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے پوچھا۔ ''پھر تم نے اپنی ماں سے کیا کہا؟''

''میں کیا کہوں گی۔ میں نے کہا کہ خدا کو جو منظور ہو گا وہ ہی ہو گا لیکن وہ تو بضد ہیں کہ مجھے جلد سے جلد ماں بن جانا چاہیے۔ آج وہ حکیم صاحب کے پاس گئی تھیں۔ وہاں سے دوائیں لے کر آئی ہیں۔ کہہ رہی تھیں کہ مجھے وہ دوائیں استعمال کرتے رہنا چاہیے۔ آپ کیا کہتے ہیں، کیا میں وہ دوائیں کھاؤں؟''

''جب تمہاری اماں کہہ رہی ہیں تو ضرور کھانا چاہیے، ان کی تسلی ہو جائے گی۔ قدرت کو منظور ہو گا تو ماں بنو گی۔ ورنہ ہم اولاد سے محروم رہیں گے۔''

نعمان نے یہ بات بڑے دکھ سے کہی۔ وہ صدف کے ساتھ محرومی کے چار برس گزار کر آیا تھا۔ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ کبھی باپ نہیں بن سکے گا۔ ایک تو پہلے ہی میڈیکل رپورٹ نے

ثابت کر دیا تھا اور اب نازاں کی ویران گود بھی یہی کہہ رہی تھی۔ اس نے سوچا کہ جب نصیب میں محرومی ہی ہے تو نازاں اور اس کے والدین کو یہ بتانا ضروری نہیں کہ وہ باپ نہیں بن سکے گا۔

مزید چھ ماہ کے بعد نازاں نے کہا۔ ''اماں بہت پریشان ہیں۔ ایسی بات کہہ رہی ہیں کہ میں آپ سے کیا کہوں۔''

''ایسی کیا بات ہے؟ مجھے بتاؤ؟''

''وہ کہہ رہی ہیں کہ آپ کو حکیم صاحب کے پاس جانا چاہیے۔ وہ دوائیں دیں گے تو ہماری مرادیں ضرور پوری ہوں گی۔''

''کیا تمہاری یہ خواہش ہے کہ تم ماں بنو......؟''

اس نے سر جھکا لیا پھر اس کے سینے پر سر رکھ کر کہا۔ ''ہر عورت کی یہ خواہش ہوتی ہے لیکن نصیب میں محرومی ہو گی تو میں کوئی شکایت نہیں کروں گی۔''

تو پھر اپنے ماں باپ سے کہہ دینا کہ میں حکیمی دواؤں کا قائل نہیں ہوں۔ زندگی میں مَیں نے کبھی ایسی دوائیں استعمال نہیں کیں اور نہ ہی کروں گا۔ جو مقدر میں ہو گا۔ وہی سامنے آئے گا۔''

اس نے ایک روز صد یار خان سے کہا۔ ''میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا تھا کہ اپنے گھر کبھی نہ کبھی واپس جاؤں گا۔ میں بہت اکتا گیا ہوں۔ بہت پریشان ہو رہا ہوں ایک برس آٹھ ماہ گزر چکے ہیں۔ اب تو مایوس ہو رہا ہوں کہ شاید یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں مل سکے گا۔ میری موت شاید یہیں ہو گی اور میں کبھی اپنے ماں باپ اور اپنی پہلی بیوی کو نہیں دیکھ سکوں گا۔ اپنے لوگوں کا پیار حاصل نہیں کر سکوں گا۔''

وہ بولا۔ ''مایوسی تو ہو گی۔ یہاں بڑی سختیاں ہیں۔ تم دیکھ ہی رہے ہو کہ کوئی علاقے سے باہر جاتا ہے تو اس کی کیسی پٹائی ہوتی ہے اور سزا کے طور پر اس سے کتنی مشقت لی جاتی ہے۔ دو برس پہلے ایک شخص یہاں سے بھاگ کر پاکستان کے کسی شہر جانا چاہتا تھا۔ اسے گولی ماردی گئی۔''

وہ پریشان ہو کر بولا۔ ''تو پھر میں کیا کروں؟ خدا کے لیے کوئی تدبیر کرو۔''

''ابھی اللہ تعالیٰ تمہیں آرام کی زندگی دے رہا ہے۔ تمہیں ایک بیوی کی محبت مل رہی ہے، ایک گھر مل رہا ہے۔ ہم جیسے پیار کرنے والے لوگ بھی مل رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ ہمیں پا کر تم اپنے پہلے پیار کرنے والوں کو بھول جاؤ اور ان کے پاس نہ جاؤ لیکن جانے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ میرے بچے!...... میں اب تمہیں کیسے سمجھاؤں......؟''

''اگر کوئی راستہ سمجھ میں آئے گا تو کیا آپ مجھے اپنی بیٹی کے ساتھ یہاں سے جانے دیں گے؟''

''میں تمہارا دشمن نہیں ہوں۔ میں نے بیٹی کو تمہارے حوالے کیا ہے۔ اب یہ اس کا مقدر ہے کہ جہاں بھی اس کی زندگی گزرے۔ تم اسے جہاں لے جانا چاہو گے میں انکار نہیں کروں گا بلکہ تمہارا ساتھ ہی دوں گا۔ جیسے کہ تم نے بتایا ہے تم دولت مند ہو۔ وہاں جا کر میری بیٹی عیش و آرام کی زندگی گزارے گی۔''

یہ باتیں زیتون کے کانوں تک پہنچیں تو اس نے حیرانی سے پوچھا۔ ''خان!...... کیا تم اپنی بیٹی کو اس جوان کے ساتھ کہیں جانے دو گے؟''

''جب ہم نے اسے بیاہ دیا اور اب یہ اس کا خاوند بن چکا ہے تو پھر اس کی مرضی ہے کہ یہ اسے جہاں چاہے لے جائے۔ ہم تم اعتراض کرنے والے کون ہوتے ہیں؟''

''میں اعتراض نہیں کروں گی لیکن اندیشہ ہے، خوف ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ یہاں سے بھاگنے کی جو بھی کوشش کرتا ہے۔ اسے گولی ماردی جاتی ہے،،

''میں سب جانتا ہوں اور نادان نہیں ہوں۔ میں نعمان اور اپنی بیٹی کو ایسا کوئی خطرہ مول لینے نہیں دوں گا۔ اگر ان کے نصیب میں ہو گا تو یہ جا سکیں گے ورنہ ساری زندگی یہیں گزار دیں گے۔''

☆======☆======☆

دو برس چار ماں گذر گئے۔ ایک صبح نعمان فیکٹری میں کام کرنے گیا۔ تو وہاں سردار معائنہ کے لیے آیا ہوا تھا۔ اس کے آدمی ایک ٹرک ڈرائیور کی پٹائی کر رہے تھے۔ لاتوں، جوتوں اور رائفلوں کے دستوں سے مار رہے تھے اور ساتھ ساتھ گالیاں بھی دے رہے تھے۔ اس ٹرک ڈریئور کا نام دلاور خان تھا۔ وہ علاقہ غیر سے مال لے کر پشاور تک جایا کرتا تھا اور مال مطلوبہ افراد کے حوالے کر کے واپس آ جاتا تھا۔

وہ تیس برس کا ایک جوان تھا اور پچھلے پانچ برسوں سے سردار کا کام کرتا آ رہا تھا۔ اس نے کبھی کوئی بے ایمانی نہیں کی تھی لیکن انسان آگے بڑھنے کے لیے کچھ ترقی کرنے کے لیے کنوئیں سے نکل کر دریا اور دریا سے نکل کر سمندر میں تیرنے کا شوق کرتا ہے۔ اس وسیع و عریض دنیا کو آنکھوں سے دیکھنا چاہتا ہے اور پوری طرح لائف انجوائے کرنا چاہتا ہے۔

دلاور خان کے دل میں بھی ایسی خواہشات اور جذبے تھے۔ وہ پشاور تک جا کر دیکھتا تھا

کہ دنیا کتنی خوبصورت ہے، رنگین ہے اور کیسے ہنستے بولتے خوبصورت لباس پہنے ہوئے انسان زندگی گزارتا ہے اور وہ علاقہ غیر کے ایک حصے میں محدود رہ کر غلامی کی زندگی بسر کر رہا ہے۔

اس نے سوچ لیا کہ رفتہ رفتہ رقم جمع کرے گا پھر اس علاقے سے نکل کر دور کراچی شہر چلا جائے گا۔

وہ ایک ٹرک میں ریڈیو، ٹی وی، کمپیوٹر اور کاسمیٹک کا سامان لاد کر؛ پشاور تک جایا کرتا تھا۔ اسی سامان میں ہیروئن کے پیکٹ بھی چھپے ہوتے تھے۔ انہیں ایک خاص ڈیلر تک پہنچایا جاتا تھا۔ دلاور خان ان پیکٹس میں ہی ہیرا پھیری کرنے لگا تھا۔ ان میں سے ایک پیکٹ کم کرنے لگا تھا۔ اس ایک پیکٹ کے عوض اسے دس ہزار ملا کرتے تھے۔ وہ یہ رقم شہر میں ہی کہیں جمع کیا کرتا تھا۔ جب بھی ٹرک لے کر جاتا تھا، اس کے مزے آجاتے تھے۔ ایک برس کے بعد اس کی چوری پکڑی گئی تھی اور جس کی سزا اسے مل رہی تھی۔ بری طرح پٹائی ہو رہی تھی۔ اتنا مارا جا رہا تھا کہ وہ سر سے پاؤں تک لہولہان ہو گیا پھر سردار کے جوان بیٹے نے کہا۔

''اب بس کریں۔ اسے کافی سزا مل چکی ہے۔ یہ ہمارا اچھا وفادار کام کا بندہ ہے۔ لالچ میں آکر ہم سے بے ایمانی کر رہا تھا۔ اب نہیں کرے گا۔''

سردار نے اس پر تھوک کر کہا۔ ''ڈاکٹر کو بلاؤ...... اور اس کی مرہم پٹی کراؤ۔''

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ نعمان دور سے یہ تماشا دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ تو جانوروں سے بھی زیادہ درندے ہیں۔ ان کے دلوں میں رحم نہیں ہے۔ ایک ذرا سی چوری کے باعث اس کی آدھی جان لے لی ہے۔ پتا نہیں وہ زندہ بچے گا یا نہیں......؟

دوسرے دن صمد یار خان اس کی عیادت کے لیے اس کے گھر گیا۔ وہ بری طرح زخمی تھا۔ پورے بدن پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ تکلیف سے کراہ رہا تھا۔ زیرِ لب سردار کو گالیاں بھی دے رہا تھا۔ صمد یار خان نے اسے سمجھایا۔ ''بیٹے!...... یوں گالیاں نہ دو۔ کسی نے سن لیا تو سردار سے جا کر کہہ دے گا پھر وہ تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ فوراً گولی مار دے گا۔''

''اچھا ہے گولی مار دے اور میں مر جاؤں۔ یہ زندگی تو بے غیرتی کی ہے۔ وہ مجھے میرے ماں باپ کی گالیاں دے رہا تھا۔ اگر ہم اسے گالیاں دیں تو وہ ہمیں گولی مار دیتا ہے۔ ہم تو بالکل غلام بن کر رہ گئے ہیں۔ اپنے پیدا کرنے والوں کو گالی دی جائے تو برداشت کر لیتے ہیں مگر سردار کو جواباً گالی نہیں دے سکتے۔ ایک کتے کی طرح اس کے قدموں میں لوٹتے رہتے ہیں۔''

صمد یار خان نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں...... ہم ایسی ہی زندگی گزار رہے ہیں لیکن کر بھی کیا سکتے ہیں؟ سنا ہے باہر کی دنیا اتنی بڑی ہے کہ وہاں ہمارے جیسے لوگوں کا گزارہ نہیں ہو سکتا۔ وہاں بھی ہمیں کدال اور بیلچے اٹھا کر مزدوری کرنی ہے۔''

''بے شک...... وہاں جا کر بھی مزدوری کرنا ہے لیکن ہم وہاں آزادی سے زندگی گزار سکتے ہیں۔ وہاں کوئی ہمیں گالی نہیں دے سکتا۔ وہاں اگر کوئی گالی دیتا ہے تو ہم بھی اسے گالی دے سکتے ہیں۔ کسی نے ہم پر ہاتھ اٹھایا تو ہم بھی اس پر ہاتھ اٹھا سکتے ہیں۔ وہاں ایک آزاد انسان کی طرح زندگی گزار سکتے ہیں۔''

صمد یار خان اس کی باتیں سن رہا تھا اور اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ ''تم باغی ہو گئے ہو۔ ایسی باتیں دماغ سے نکال دو۔ نہیں نکالو گے تو ایک دن جوش وجذبے میں آکر یہاں سے فرار ہونا چاہو گے اور پکڑے جاؤ گے۔ مارے جاؤ گے۔''

''میں نادان نہیں ہوں۔ میں سوچ رہا ہوں کہ آئندہ مجھے کیا کرنا ہے؟ میں اب ایسی ذلت کی زندگی اور نہیں گزاروں گا۔''

وہ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''بیٹے!...... تم مجھے چاچا کہتے ہو۔ بچپن میں جب تمہارے ماں باپ مر گئے تھے تو میں نے اور زیتون نے تمہاری پرورش کی تھی۔ میں تمہیں سمجھاتا ہوں کہ ایسی باتیں دماغ سے نکال دو اور اگر واقعی ایسا کچھ کرنا چاہتے ہو۔ تو مجھ سے مشورہ ضرور لینا مجھے ضرور بتانا۔ ورنہ تنہا کوئی کام کرو گے تو کہیں نہ کہیں غلطی کرو گے۔ ہم بزرگوں کا مشورہ بھی ضروری ہوتا ہے۔''

''ہاں چاچا!...... میں آپ سے ضرور مشورہ کروں گا۔ بس میں اپنے زخموں کے بھرنے کا انتظار کر رہا ہوں۔''

اس شام نعمان فیکٹری سے گھر آیا تو صمد یار خان نے اسے دلاور خان کے بارے میں بتایا پھر رازداری سے کہا۔ ''اس کے تیور بگڑے ہوئے ہیں۔ وہ باغی ہو چکا ہے اور اس نے شہر میں خوب کمائی کی ہے پچھلے ایک برس سے ہیروئن فروخت کرتا رہا ہے۔ لاکھوں روپے جمع کیے ہوں گے پتا نہیں کہاں چھپا کر رکھے ہوں گے؟ یہ جوان ضرور یہاں سے بھاگنا چاہے گا۔ تم اور نازاں ایک بیگ میں ضروری سامان ہمیشہ تیار رکھو۔ کسی وقت کسی لمحے بھی یہ خبر مل سکتی ہے کہ تم دونوں کو یہاں سے نکلنا ہے اور ایک بہت بڑا خطرہ مول لینا ہے پھر اللہ مالک ہے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔''

دو برس چار ماہ کے بعد امید کی ایک نئی کرن پیدا ہوئی۔ دل کہنے لگا کہ اللہ مہربان ہے، وہ ہر بندے کو آزادی اور خوشحالی کا کوئی نہ کوئی موقع دیتا ہے۔ وہ معبود وہ رحیم وہ کریم مجھ پر مہربان ہے۔ مجھے ایسا موقع ملے گا تو میں جان پر کھیل کر یہاں سے نکل جاؤں گا پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ میری زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں میں ہے۔ جب وہ میری زندگی چاہے گا تو سردار کی کیا مجال ہے کہ وہ مجھ سے میری زندگی چھین سکے۔

اس دن سے وہ خوش رہنے لگا اور وہاں سے فرار ہونے کے سلسلے میں اپنے طور پر تدابیر سوچنے لگا۔ نازاں بھی خوش تھی۔ اس کے ساتھ جانے کے لیے بالکل تیار تھی لیکن اندر سے خوفزدہ تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''مجھے اپنی جان کا خوف نہیں ہے۔ مرنا تو ہے ہی مگر میں نہیں چاہتی کہ تمہاری جان کو کچھ ہو جائے۔ میں ہر نماز کے بعد دعا مانگتی ہوں کہ تم خیریت کے ساتھ اپنے ماں باپ کے قدموں تک پہنچ جاؤ۔''

دن گزرنے لگے۔ دلاور خان کے زخم بھرنے لگے۔ اب وہ چلنے پھرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ سردار نے اسے بلایا۔ تو اس نے اس کے قدموں میں بیٹھ کر پھر اپنی غلطیوں کی معافی مانگی اور کہا۔ ''اس بار معاف کر دو۔ میں پھر کبھی تمہارے اعتماد کو دھوکا نہیں دوں گا۔ اگر دوں تو مجھے گولی مار دینا۔''

سردار نے کہا۔ ''تمہارے باپ دادا ہمارے باپ دادا کے وفادار تھے اور ہم جانتے ہیں، ہیروئن ایسی چیز ہے کہ انسان لالچی ہو جاتا ہے۔ اس کے ذریعے لاکھوں کروڑوں کمانا چاہتا ہے۔ یہ تمہاری پہلی غلطی تھی اس لیے میں تمہیں معاف کر رہا ہوں۔ تم کل رات یہاں سے ٹرک میں مال لے کر جاؤ اور وہاں پہنچ کر تم نے جتنی رقم ہیروئن فروخت کر کے جمع کی ہے۔ وہ سب وہاں میرے ایجنٹ کے حوالے کر دو۔ ایسا کرو گے تو پھر میں تم پر بھروسا کروں گا۔ ورنہ تم پشاور میں رہ سکو گے نہ یہاں واپس آ سکو گے۔ تمہیں گولی مار دی جائے گی۔''

صمد یار خان اس دوران میں دلاور خان سے یہ طے کر چکا تھا کہ وہ جب بھی یہاں سے جائے گا تو اس کی بیٹی داماد کو بھی ساتھ لے جائے گا۔ جب اسے واپس نہیں آنا ہے تو وہ انہیں بھی ساتھ لے کر جانے کا خطرہ مول لے سکتا ہے۔

دلاور خان نے کہا تھا کہ وہ ضرور ان دونوں کو ساتھ لے جائے گا۔ مال لے جانے والا ٹرک سردار کی حویلی کے سامنے تیار ہوتا تھا۔ وہیں سب مال لادا جاتا تھا اور وہ مال اس قدر بھرا جاتا تھا کہ ٹرک کے پچھلے حصے میں پاؤں رکھنے کی بھی جگہ نہیں ہوتی تھی۔ کوئی اس سامان کے

اندر چھپ کر نہیں جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود سردار کے علاقے کی سرحد جہاں ختم ہوتی تھی، وہاں اس نے چوکی بنائی ہوئی تھی۔ وہاں تین مسلح گارڈز ہوتے تھے۔ جو آنے جانے والوں کو چیک کرتے تھے اور اس مال لے جانے والے ٹرک کو بھی چیک کرتے تھے پھر مطمئن ہونے کے بعد آگے جانے کی اجازت دیتے تھے۔

اس رات زیتون نے اپنی بیٹی کو گلے لگایا پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ شادی کے اتنے برس بعد بیٹی کو رخصت کرنے کا وقت آ گیا تھا۔ اب وہ اس گھر سے نکل کر جانے والے تھے۔ نازاں روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ ''اماں!...... ہمارے جانے کے بعد کیا ہوگا؟ وہ ظالم سردار اور اس کی بندوقوں والے آدمی آپ لوگوں کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔''

''بیٹی!...... ہماری فکر نہ کرو۔ ہم نے جتنی زندگی گزارنی تھی ہم گزار چکے۔ اب تو تم دونوں کو ایک نئی زندگی گزارنی ہے۔ ایک نئی دنیا آباد کرنی ہے۔ ہماری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔''

وہ باپ کے سینے پر سر رکھ کر بولی۔ ''بابا!...... ہم نے یہاں سردار کے ظلم و ستم کے تماشے دیکھے ہیں۔ وہ جس پر غصہ کرتا ہے اسے بہت برے طریقے سے اذیتیں دے کر مارتا ہے۔ ایک ساتھ ہلاک نہیں کرتا، چاقو سے کچوکے لگاتا ہے پھر تلوار سے ٹکڑے ٹکڑے کرتا ہے۔ بندوق کی ایک گولی سے کبھی نہیں مارتا۔''

''بیٹی!...... میں ستر برس کا ہوں اور تمہاری ماں مجھ سے دو برس چھوٹی ہے۔ ہم دونوں قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں۔ ہماری زندگیوں کا اختتام قریب ہے۔ موت چاہے کسی بھی طرح آئے اسے تو آنا ہی ہے۔''

ماں نے نازاں کو تسلیاں دیں پھر وہ گھر سے باہر نکل آئے۔ رات اندھیری تھی۔ پنسل ٹارچ کی روشنی میں راستہ دیکھا جا سکتا تھا۔ صمد یار خان نے زیتون کو ایک طرف لے جا کر سرگوشی میں کہا۔ ''میں بچوں کو بخیریت ٹرک میں چڑھا کر اسی پہاڑی پر آؤں گا۔ جہاں ہم تیس برس پہلے پہلی مرتبہ ملے تھے۔''

زیتون نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔ ''ہاں...... میں وہیں جا رہی ہوں۔ تمہارا انتظار کروں گی۔''

وہ زیتون کو تنہا چھوڑ کر اپنی بیٹی اور داماد کے ساتھ وہاں سے جانے لگا۔ جہاں سردار کا علاقہ ختم ہوتا تھا وہاں سے چوکی تک کا راستہ صمد یار خان کو معلوم تھا۔ وہ ایک دوسرا راستہ بھی

جانتا تھا جہاں سردار کے آدمی موجود نہیں ہوتے تھے۔ سرحدی علاقہ اتنا پھیلا ہوا تھا کہ سردار کے پاس نہ اتنے آدمی تھے اور نہ ہی وہ اپنی سرحد کی نگرانی کر سکتا تھا۔

صمد یار خان ایک طویل راستے پر چلتے ہوئے اس چوکی سے کتراتے ہوئے سرحد کے ایک کنارے پر پہنچ گیا۔ دلاور خان کا ٹرک وہاں سے گزرنے والا تھا۔ اس سے یہ ہی طے پایا تھا کہ اسی جگہ ملاقات ہوگی۔

رات کے ایک بجے دلاور خان ٹرک ڈرائیو کرتا ہوا وہاں آ گیا۔ اس نے کہا۔ ''جلدی کرو اس پر چڑھ کر اس کا کچھ سامان اندھیرے میں ہی کہیں پھینک دو۔ اپنے چھپنے کے لیے جگہ بنالو۔ آگے کوئی خطرہ نہیں ہے پھر بھی چھپ کر جانا چاہیے۔''

نعمان، دلاور خان کے ساتھ ٹرک کے پچھلے حصے میں چڑھ گیا پھر وہ وہاں سے ٹی وی اور کمپیوٹر سیٹ نکال کر دور تاریکی میں پھینکنے لگے۔ وہاں اچھی خاصی جگہ بن گئی۔ نعمان نے ہاتھ بڑھا کر نازاں کو ٹرک کے پچھلے حصے میں چڑھایا۔ صمد یار خان نے پوچھا۔ ''دلاور خان!...... آگے تمہارے لیے کوئی خطرہ تو نہیں ہے؟''

''فکر نہ کرو۔ یہ لوگ یہاں اس طرح چھپے رہیں گے کہ کوئی انہیں دیکھ نہیں سکے گا۔''

''میں ان کی نہیں۔ تمہاری بات کر رہا ہوں۔ تم پشاور پہنچو گے تو جہاں تم نے اپنے لاکھوں روپے جمع کیے ہیں۔ وہ رقم وہاں سے کیسے حاصل کرو گے؟ ہمارے سردار کے ایجنٹ تمہارے پیچھے پڑے رہیں گے۔''

''میں سردار سے زیادہ عقل رکھتا ہوں۔ میں نے اپنی رقم پشاور میں نہیں بلکہ چمن میں ایک منشیات فروش کے پاس چھپا رکھی ہے۔ ابھی یہاں سے جو ہیروئن لے جا رہا ہوں، جب اس کے سامنے ہیروئن رکھوں گا تو وہ سابقہ کے ساتھ اس کی رقم بھی رکھے گا۔''

''کیا تم یہ ٹرک لے کر پشاور نہیں جاؤ گے؟''

''نہیں...... پشاور سے پہلے ہی میں اس ٹرک کو چھوڑ دوں گا۔ صرف ہیروئن کے پیکٹس لے کر جاؤں گا۔ ان دونوں سے جدا ہو جاؤں گا۔ میرے پاس ابھی بیس ہزار ہیں۔ میں پندرہ ہزار نازاں کو دوں گا۔ یہ آسانی سے ہوائی جہاز کے ذریعے جلد سے جلد کراچی پہنچ جائے گی۔''

نازاں نے احسان مندی سے کہا۔ ''بھائی!...... میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔ تمہیں ہمیشہ یاد رکھوں گی۔''

نعمان نے کہا۔ ''یاد رکھنے کی کیا بات ہے؟ ہم تو دلاور خان کو چھوڑیں گے ہی نہیں۔''

پھر اس نے دلاور سے کہا۔ ''تم وہاں سے اپنا کام نمٹا کر سیدھے میرے پاس کراچی آ ؤ گے۔ میں تمہیں پناہ دوں گا۔ میں تمہیں چھپا کر رکھوں گا۔ سردار کا کوئی آدمی کوئی کرائے کا قاتل تم تک نہیں پہنچ سکے گا۔''

دلاور خان نے کہا۔ ''یہ بعد کی باتیں ہیں اگر میں نے ضرورت سمجھی کہ تمہارے پاس پناہ لینی ہے تو ضرور آؤں گا۔''

ٹرک کے پچھلے حصے میں کافی جگہ بن گئی تھی۔ نازاں اور نعمان وہاں بیٹھ گئے۔ دلاور اور صمد یار خان نے آس پاس اور اوپر سامان کو اس طرح سے رکھا کہ وہ اس کے پیچھے آرام سے بیٹھ کر سفر کرتے رہتے پھر وہ دونوں پچھلے حصے سے اُتر گئے۔ دلاور خان صمد یار خان کے گلے لگ گیا پھر کہا۔ ''چاچا!...... دعا کرو کہ ہم خیریت سے اپنی منزل پر پہنچ جائیں۔''

''بیٹے!...... میں تو ہر لمحہ دعا کرتا رہوں گا۔ خدا تم لوگوں کی حفاظت کرے۔ خدا حافظ۔''

اس نے مصافحہ کیا پھر ڈرائیونگ سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔ ٹرک کو اسٹارٹ کر کے وہاں سے جانے لگا۔ صمد یار خان بڑی محبت اور بڑے دکھ سے اس ٹرک کو جاتا ہوا دیکھتا رہا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو وہ پلٹ کر اپنی بستی کی طرف جانے لگا۔ انہوں نے بڑی ذہانت سے پلاننگ کی تھی۔ یہ جانتے تھے کہ اگر نازاں اور نعمان ٹرک میں چھپ کر جائیں گے تو چوکی تک پہنچتے ہی پکڑ لیے جائیں گے۔ وہاں وہ مسلح افراد ٹرک کو چاروں طرف سے اچھی طرح چیک کرتے تھے۔ انہوں نے ایسا کیا تھا۔ مطمئن ہو گئے تھے کہ کوئی گڑبڑ نہیں ہے اور دلاور خان کو آگے جانے کی اجازت دے دی تھی۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ جنہیں فرار ہونا ہے وہ اپنی ترکیب سے کامیاب ہو چکے ہیں۔

وہ بوڑھا اندھیرے میں چلتا ہوا پنسل ٹارچ کی روشنی میں راستہ دیکھتا ہوا اپنے علاقے میں آیا پھر ایک پہاڑی پر آہستہ آہستہ چڑھنے لگا۔ بڑھاپے اور جوان بیٹے کی موت نے اس کی کمر توڑ دی تھی، وہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ کانپ رہا تھا پھر بھی چڑھ رہا تھا پھر وہ وہاں پہنچ گیا۔ جہاں زیتون اس کا انتظار کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ روتے ہوئے بولی۔ ''کیا بیٹی کو رخصت کر دیا؟''

وہ ہانپتے ہوئے بولا۔ ''ہاں...... رخصت تو کرنا ہی تھا۔ ہم اپنی مرضی سے اپنی زندگی نہیں گزار پاتے۔ ہم نے چاہا تھا کہ جوان بیٹا زندہ رہے اور ہم اس کے سائے میں زندگی گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو جائیں لیکن ہمارے چاہنے سے کیا ہوا؟ کچھ نہیں، وہ اچانک ہمیں چھوڑ کر چلا گیا۔ ہم بیگار کیمپ کے سردار کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔''

زیتون نے کہا۔ ''اور ہم اپنے علاقے کے سردار کا بھی کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ اگر نعمان بھی تنہا فرار ہو جاتا تو سردار کے آدمی ہماری بیٹی کی عزت کی دھجیاں اُڑا دیتے۔ اسے اذیتیں دے دے کر مار ڈالتے اور یہ تماشا ہماری آنکھوں کے سامنے کرتے۔ ہم کس سے شکایت کریں؟ کمزور ہیں۔ شہزوروں کے سامنے ہمارا بس نہیں چلتا۔''

''خدا کا شکر ہے کہ آخری وقتوں میں ایک فرض نبھا دیا۔ بیٹی کو عزت آبرو سے رخصت کر دیا۔ اب ہمارا کام ختم ہو چکا ہے۔''

وہ بولی۔ ''اب کوئی کام نہیں رہا۔ کوئی خوشی کوئی آرزو نہیں رہی۔ یہ وہی جگہ ہے ناں...... جہاں میرے دل میں تمہارے لیے پہلی بار آرزو جاگی تھی؟''

''ہاں...... عمرِ رفتہ کو آواز دو تو وہ پلک جھپکتے ہی ہمارے دھیان میں آ جاتی ہے۔ اُن دنوں تم ایک نوخیز دوشیزہ تھیں۔ بھیڑ بکریاں چرانے ادھر آیا کرتی تھیں۔ جب میں نے پہلی بار تمہیں دیکھا تو بس دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔''

وہ بڑی سنجیدگی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم نے مجھے پہلی بار دیکھ کر کوئی گیت گنگنایا تھا۔ وہ کیا تھا......؟''

''ان آخری لمحات میں تم وہ مسرتوں بھرا گیت سننا چاہتی ہو؟''

''ہاں...... جیسے بچوں کو سلانے کے لیے لوری سنائی جاتی ہے۔ کیا ہم اپنے بڑھاپے کو ابدی نیند سلانے کے لیے جوانی کا کوئی گیت نہیں سن سکتے ہیں۔''

اس نے بڑی محبت سے زیتون کو دیکھا پھر آگے بڑھ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر دھیمے سُروں میں خوشحال خان خٹک کی ایک غزل، گنگنانے لگا۔ اس غزل کے ابتدائی اشعار اس نے زیتون کو دیکھ کر اس کے حسن سے متاثر ہو کر پڑھے تھے۔

سور پیر، واں دپہ زر کرنو لے سنواریا
بیاد زر و نوازا راغلے پاریا پاریا

''میری جان! یہ سونے کی ننھی سی نتھ جو تُو نے سنار سے بنوائی ہے۔ یہ میرے دل کو پارہ پارہ کر رہی ہے...... خدا کی قسم! یقین کر، کہ میں نے کسی وقت تجھے دل سے نہیں بھلایا۔''

''اے میری آنکھوں سے اوجھل رہنے والی تُو میرے دل میں ایسے سمائی ہے کہ کسی اور کا بھی نام لوں تو تیرا نام ہی زباں سے نکلتا ہے۔''

''کھٹا کڑوا نہ ہوتا تو میٹھے کی قدر نہ ہوتی۔ اسی لیے وصل کے ساتھ ہجر بھی لازمی ہے۔''

وہ سنتے سنتے رونے لگی پھر کہا۔ ''ہاں...... وصل تو تھا ہی اب ہجر بھی لازمی ہو گیا ہے۔ میرے محبوب! میرے صمد یار خان!...... مجھے معاف کرنا آج تک میں نے تیرا ساتھ دیا۔ اب نہیں دوں گی۔ اب میں اپنے بیٹے کے پاس جا رہی ہوں۔''

وہ تڑپ کر الگ ہوئی پھر پلٹ کر اس نے ایک گہری کھائی کی طرف چھلانگ لگا دی۔ اس کے حلق سے چیخ بھی نہیں نکلی۔ کیونکہ وہ موت سے ڈرتی نہیں تھی۔ اگر ڈرتی تو چیخیں مارتی۔

وہ کھائی سینکڑوں فٹ گہری تھی۔ تاریکی میں وہ کتنی گہری ہے اس کی پستی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ صمد یار خان نے ٹارچ کو ایک طرف پھینک دیا پھر آسمان کی طرف سر اٹھا کر کہا۔ ''میرے معبود! ہمیں معاف کرنا۔ ہم تیری دی ہوئی زندگی کی قدر نہ کر سکے۔ خودکشی حرام ہے لیکن کیا کیا جائے؟ اس بڑھاپے میں ہم وہ اذیتیں برداشت نہیں کر سکیں گے۔ ہم اس بڑھاپے میں تیرے پاس آرام سے آنا چاہتے ہیں اور آ رہے ہیں۔''

اس کے دونوں ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے تھے۔ وہ آگے کی طرف جھک گیا پھر جھکتا ہی چلا گیا۔ موت بڑی پُرکشش ہوتی ہے۔ بھاری سے بھاری چیز کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ اس نے ستر سالہ زندگی کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا۔

☆======☆======☆

گھر میں اچانک ہی جیسے مسرتوں کا میلا لگ گیا۔ اچانک ہی نعمان وہاں پہنچا تھا۔ اسے دیکھ کر ماں روتے ہوئے دوڑ کر اس سے چمٹ گئی۔ باپ بھی قریب آ کر اس سے لگ گیا تھا۔ بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسے چوم رہا تھا۔ صدف اپنے بیڈروم میں تھی۔ ایک ملازمہ نے آ کر اسے اطلاع دی تو وہ ایک دم سے اچھل پڑی۔ اسے یقین نہیں آیا کہ وہ یہ خوش خبری سن رہی ہے۔

سامنے ہی قدِ آدم آئینہ تھا۔ وہ نعمان کے سامنے جانے سے پہلے اپنے روپ رنگ کا جائزہ لینے لگی۔ وہ ایک بیٹے کو جنم دینے کے بعد بیمار رہنے لگی تھی۔ ساس سے ہمیشہ اس بات پر جھگڑا ہوتا تھا کہ وہ بچے کو اپنا دودھ نہیں پلاتی تھی۔ وہ بہانے کرتی تھی کہ وہ بیمار ہے اور بیمار ماں کا دودھ بچے کو نہیں پلانا چاہیے۔

وہ بہانہ کرنے والی اس حقیقت سے بے خبر تھی کہ اس کے اندر چھوٹی بڑی بیماریاں سرنگ بنائی جا رہی ہیں۔ بچے کو فیڈر سے لگانے کے بعد دودھ کے قدرتی سوتے خشک ہو گئے تھے۔ اس کے ردِعمل کے طور پر چہرہ خشک سا دکھائی دینے لگا تھا۔ پہلے والی تازگی نہیں رہی تھی۔

اس نے سر گھما کر دیکھا۔ ڈیڑھ سال کا بچہ بیڈ پر سو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ اسے اٹھا کر سینے سے لگا کر نعمان کے سامنے جائے اور بڑے فخر سے وہ خوبصورت تحفہ نعمان کو پیش کرے۔

پھر اس نے سوچا کہ میں اپنے شوہر سے ایک خوبصورت اور اسمارٹ دوشیزہ کے انداز میں ہمیشہ ملتی رہی۔ نعمان کو اپنے گلیمر سے اور اپنی کشش سے اپنی طرف کھینچتی رہی ہوں۔ آج بھی پہلے ایک محبوبہ اور بیوی کی حیثیت سے ملنا چاہوں گی۔

لیکن آئینہ کہہ رہا تھا کہ اب اس میں دوشیزگی نہیں رہی۔ اگرچہ وہ ایک بھرپور عورت نظر نہیں آ رہی تھی اور ایک بچے کی ماں بھی نظر نہیں آتی ہے پھر بھی وہ پہلے والی رونق اور تازگی اس کے اندر سے ختم ہو چکی ہے۔

اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اسے اختلاج قلب کی بھی شکایت ہو گئی تھی۔ کوئی جذباتی بات ہو، غصہ آئے تو وہ بہت زیادہ مایوس ہو جاتی۔ پریشانی میں مبتلا ہو جائے تو دل اس بری طرح دھڑکنے لگتا تھا جیسے حلق میں آ کر دھڑکنے لگا ہو۔ رملا نے اس کے لیے دوائیں لکھ کر دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''دل سینے کے اندر ہوتا ہے اور تمہیں سینے کی تکلیف ہونے لگی ہے۔ میں تمہیں سمجھاتی تھی مگر تمہاری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔''

اس وقت ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ عورت اپنے شوہر کے سامنے اپنی پہلی جیسی خوبصورتی اور حسن قائم رکھنے کے لیے کیا کر سکتی ہے؟

ایک ہی جواب سمجھ میں آیا کہ ممتا کا پلڑا بھاری ہوتا ہے۔ اسے ایک محبوبہ بن کر نہیں اپنے بچے کی ماں بن کر شوہر کے سامنے جانا چاہیے۔ اس نے پلٹ کر پھر بچے کو دیکھا اب وہ ہی اس کا سہارا تھا۔ اس کے لیے بے انتہا کشش پیدا کر سکتا تھا اور اپنی آمد سے اپنے باپ کو چونکا سکتا تھا۔ اس طرح سے اپنی ماں کا مان مرتبہ بڑھا سکتا تھا۔

اس نے آگے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا لیا پھر تیزی سے چلتی ہوئی کمرے سے باہر آئی۔ ایک کوریڈور سے نکل کر ڈرائینگ روم میں پہنچی۔ تو وہاں نعمان اور اس کے والدین ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے۔ ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ ایسے وقت بی پاشا اسے خوشخبری سنانا چاہتی تھیں کہ وہ ایک بیٹے کا باپ بن چکا ہے اور بیٹا اب ڈیڑھ سال کا ہو گیا ہے۔

لیکن ایسا کچھ کہنے سے پہلے ہی ان کی نظر نازاں پر گئی۔ وہ پیچھے ان سب کو کھڑی چپ چاپ دیکھ رہی تھی۔ ماں نے پوچھا۔ ''بیٹے!...... یہ کون ہے؟''

وہ نازاں کی طرف بڑھ کر پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر بولا۔ ''ممی!...... یہ آپ کی دوسری بہو ہے۔''

صدف دروازے پر آ کر رک گئی۔ اس کی نظر پہلے نازاں پر ہی گئی تھی پھر نعمان نے جو کہا اسے سنتے ہی اس پر جیسے بجلی گر پڑی تھی۔ نعمان کہہ رہا تھا۔ ''ممی!...... ابھی جو آپ کا بیٹا آپ کے سامنے زندہ سلامت کھڑا ہے تو یہ اسی نازاں کی وجہ سے ہے۔''

بی پاشا نے آگے بڑھ کر نازاں کے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔ اسے جھکا کر اس کی پیشانی چومی پھر اسے گلے لگا لیا۔ نعمان کہہ رہا تھا، اس کے والد کے مجھ پر بڑے احسانات ہیں۔ میرے برے وقت میں کام آتے رہے ہیں۔ پہلے میں بیگار کیمپ میں قیدی تھا۔ اس کے بعد ایک علاقے کے سردار کا قیدی بن کر رہ گیا تھا۔ اس کے والد نے آدھی رات کو میرے فرار ہونے کا راستہ ہموار کیا۔ ہم بڑی مشکلوں سے گزرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔''

نعمان کے ڈیڈی اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دعائیں دے رہے تھے۔ ساس بڑی عزت سے اسے اپنے ساتھ صوفے پر بٹھا رہی تھیں۔ دو جوان عورتوں کا آمنا سامنا ہو تو وہ پہلے اندر ہی اندر ایک دوسرے کا موازنہ کرتی ہیں کہ کون کس سے بڑھ کر ہے؟ اور کون کس پہلو سے کمتر ہے؟

وہ پہاڑوں سے آنے والی بھرپور جوان تھی۔ لال لال گلنار سا چہرہ تھا۔ اس کے چہرے پر جو شادابی تھی وہ کبھی صدف کے چہرے پر بھی تھی۔ وہ ابھی آئینہ دیکھ کر آ رہی تھی اور نازاں کو دیکھ کر مایوس ہو رہی تھی۔

اس نے دروازے سے گزر کر ڈرائینگ روم میں قدم رکھا پھر آہستہ آہستہ چلتی ہوئی نعمان کی طرف بڑھنے لگی۔ نعمان نے سر اٹھا کر دیکھا پھر خوشی سے بولا۔ ''صدف تم کہاں رہ گئی تھیں؟''

وہ اس کی طرف بڑھتے بڑھتے رک گیا۔ اس کی گود میں بچے کو دیکھ کر پوچھا۔ ''یہ...... یہ کس کا بچہ ہے؟''

''یہ ہماری محبت کا خوبصورت تحفہ ہے۔ میں یہ تحفہ پیش کرنے کے لیے دن رات تمہارا ہی انتظار کرتی رہی ہوں۔''

وہ ایک دم سے پیچھے ہٹ گیا۔ اسے ناگواری سے دیکھ کر اپنے ماں باپ کی طرف دیکھنے لگا۔ بی پاشا نے کہا۔ ''بیٹے!...... تمہارے جدا ہونے کے بعد بہو نے بتایا کہ یہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ پہلے تو ہم نے یقین نہیں کیا۔ کیونکہ ہم تمہاری میڈیکل رپورٹ دیکھ چکے تھے۔ بعد میں خیال آیا کہ میڈیکل رپورٹ غلط ہو سکتی ہے۔ ہمیں تمہارے آنے

تک بہو سے اختلافات نہیں رکھنے چاہئیں۔ اب تو تم ہی بتا سکتے ہو کہ میڈیکل رپورٹ سچ بول رہی ہے یا تمہاری بیوی......؟"

اس نے اس سے اور ذرا دور ہو کر پوچھا۔ "صدف!...... یہ کیا تماشا ہے؟ یہ بچہ کہاں سے آیا ہے؟"

وہ چونک کر گھبرا گئی پھر بولی۔ "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ یہ ہمارا بچہ ہے۔"

"بکواس مت کرو۔ کیا تم نے وہ میڈیکل رپورٹ نہیں دیکھی تھی؟"

"ہاں...... مگر وہ جھوٹی تھی۔ آپ باپ بن سکتے تھے اور بن چکے ہیں۔"

"ڈاکٹرز معائنہ کرنے میں غلطی کر سکتے ہیں۔ غلط رپورٹ پیش کر سکتے ہیں لیکن قدرتی معاملات تو غلط نہیں ہوتے۔ ادھر نازاں کو دیکھو دو برس سے یہ میری بیوی ہے اور اس کی گود بھرنے کے لیے اس کی ماں نے اسے طرح طرح کی دوائیں کھلائی ہیں لیکن اب تک اس کی گود خالی ہے۔ صرف اس لیے کہ میں باپ نہیں بن سکتا۔"

صدف اس وقت شدت سے اپنی توہین محسوس کر رہی تھی۔ چلا کر بولی۔ "نعمان!...... تم میری انسلٹ کر رہے ہو۔ بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہ رپورٹ غلط تھی۔ تم آج ہی چل کر معائنہ کراؤ۔ کل تک رپورٹ سامنے آئے گی تو سچ سامنے آ جائے گا پھر پتا چلے گا تم نیگیٹو نہیں پازیٹو ہو۔"

وہ سخت لہجے میں بولا۔ "مجھے میڈیکل چیک اَپ کی ضرورت ہی کیا ہے؟ قدرتی رپورٹ میرے سامنے موجود ہے۔ جب نازاں کی گود بھرے گی تب میں یقین کر لوں گا تم نے میرے ہی بچے کو جنم دیا ہے۔"

"تم فضول باتیں کر رہے ہو۔ ایک نئی نویلی دلہن لا کر اس کے سامنے میری توہین کر رہے ہو۔ میں اپنا حق تم سے لے کر رہوں گی۔ میں ثابت کر دوں گی کہ یہ بچہ تمہارا ہی ہے۔"

"جب ثابت کرو گی تو دیکھا جائے گا اور جب تک یہ ثابت نہ ہو میرے سامنے نہ آنا۔ میں اب تمہاری صورت بھی دیکھنا نہیں چاہتا۔"

وہ غصے سے پلٹ کر اپنے بیڈ روم میں آئی۔ بچے کو بستر پر پٹخ کر اپنا بیگ نکال کر ضروری سامان رکھنے لگی۔ ایک تو اسے یہ دکھ تھا کہ نعمان نے دوسری شادی کی تھی۔ اس پر سوکن لایا تھا اور اس سوکن کے سامنے اس کی بے عزتی کر رہا تھا۔

ایسے وقت اسے اپنی غلطی کا پتا نہیں چل رہا تھا کہ اس نے اپنے شوہر کی غلط میڈیکل

رپورٹ پیش کر کے اپنے پاؤں پر خود ہی کلہاڑی ماری تھی اور اب اس کے برے نتائج اس کے سامنے آ رہے تھے۔

اس کا دل اندر سے رو رہا تھا۔ اس پہلو سے بھی توہین کا احساس ہوا کہ نعمان اس کے قریب نہیں آیا۔ اس نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ اس کا مطلب یہ ہی تھا کہ اس کے اندر دلکشی ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ پہلے جیسی خوبصورت اور پُرکشش نہیں رہی تھی۔ ایک نئی دلہن اپنی تمام تر شادابیوں کے ساتھ اسے اپنا دیوانہ بنا رہی تھی۔

اس نے آیا کو بلایا پھر کہا۔ "بچے کا تمام سامان پیک کرو اور یہاں سے چلو۔"

اس نے بچے کی دیکھ بھال کے لیے ایک ملازمہ رکھی تھی۔ اس ملازمہ نے بچے کا تمام ضروری سامان پیک کیا پھر بچے کو گود میں لے کر اس کے ساتھ بنگلے سے باہر جانے لگی۔

ڈرائینگ روم میں نعمان اپنی نئی بیوی اور ماں باپ کے ساتھ موجود تھا۔ اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا لیکن کسی نے جھوٹے منہ بھی یہ نہیں کہا کہ اسے رک جانا چاہیے۔ اس سے پھر کسی طرح کا سمجھوتا کیا جائے گا یا اسے اپنا سمجھ کر محبت دی جائے گی۔

لیکن اسے کسی نے کچھ نہ کہا۔ کسی کو اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ نعمان نے یہ فیصلہ سنا دیا تھا کہ بچہ اس کا نہیں ہے۔ تو پھر صدف سے اس کا کوئی تعلق نہیں رہا تھا اور اب ساس سسر بھی اسے اپنی بہو ماننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ نعمان آئندہ اسے اپنی شریکِ حیات کے طور پر قبول کرے گا یا نہیں......؟ یہ فیصلہ بعد میں ہونے والا تھا۔

وہ باہر آ کر اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گئی۔ آیا بچے کو لے کر پچھلی سیٹ پر چلی گئی۔ پھر وہ کار اسٹارٹ کر کے وہاں سے جانے لگی۔ نعمان ڈرائنگ روم میں سر جھکائے بیٹھا تھا۔ وہ صدف سے محبت کرتا تھا لیکن اس کی گود میں بچے کو دیکھ کر اس کی مردانگی اور غیرت کو ٹھیس پہنچی تھی۔ وہ بچہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت تھا کہ صدف بدچلن ہے اور اس نے اس کے اعتماد کو دھوکا دیا ہے۔ پتا نہیں کس کا بچہ گود میں لیے پھر رہی ہے؟

اس کے ڈیڈی نے کہا۔ "بیٹے!...... میں سمجھ رہا ہوں۔ صدف کی بیوفائی سے تمہیں صدمہ پہنچ رہا ہے اور تم شاید کشمکش میں بھی مبتلا ہو؟"

وہ بولا۔ "کشمکش کیسی......؟ مجھے دودھ کا دودھ پانی کا پانی کرنا ہے۔ جو سچ ہے اسے سامنے لا کر اس سے ہمیشہ کے لیے تعلق توڑنا ہے۔ میں اب ایسی عورت کے ساتھ زندگی نہیں گزاروں گا۔"

بی پاشا نے پوچھا۔ ''بیٹے!......تم کیا کرنے والے ہو؟''

''میں احتیاطاً اپنا میڈیکل چیک اَپ کراؤں گا۔ اگر میں پازیٹو ثابت ہوا تو پھر صدف کو بچے کے ساتھ قبول کرلوں گا۔''

بی پاشا نے کہا۔ ''بیٹے!...... یہ ہمارے لیے خوشی کی بات ہوگی کہ ایک پوتا تو آیا ہوا ہے اب ہماری دوسری بہو بھی ہمارے لیے پوتے اور پوتی لے کر آئے گی۔''

پھر وہ اپنی دوسری بہو سے بولیں۔ ''آؤ بیٹی!...... میرے ساتھ چلو۔ غسل کر کے کچھ کھاؤ پیو پھر آرام سے سو جاؤ۔ اپنی تھکن اتارو۔ ہمارے معاملوں سے تمہیں پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کو جو منظور ہوگا وہی سامنے آئے گا۔''

وہ دوسری بہو کو لے کر نعمان کے کمرے میں چلی گئیں۔ ایک گھنٹے کے بعد فون پر ڈاکٹر رملا نے نعمان کو مخاطب کیا پھر کہا۔ ''نعمان صاحب!...... یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ آپ کو اس وقت تک صدف پر بھروسا کرنا چاہیے تھا جب تک کہ دوبارہ میڈیکل چیک اَپ نہ ہو جاتا۔''

''میں دوسری شادی کر چکا ہوں اور اس شادی کو دو برس ہو چکے ہیں۔ میری دوسری بیوی کی گود ابھی تک ویران ہے۔''

''میں نے یہ سب کچھ سن لیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ دو برس میں دوسری بیوی بھی ایک بچے کی ماں بن جائے۔ آپ کو انتظار کرنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک برس نہیں چار برس بعد اس کے پاؤں بھاری ہو سکتے ہیں۔ سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ آپ کو پھر سے میڈیکل چیک اَپ کروانا چاہیے۔''

''میں کل ہی اپنا چیک اَپ کراؤں گا۔''

''کل بہت دور ہے۔ ابھی میں آپ کو بری خبر سناتی ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ صدف کا دماغ کتنا گرم ہو جاتا ہے۔ وہ غصے میں ڈرائیو کر رہی تھی۔ ٹینشن میں مبتلا تھی۔ حادثے کا شکار ہوگئی ہے۔ اس وقت میرے اسپتال میں ہے۔ آپ فوراً چلے آئیں۔''

اس نے پریشان ہو کر اپنے ڈیڈی سے کہا۔ ''صدف کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے اس وقت اسپتال میں ہے۔''

دوسری طرف سے رملا کہہ رہی تھی۔ ''آیا بچے کے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ خیریت سے ہے، ہلکی سی چوٹیں آئی ہیں۔ بچہ محفوظ ہے لیکن صدف بری طرح زخمی ہوگئی ہے۔ آپ کو یاد کر رہی ہے۔ پلیز...... فوراً چلے آئیں۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ صدف سے برسوں کی وابستگی تھی۔ وہ اسے دل سے چاہتا تھا۔ اس وقت اس سے ناراض تھا لیکن حادثے کی خبر سن کر ناراضی کچھ کم ہوگئی۔ وہ اپنی ممی اور ڈیڈی کے ساتھ اسپتال پہنچا۔ تو وہ ایک بیڈ پر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سر پر اور چہرے پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ آیا بچے کو لیے ساتھ والے بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی۔ وہ بھی کچھ زخمی تھی۔

ڈاکٹر رملا ان دونوں کو اٹینڈ کر رہی تھی۔ اس نے صدف کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے آواز دی۔ ''صدف!...... آنکھیں کھولو۔ دیکھو نعمان آئے ہیں۔''

اس نے بڑی نقاہت سے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ سامنے کچھ فاصلے پر کھڑا ہوا نعمان دھندلا دھندلا سا نظر آ رہا تھا۔ اس کا دماغ اور اس کی نظریں کام نہیں کر رہی تھیں۔ وہ بڑی کمزوری سے کانپتے ہوئے بولی۔ ''مجھے...... معاف کر دو...... میں نے تمہارے ساتھ...... تمہارے والدین کو دھوکا دیا۔ تمہاری رپورٹ پازیٹو تھی۔''

یہ کہہ کر وہ چپ ہوگئی۔ گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ اسے بولنے میں تکلیف ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر رملا نے اس کے ہاتھ کو تھپک کر کہا۔ ''خاموش رہو...... ابھی بولنا ضروری نہیں ہے...... باتیں بعد میں کر لینا۔''

وہ بولی۔ ''نہیں...... میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

''ایسی باتیں نہ کرو۔ کل ہی نعمان اپنا میڈیکل چیک اَپ کرائیں گے۔''

''کل...... بہت دور ہے۔ نعمان میں پارسا ہوں۔ بے وفا نہیں ہوں۔ میرے سامنے میرے بچے کو گود میں لے لو۔ اسے سینے سے لگا لو۔''

وہ چپ ہو کر پھر گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ ڈاکٹر رملا نے کہا۔ ''نعمان! اس کی بات مان لیں۔ آپ اس پر نہ سہی مجھ پر بھروسا کریں۔ میں ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے کہہ رہی ہوں کہ آپ پازیٹو ہیں۔ آپ باپ بن سکتے ہیں اور بن چکے ہیں۔ یہ بچہ آپ کا ہی ہے۔''

نعمان کا رخ بچے کی طرف تھا۔ اس نے بچے کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ بی پاشا نے کہا۔ ''بیٹے! کون جانتا ہے کہ حقیقت کیا ہے؟ جو سچ ہے، اسے خدا پر چھوڑ دو۔ کل یا پرسوں تک تمہیں اپنی میڈیکل رپورٹ مل جائے گی لیکن بہو کی حالت بہت خراب ہے۔ اس کی بات مان لو۔ اسے گود میں لے لو۔ اس کے سامنے اسے پیار کرلو۔ تمہارا کیا بگڑے گا؟''

''ایک عورت بے وفائی کرتی ہے تو مرد کی انا کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اس کی غیرت کو چیلنج کرتی ہے۔ ابھی یہ میرے لیے چیلنج ہے کہ میں باپ نہیں بن سکتا مگر اس نے مجھے چور

دروازے سے باپ بنایا ہے۔ میں کبھی اسے اپنا تسلیم نہیں کروں گا۔ اگر میڈیکل رپورٹ پازیٹو ہوگی تو پھر میں اس سے معافی مانگ لوں گا اور بچے کو اپنے سینے سے لگالوں گا لیکن ابھی نہیں......ابھی نہیں......"

صدف نے تڑپ کر اندر سے مچل کر نعمان کو دیکھا۔ اسے مخاطب کرنا چاہا۔ "نو......نو......میرا......آپ کا......بیٹا......اسے......اسے اٹھالو......اٹھالو......"

ان آخری لمحات میں صدف کے دل و دماغ کے اندر صرف ایک ہی بات تھی کہ نعمان اس کے بیٹے کو گود میں اٹھا کر پیار کرلے۔ اس کا مان رکھ لے۔ اس کی پارسائی کو تسلیم کرلے۔ اس وقت اس کے ذہن میں دور دور تک یہ بات نہیں تھی کہ وہ اسے حسین و پُرکشش محبوبہ اور بیوی کی حیثیت سے دیکھے اور اس کے قریب آکر اس کا ہاتھ تھام لے۔

وہ کچھ نہیں چاہتی تھی۔ وہ اپنے لیے محبت طلب نہیں کر رہی تھی۔ ان لمحات میں اس کی عزتِ نفس اسے مار رہی تھی اور وہ یہ توہین برداشت نہیں کر پا رہی تھی کہ اپنے نعمان کے بیٹے کو جنم دینے کے باوجود بدچلن اور فاحشہ کہلا رہی ہے اور اس دنیا سے بدنام ہو کر جا رہی ہے۔

عورت کے ماتھے پر نہیں لکھا ہوتا کہ وہ پارسا ہے۔ اگر لکھا ہوتا تو نعمان فوراً تسلیم کر کے بچے کو گود میں اٹھالیتا۔

عورت ہو یا مرد وہ اپنے اعمال سے اپنا اعتماد برقرار رکھتے ہیں اور وہ اپنے جھوٹ اور فریب کے باعث اعتماد کھو چکی تھی۔ آخری لمحات میں اتنا بھی اعتماد حاصل نہ ہو سکا کہ اس کا شوہر محض اس کا دل رکھنے کے لیے ہی بچے کو گود میں اٹھالیتا۔

وہ منہ پھیرے کھڑا تھا۔ اس نے آخری ہچکی لی تو اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ ہمیشہ کے لیے ساکت ہو چکی تھی۔

☆======☆======☆

دلدل کے پھول

عشق۔ ع سے عورت......اور اس دنیا میں نہ عشق کو چین ملتا ہے، نہ عورت کو۔ یہ دونوں ہی اَزل سے سزاوار ٹھہرائے گئے ہیں۔ دونوں ہی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ عشق اندر کی آگ کو کہتے ہیں، یہ آگ ہر ایک کے اندر نہیں بھڑکتی، جب عورت پھونک مارتی ہے تب ہی یہ بھڑکتی ہے۔

عشق کی ہر داستان عورت سے شروع ہوتی ہے اور عورت پر ہی ختم ہوتی ہے۔ عورت نہ ہو تو عشق نہ ہو اور عشق نہ ہو تو عورت کی قدر و منزلت نہ ہو۔ جو عورت عشق کے پُل صراط سے گزر جاتی ہے وہ کبھی فنا نہیں ہوتی کیونکہ عشق ازل سے لافانی رہا ہے۔

فاخرہ کے ہاتھ میں محبت کی لکیر بہت گہری تھی۔ اتنی گہری کہ دور کھڑے ہوئے مشتاق کی نظروں میں آگئی۔ اس کی ہتھیلی مشتاق کی بہن کے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ وہ ہاتھ کی لکیریں نہیں پڑھوا رہی تھی، مہندی لگوا رہی تھی۔

وہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا ان کے قریب آیا، فاخرہ اس کا ہاتھ پہلے سے بہن کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے کلائی تھام لی۔ ہائے! کلائی تھی یا مکھن کی ڈلی......بادبانی کشتی کی طرح اپنی سمت لے چلی۔ وہ اسے تھام کر لکیریں پڑھنا بھول گیا۔ وہ کلائی آنچ دے رہی تھی، مکھن کی طرح پگھل رہی تھی اور اس کے حواس کو پگھلا رہی تھی۔

فاخرہ پہلے تو اس کی بے باکی پر دم بخود رہ گئی پھر ایک دم سے بپھر گئی۔ وہ ہاتھ دیکھنا چاہتا تھا، اس نے دوسرا زوردار ہاتھ دکھا دیا۔ تڑاخ کی گونجتی ہوئی آواز نے سمجھا دیا کہ نازک ہتھیلی پر محبت کی جو لکیر ہے، وہ مکھن کی نہیں، فولاد کی ہے۔ وہ ایک دم سے بوکھلا گیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑا کر، اسے آنچل میں چھپا کر یوں پیچھے ہٹ گئی۔ جیسے کسی چور سے حیا کا خزانہ چھپا رہی ہو۔

وہ سولہ برس کی تھی، اس عمر میں تو جذبات اپنی اُڑان پر ہوتے ہیں۔ پل بھر کے سہارے کو عمر بھر کا ساتھ سمجھنے لگتے ہیں پھر اس کے ہاتھ کی لکیر بھی یہی کہہ رہی تھی کہ وہ محبت کی بھوکی ہے، بڑی ہی جذباتی قسم کی لڑکی ہے۔ جس سے محبت کرے گی ٹوٹ کر کرے گی۔ مگر مشتاق اس کے ردِعمل پر حیران بھی تھا اور شرمندہ بھی۔

اس نے جھینپ کر اپنی بہن نجمہ کو دیکھا وہ سمجھ رہی تھی کہ بھائی کو یوں بے باک نہیں ہونا چاہیے تھا۔ اس کے باوجود شکایتاً بولی۔ ”یہ کیا حرکت ہے فاخرہ؟“

وہ بولی۔ ”کیا تم نے کچھ دیکھا نہیں ہے یا بھائی کی حمایت میں انجان بن رہی ہو؟“

”تمہارے دماغ میں گرمی بہت ہے۔ اس لیے تم اچھے برے کی تمیز نہیں کرتی ہو۔ بھائی جان نے کسی بری نیت سے ہاتھ نہیں لگایا تھا۔“

”نیت اچھی ہو یا بری! بھائی تو جوان بہنوں کے ہاتھ بھی نہیں پکڑتے۔ اپنے ہوں یا پرائے، سب ہی کے درمیان تہذیبی فاصلہ قائم رکھا جاتا ہے۔“

وہ اصولی بات کہہ رہی تھی۔ مشتاق شرمندہ سا ہو رہا تھا۔ اس نے بہن سے کہا۔ ”بحث نہ کرو۔ فاخرہ درست کہہ رہی ہے مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے معافی مانگنی چاہیے لیکن معافی مانگنے سے پہلے سزا مل گئی۔ ویسے میں ایسی توہین آمیز سزا کا مستحق نہیں تھا۔“

وہ منہ پھیر کر بولی۔ ”مجھے افسوس ہے۔ آپ کی بے باکی میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ یہ سمجھیں کہ آپ سے ایک غلطی ہوئی، مجھ سے بھی ایک غلطی ہوگئی۔“

اس نے بہن کو دیکھا پھر کہا۔ ”نجمہ نے تمہیں بتایا ہوگا، میں ہاتھوں کی لکیریں پڑھتا ہوں۔ دور سے تمہارا ہاتھ دیکھ رہا تھا۔ بہت ہی دلچسپ لکیر نظر آئی، معلوم ہوا تم کسی کی محبت میں ایسی اندھی ہو جاؤ گی کہ دیوانگی کی حدوں کو چھونے لگو گی۔“

فاخرہ نے اک ذرا حیرانی سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے خوابوں اور خیالوں کی باتیں کہہ رہا تھا۔ کوئی کسی کے خوابوں اور خیالوں میں جھانک کر اندر کے چور جذبوں تک نہیں پہنچ سکتا، لیکن اس کے ایک ہاتھ کی لکیر دور تک اس کے پوشیدہ جذبوں کی چغلی کھا رہی تھی۔

مشتاق نے اپنی غلطی کو تسلیم کرتے ہوئے صلح جوئی کا راستہ اختیار کیا تھا۔ لیکن نجمہ کو یوں لگ رہا تھا جیسے بھائی کے منہ پر پڑنے والا طمانچہ اس کے منہ پر پڑا ہو۔

فاخرہ کے ہاتھوں پر مہندی کے گل بوٹے مکمل نہیں ہوئے تھے۔ نجمہ نے مہندی کی کون ایک طرف پھینکتے ہوئے ناگواری سے سہیلی کو دیکھا پھر، اونہہ کہہ کر پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے

چلی گئی۔

فاخرہ عجیب کیفیات سے دوچار ہو رہی تھی۔ ایک جانب سہیلی ناراض ہو کر گئی تھی۔ دوسری جانب مشتاق نے چور جذبوں کو دھڑکا دیا تھا۔ اسے پہلی بار معلوم ہوا تھا کہ ہاتھ کی لکیریں گھر کی بھیدی ہوتی ہیں۔ دل کے راز تو سینے میں چھپے رہتے ہیں لیکن لکیریں چھپی نہیں رہتیں، رازہائے دل کے پردے اُٹھتے چلے جاتے ہیں۔

وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کے سامنے پردہ اُٹھ جائے۔ اگرچہ تجسس پیدا ہو رہا تھا کہ اپنے ہاتھ کی وہ لکیر اور کیا کہہ رہی ہے۔ یہ حقیقت تھی کہ اس کے اندر کسی سے چاہے جانے والی شدید خواہش تھی۔ اس کے خوابوں اور خیالوں میں کوئی آتا تھا۔ یہ بات اس کے لیے ناقابلِ فہم تھی کہ اسے مردوں سے سخت نفرت تھی۔ اس کے باوجود وہ کسی کی تمنا کرتی تھی۔ عجیب دوغلی کیفیت سے دوچار رہتی تھی۔

ہر شخص مستقبل کے آئینے میں جھانکنا چاہتا ہے۔ مشتاق کو توقع تھی کہ وہ آئینہ دیکھنے کے لیے اپنا ہاتھ پیش کرے گی لیکن وہ اپنی ہتھیلی پر سے ادھوری مہندی کو دوپٹے سے پونچھتی ہوئی منہ پھیر کر چلی گئی۔

جانے کے انداز نے بتا دیا کہ وہ پھر کبھی نہیں آئے گی۔ اس نے پریشان ہو کر بند دروازے کو دیکھا۔ وہاں سے چلتا ہوا بہن کے پاس آگیا۔ ”وہ درست کہہ رہی تھی، مجھے ہاتھ پکڑنے سے پہلے اجازت لینی چاہیے تھی۔ میں غلطی پر تھا، تمہیں میری طرف داری نہیں کرنی چاہیے تھی۔“

”کیوں نہ کرتی؟ وہ ایسی ہی آدم بیزار ہے۔ پتہ نہیں خود کو کیا سمجھتی ہے؟ خدا نے حسن کیا دیا ہے، ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتی۔ اب سے پہلے بھی اس نے ایک لڑکے پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ وہ اسے بہت چاہتا ہے، بہت ہی خوبرو اور اسمارٹ ہے۔ اسکول کی تقریباً سب ہی لڑکیاں اس کے نام پر آہیں بھرتی ہیں۔ وہ بھی کیا سر پھرا ہے کہ اسی مغرور سے محبت کرتا ہے۔“

وہ حیرت سے بہن کی باتیں سن رہا تھا۔ پھر بولا۔ ”تعجب ہے، ہاتھ کی لکیر بتا رہی ہے کہ یہ محبت میں جنونی ہوگی، عشق کے انتہائی مقام تک پہنچے گی لیکن تمہاری باتوں سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہ کبھی کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوگی۔“

وہ بولی۔ ”پتہ نہیں کہ آپ نے ایک نظر میں کیسے اس کی ہتھیلی پڑھ لی ہے؟ میں تو کہتی

ہوں اس سے محبت کرنے والا ہمیشہ سر پکڑ کر روئے گا۔''

اس نے پوچھا۔ ''کیا واقعی یہ مردوں سے سخت نفرت کرتی ہے؟''

''میری آنکھوں نے اب تک یہی دیکھا ہے۔''

''پھر تو نفرت کی کوئی نفسیاتی وجہ ہوگی۔ کبھی کسی کی محبت اچانک دل میں جگہ بنائے گی تو پھر یہ دیوانہ وار اس سے محبت کرنے لگے گی۔ تم تو اس کے ذاتی حالات سے اور معاملات سے واقف ہو۔ کیا اس کے بارے میں کچھ بتاؤ گی؟''

وہ ناک چڑھا کر بولی۔ ''اس کے گھریلو حالات کچھ عجیب سے ہیں۔ باپ نکما ہے۔ رات کو شراب پیتا ہے۔ دن چڑھے تک سوتا رہتا ہے۔ رات گئے تک محلے کے اوباش لوگوں کے ساتھ تاش کھیلتا اور گپیں ہانکتا رہتا ہے۔ بڑی بہن نیلو کسی فیکٹری میں ملازمت کرتی ہے۔ یہ اسکول آتی ہے تو کبھی کبھی بہت غصے میں ہوتی ہے۔ ایسے وقت اپنے ابو کی بہت برائیاں کرتی ہے۔''

وہ توجہ سے بہن کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ بولی۔ ''وہ ہیں بھی ایسے، خود کچھ نہیں کرتے بیٹی جو کما کر لاتی ہے وہ بھی چھین لیتے ہیں۔ بیٹیوں سے زیادہ انہیں شراب کی فکر رہتی ہے۔ شاید اسی لیے فاخرہ کو مرد ذات سے نفرت ہے؟''

وہ تائید میں سر ہلانے لگا۔ اس کے نفرت کرنے کی ایک بڑی وجہ سمجھ میں آ گئی تھی۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ فاخرہ کا باپ شرابی اور جواری ہونے کے ساتھ ساتھ بے غیرت بھی تھا۔ اس نے اپنی بڑی بیٹی کو سونے کی چڑیا بنایا ہوا تھا۔ انگور کی بیٹی کی خاطر وہ اپنی بیٹی کو داؤ پر لگاتا رہتا تھا۔ محلے والے یہی سمجھتے تھے کہ نیلو کسی فیکٹری میں رات کی شفٹ میں ملازمت کرتی ہے۔ باپ کی یہ فطرت فاخرہ کے مزاج کے خلاف تھی۔

وہ اکثر نیلوفر سے پوچھا کرتی تھی۔ ''ابو جو کہتے ہیں تم وہ کیوں کرتی ہو؟ تمہیں گھن نہیں آتی؟''

اس نے ایک سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''جب انسان گندگی میں قدم رکھ دیتا ہے تو پھر کسی چیز سے گھن نہیں آتی۔ اب تو صرف ایک حسرت ہے کہ پڑھائی ختم ہوتے ہی تمہاری شادی کرا دوں۔ یہ خوف دماغ پر ہتھوڑے برساتا رہتا ہے کہ خدانخواستہ ابا میرے بعد تمہیں کمائی کا ذریعہ نہ بنالیں۔''

وہ ناگواری سے بولی۔ ''ایسا تو کبھی نہیں ہوگا۔ میں تمہاری طرح ابا کے سامنے کبھی سر

نہیں جھکاؤں گی۔''

وہ اس کا شانہ تھپکتے ہوئے بولی۔ ''میں مجبور تھی، امی کے بعد تم میری ذمے داری تھیں، تمہیں تعلیم دلوانی تھی، ابو تو ہمیشہ سے ہی شراب میں ڈوبے رہے ہیں۔ پہلے امی کو اس غلاظت بھرے راستے پر چلاتے رہے ان کے بعد میری باری آئی اور میں کبھی نہیں چاہوں گی کہ میرے بعد تمہارا نمبر آئے۔''

وہ اس کی گردن میں بانہیں ڈالتے ہوئے بولی۔ ''بے فکر رہو، میں اس روایت کو آگے نہیں بڑھنے دوں گی۔''

''بے فکر تو میں تب ہوں گی جب تم بیاہ کر اپنے گھر سدھاروگی۔''

وہ اس سے الگ ہوتے ذرا ناگواری سے بولی۔ ''کون سا اپنا گھر؟ یہ مردوں کا معاشرہ ہے، مردوں کی دنیا ہے یہاں عورت کا اپنا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ وہ پہلے باپ کے گھر میں رہتی ہے پھر شوہر کے رحم وکرم پر رہتی ہے اور آخر میں بیٹے کے ٹکڑوں پر پلتی ہے۔ سوائے قبر کے ہم عورتوں کا اپنا کوئی گھر نہیں ہوتا۔''

وہ زہر اگل رہی تھی۔ نیلو نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''شوہر کا گھر ہی عورت کا اصل گھر ہوتا ہے۔ میں تو کنواری سہاگن بن کر زندگی گزار رہی ہوں لیکن تمہیں اپنی طرح بد نصیب نہیں بننے دوں گی۔''

''تم باپ کے پاس رہ کر بدنصیب ہو۔ ہوسکتا ہے میں شوہر کے پاس جا کر بدنصیب بن جاؤں۔''

وہ اسے میٹھے انداز میں گھورتے ہوئے بولی۔ ''منہ سے اچھی باتیں نکالا کرو۔ تم جیسی خوب صورت اور ذہین لڑکی تو کبھی بدنصیب ہو ہی نہیں سکتی۔''

''اور اس ذہین لڑکی کی زندگی میں کبھی کوئی لڑکا نہیں آئے گا۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''یہ سب کہنے کی باتیں ہیں۔ جب کوئی شہزادہ زندگی میں آئے گا تب پتا چلے گا کہ خیالات اور جذبات اچانک ہی کیسے بدل جاتے ہیں؟''

وہ بہن کی بات سن کر سوچ میں پڑ گئی۔ ''کیا ایسا ہوگا، کوئی میری زندگی میں آئے گا تو میں تمام نفرتوں کو بھلا کر اسے سینے سے لگالوں گی؟ ہاں، کوئی تو ہے جو کبھی کبھی مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتی ہوں مگر وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟''

وہ جتنا سوچتی تھی اتنا ہی الجھتی چلی جاتی تھی لیکن دل کے نہاں خانے میں آنے والے

اجنبی کی کوئی تصویر نہیں ابھرتی تھی۔ آج بھی وہ سوچوں میں ڈوبتی اور اُبھرتی رہی، مشتاق کے الفاظ کانوں میں گونج رہے تھے۔ ''تم کسی کی محبت میں ایسی اندھی ہو جاؤ گی کہ دیوانگی کی حدود کو چُھونے لگو گی۔''

کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو اس نے سر جھٹک کر سوچا۔ ''اونہہ! مشتاق نے مجھے بے وقوف بنایا ہے۔ کوئی میری زندگی میں آئے گا ہی نہیں تو محبت کیسے ہوگی؟''

وہ گھر پہنچی تو نیلو اس کی منتظر تھی۔ اس کے ہاتھ کو تھام کر بولی۔ ''یہ کیا؟ ادھوری مہندی؟''

وہ منہ بنا کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ نیلو نے اس کے برابر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا بات ہے منہ کیوں اُترا ہوا ہے؟''

وہ اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلا کر بولی۔ ''مشتاق نے کہا ہے، میں کسی کی محبت میں اندھی ہونے والی ہوں اور اس محبت میں دیوانگی کی حدوں کو چُھونے والی ہوں۔ ذرا غور سے دیکھیں باجی! کیا میری کوئی لکیر ایسا کہہ رہی ہے؟ اگر کہہ رہی ہے تو مجھے بتائیں، میں ابھی اسے چھری سے کاٹ ڈالوں گی۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''میری جان! پہلی بات تو یہ کہ مجھے ہاتھ دیکھنا نہیں آتا اور اگر تمہاری کوئی لکیر ایسا کہہ رہی ہے تو کیا ہوا؟ کوئی نہ کوئی تو تمہاری زندگی میں آئے گا۔ یہ تو اچھی بات ہے کہ تم اسے جی جان سے چاہو گی۔''

وہ ایک دم سے چیخ کر بولی۔ ''نہیں! میری زندگی میں کوئی نہیں آئے گا۔ میں کسی سے محبت نہیں کروں گی۔''

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے چھوٹی بہن کو دیکھا پھر آہستگی سے کہا۔ ''میں تمہاری فطرت سے واقف ہوں لیکن اس کے باوجود کوئی تو ہوگا جسے تم ٹوٹ کر چاہو گی۔ محلے والوں سے سنا ہے اور میں نے خود بھی آزمایا ہے مشتاق کی پیش گوئیاں کسی حد تک سچی ہوتی ہیں۔''

اس نے پریشان ہو کر اسے دیکھا۔ وہ اس کا ہاتھ دباتے ہوئے بولی۔ ''دنیا کے سارے مرد ہمارے ابو جیسے نہیں ہوتے۔''

اس نے حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ ''کیوں نہیں ہوتے؟ تمہیں دن رات کھلونا بنانے والے یہ بے غیرت مرد ہی تو ہوتے ہیں۔ اپنی بیویوں، بچوں اور اپنے گھر والوں سے چھپ کر منہ کالا کرتے ہیں اور گھر پہنچتے ہی پارسا بن جاتے ہیں، غیرت مند بن جاتے ہیں۔

اگر ایسے ہی دوغلوں کا نام مرد ہے تو مجھے ان سے نفرت ہے جو کبھی ختم نہیں ہوگی، ہمیشہ رہے گی۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''میں سمجھا نہیں سکتی۔ تمہیں آنے والا وقت ہی بتائے گا کہ کوئی کیسے دبے قدموں دل میں اُتر جاتا ہے؟ پورے وجود پر چھا جاتا ہے؟ ایسے وقت اپنی سوچ، اپنا نظریہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ بھی دوسرے مردوں کی طرح ہی ہوگا لیکن تمہیں سب سے منفرد لگے گا۔''

اس نے ایک نظر بہن پر ڈالی پھر اپنی ہتھیلی کو دیکھنے لگی، لکیروں کے جال میں اس لکیر کو ڈھونڈنے کی کوشش کرنے لگی جس سے یہ ثابت ہو رہا تھا کہ وہ آئندہ کسی کی محبت میں گرفتار ہونے والی ہے۔

نیلو نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ ''وہ آنے والا آئے گا، تم اپنی لکیریں کاٹ کر اس کا راستہ نہیں روک سکو گی۔''

وہ قائل ہونے کے انداز میں بہن کو دیکھ رہی تھی۔ یہ بات سمجھ میں آ گئی تھی کہ جس کی پسلی سے پیدا ہوئی ہے وہ اس کی زندگی میں ضرور آئے گا۔ اس کے اندر اُس آنے والے اجنبی کو دیکھنے اور جاننے کا تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ جس کی محبت میں ڈوب کر وہ عشق کی معراج حاصل کرنے والی تھی۔

☆======☆======☆

سنگھار کیا ہے؟ کیوں کیا جاتا ہے؟ کیا حسن کو چار چاند لگانے کے لیے؟ حسنِ نظر کو جلا بخشنے کے لیے؟ شاعروں کی پرواز کو پَر دینے کے لیے یا بازار میں بیٹھ کر خریداروں میں اضافہ کرنے کے لیے؟

وہ تولیے سے منہ ہاتھ پونچھتی ہوئی واش روم سے باہر آئی۔ آج ابا میاں نے پھر اسے پیار سے پچکار کر کہا تھا۔ ''بیٹی! ذرا بیٹھک کی صفائی ستھرائی کر دینا، ایک بہت ہی مالدار بندہ آنے والا ہے۔''

نیلو نے بڑے دکھ سے اور ناگواری سے ابا کہلانے والے اس شخص کو دیکھا۔ وہ منہ کھول کر ایسے مسکرا رہا تھا جیسے گٹر کا ڈھکن کھل گیا ہو۔ ایسے وقت اسے دیکھ کر گھن آتی تھی۔ وہ منہ پھیر کر بولی۔ ''کتنی بار کہا ہے، مجھے بیٹی نہ بولا کرو۔ جب بھی بولتے ہو، مجھے پتھر لگتا ہے۔''

اس کا مسکراتا ہوا، کھلا ہوا منہ بگڑ گیا۔ وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ''کیا تجھے بیٹی بو

سے مجھے دھن دولت مل جاتی ہے؟ اپنی بہن کو لے کر کہیں چلی جا...... مگر کہاں جائے گی؟ جہاں بھی جائے گی، وہاں منہ کالا کر کے ہی پیٹ بھرنا ہوگا۔ یہاں گھر کی چار دیواری میں عزت بنی رہتی ہے اور میں چھت بن کر سایہ کرتا رہتا ہوں۔ باہر سے بدنامی کا کوئی پتھر نہیں آنے دیتا۔"

وہ غصے سے ایسے بول رہا تھا، جیسے بیٹی نے پتھر مارا ہو۔ "میں جو کرتا ہوں، تم کو اچھا کھلانے، اچھا پہنانے کے لیے کرتا ہوں۔ کل سے گھر میں راشن نہیں ہے۔ پرچون والے نے ادھار دینے سے انکار کر دیا ہے۔ فاخرہ جاتی، ذرا مسکرا کر بولتی تو وہ مہینے بھر کا راشن گھر پہنچا کر جاتا۔"

وہ ایک دم سے چیخ کر بولی۔ "کتنی بار کہا ہے، فاخرہ مسکراہٹ بیچنے نہیں جائے گی۔ ماؤں اور بیٹیوں کی مسکراہٹوں میں ایک حیا آمیز پاکیزگی ہوتی ہے لیکن تم نے اس پاکیزگی کو سکہ رائج الوقت بنا دیا ہے۔"

باپ نے ناگواری سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "ایسا نہ کرتا تو فاقوں کی نوبت آ جاتی۔"

وہ بڑے دکھ سے بولی۔ "یوں روز روز مرنے سے بہتر ہوتا کہ ہم فاقوں سے ہی مر جاتے۔"

وہ چڑ کر بولا۔ "تو کس نے روکا ہے؟ جاؤ مر جاؤ۔ زہر کھا لو، پنکھے سے لٹک جاؤ، گلے پر چھری پھیر لو، تم کیا سمجھتی ہو، تمہارے بعد میں بھوکوں مر جاؤں گا؟ تمہاری ماں زہر کھا کر مر گئی مجھے اس کی موت سے کوئی فرق نہیں پڑا، تم کیا چیز ہو؟ ایک در بند، ہزار در کھلے۔ فاخرہ سیانی ہو گئی ہے۔ وہ میرے بڑھاپے کی لاٹھی بنے گی۔"

وہ تنبیہ کے انداز میں انگلی دکھاتے ہوئے بولی۔ "میں پہلے بھی کہہ چکی ہوں، تم فاخرہ کے لیے ایسا سوچو گے بھی نہیں۔ سوچو گے تو...... تو......"

"تو کیا کر لے گی تُو؟ وہ میری بیٹی ہے۔ میرے نطفے سے ہے، میں اس کا مالک و مختار ہوں، جو میں چاہوں گا کروں گا۔ اپنی زمین جائیداد رکھوں یا بیچ دوں؟ کوئی میرا ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہے۔"

وہ بڑے دکھ، بڑے غصے سے اسے دیکھنے لگی، ایسے دیکھنے لگی، جیسے منہ سے نہیں، نظروں سے اس پر تھوک رہی ہو۔ وہ بڑے صبر و ضبط سے الفاظ چبا چبا کر بولی۔ "تم نے امی کے بعد مجھے اپنی خود غرضی کی بھینٹ چڑھا دیا۔ یہی بہت ہے۔ انہوں نے بے وقوفی کی جو

زہر کھا کر مر گئیں۔ میں ایسی نادانی نہیں کروں گی۔ فاخرہ پر کسی کا سایہ بھی نہیں پڑنے دوں گی۔ تمہارے دماغ اور ضمیر میں جتنی غلاظتیں بھری ہوئی ہیں، میں ان سے اپنی بہن کو آخری دم تک بچاتی رہوں گی۔"

وہ حقارت سے یوں مسکرانے لگا، جیسے اس کے ارادوں کو چیلنج کر رہا ہو۔ فاخرہ کمرے کے دروازے سے ٹیک لگائے ان کی باتیں سن رہی تھی اور اپنی باجی پر دل ہی دل میں قربان ہو رہی تھی۔ بڑی بہنیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جن کی محبت اور ممتا، ماں کی کمی کا احساس نہیں ہونے دیتیں۔

نیلو آنگن میں تھی۔ باپ سے اپنی بہن کے لیے لڑ رہی تھی۔ باپ کا نام بھولے خان تھا۔ وہ پیدائش کے وقت بھی بھولا نہیں تھا۔ بعض بچے پیٹ سے نکلتے ہی اپنے تیور دکھا دیتے ہیں۔ وہ بھی کچھ ایسا ہی تھا، یوں دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا، جیسے نادیدہ ضروریات سے مول تول کر رہا ہو۔ بچے کے تیور کیسے ہی کیوں نہ ہوں، ماں باپ کو پیارے اور معصوم لگتے ہیں۔ وہ اپنے ماں باپ کو ایسا ہی لگا، اس لیے اس کا نام بھولے خاں رکھ دیا گیا۔

وہ حقارت بھری نظروں سے باپ کو گھورتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ دل نہ چاہے تب بھی اسے آنے والے کے لیے سجنا سنورنا تھا۔ وہ دلبرداشتہ سی ہو کر آئینے کے سامنے آ گئی۔ اسے سنگھار کرانے والا ایک چھوٹا سا آئینہ دیوار سے لگا ہوا تھا، درمیان سے تڑخ گیا تھا۔ یہ اندر سے زخمی تھی، وہ باہر سے زخم خوردہ تھا۔ وہ سنگار کے لیے رُوبرو آتی تو اس کے چہرے کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ پیش گوئی کرتا تھا، سنگھار کے بعد بھی اسے ٹوٹنا اور بکھرنا ہے۔

فاخرہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی ایک چارپائی پر آ کر بیٹھ گئی، سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ نیلو نے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اس کی خاموشی سمجھا رہی تھی کہ وہ کسی سوچ میں گم ہے؟ نیلو نے کوئی سوال نہیں کیا دوبارہ سر گھما کر ٹوٹے ہوئے آئینے سے جڑ گئی۔

دنیا کی ہر عورت صرف اپنے چاہنے والے کے لیے سنگھار کرنا چاہتی ہے۔ اس کے دل میں بھی یہ حسرت انگڑائی لیتی تھی کہ اس کا کوئی ایک قدر داں ہو، جو اس کے روپ سنگھار کو جی بھر کر دیکھے پھر اسے سنگھار سمیت بڑے پیار سے تہس نہس کر دے۔

حسرت اس غنچے پہ، بے چاری سوچتی رہتی تھی، مرجھاتی رہتی تھی۔ ہتھیلی پر جو لکیریں کھنچ

دی گئی تھیں، ان پر چلتی رہتی تھی، ہانپتی رہتی تھی۔ خدا سے مایوس نہیں تھی، وہ سب کا خدا ہے۔ سب کے دن پھیرتا ہے۔ اس کا ایمان تھا کہ وہ رب العزت اسے بھی عزت دے گا اور جب اس کے دن پھریں گے تو پھر چھوٹی بہن کو اس کی طرح بدترین حالات سے گزرنا نہیں پڑے گا۔

فاخرہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، وہ ہونٹوں پر سرخی لگا رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ''باجی ایک بات کھٹکتی ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ ہم اس کی سگی بیٹیاں ہیں؟''

اس نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ ''یہ ہماری بدنصیبی ہے۔''

''تمہارے ساتھ جو ہو رہا ہے، اسے دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ یہ باپ نہیں ہے، پاپ ہی پاپ ہے۔''

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''تم نے سنا ہوگا، بلا اپنے ہی بچوں کو کھا جاتا ہے۔ بلی نوزائیدہ بچوں کو چھپاتی اور بچاتی پھرتی ہے۔ امی ہوتیں تو ہمیں بھی اپنے آنچل میں چھپائے رکھتیں۔''

یہ باپ ہی ہمارے آنچل نوچ رہا ہے۔ ایسے ہی وقت کہتے ہیں......

ہمیں اپنوں نے ڈبویا غیروں میں کہاں دم تھا
میری کشتی وہاں ڈوبی جہاں پانی کم تھا

اس نے بڑی حسرت سے پوچھا۔ ''کیا تم اپنی کشتی کو کسی طرح بچا نہیں سکتیں؟''

وہ بالوں کو سمیٹ کر جوڑا بناتے ہوئے بولی۔ ''بہت سوچتی ہوں۔ کیسے کیسے خواب دیکھتی ہوں، یہ میرا خدا ہی جانتا ہے۔''

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی۔ ''بہت وقت گزر گیا ہے۔ کوئی چاہنے والا، ہاتھ تھامنے آئے گا تو میں اس کے قابل نہیں رہوں گی۔ ٹوٹے ہوئے آئینے کو لاکھ جوڑوں...... جا نہیں سکتا کبھی شیشے میں بال آیا ہوا۔''

فاخرہ نے سوچتی ہوئی نظروں سے بہن کو دیکھا پھر کہا۔ ''مجھے یہ سوچ کر بہت دکھ ہوتا ہے کہ تم میری وجہ سے یہ ذلت آمیز زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئی ہو۔''

اس نے بڑے پیار سے چھوٹی بہن کو دیکھا۔ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے قریب آئی پھر اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے بولی۔ ''اور مجھے یہ سوچ کر خوشی ہوتی ہے کہ میں کیچڑ میں رہنے والے اس کنول کو آلودگی سے بچا رہی ہوں۔''

وہ اس سے لپٹ کر بولی۔ ''ڈھال بننے والے اندر سے کیسے زخمی ہوتے ہیں، یہ میں دیکھ رہی ہوں۔ دل میں اندیشے ڈراتے ہیں۔ یہ سوال کچوکے لگاتا رہتا ہے کہ کب تک ڈھال بنی رہو گی؟''

اس نے بزرگانہ انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''جب تمہیں دلہن بنا کر اس جہنم سے رخصت کروں گی، تب سارے اندیشے ختم ہو جائیں گے۔''

فاخرہ نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا شادی کرنا، کسی مرد کے رحم و کرم پر رہنا ضروری ہے؟''

''ہم مردوں کی بنائی ہوئی دنیا میں رہتی ہیں، ان سے سمجھوتا کر کے ہی زندگی گزاری جا سکتی ہے۔''

''اگر میں کہیں ملازمت کر لوں۔ کسی مرد کی محتاج نہ رہوں تو؟''

''تو باپ کہلانے والا باپ تمہاری ساری تنخواہ شراب میں گھول کر پی جائے گا۔ تمہیں میری پستیوں کی طرف دھکا ضرور دے گا۔'' پھر وہ اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے بولی۔ ''میں اپنے طور پر تو تمہیں ابا سے دور کرنے کی تیاری کر رہی ہوں مگر تمہاری فطرت سے خوف زدہ ہوں۔ سچ بتاؤ، شادی سے انکار تو نہیں کرو گی نا؟''

وہ کچھ دیر تک خاموش رہی پھر بولی۔ ''تم میری خاطر روز مرتی رہتی ہو۔ کوئی لڑکی فطرتاً بے حیا نہیں ہوتی، تم بھی نہیں ہو لیکن مجھے محفوظ رکھنے اور ابا کے ناپاک ارادوں سے بچانے کے لیے اپنے اندر کی عورت کو زخمی کرتی رہتی ہو۔'' وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ''اگر مجھے دلہن بنانے اور میرا گھر بسانے کے بعد تمہیں ایسی زندگی سے نجات مل سکتی ہے تو میں تمہاری خاطر اپنے مزاج کے خلاف کسی مرد پر بھروسا کروں گی۔ تم جو کہو گی، وہ کروں گی۔''

نیلو نے خوش ہو کر اسے دیکھا پھر اسے بازوؤں میں بھر کر اس کی پیشانی کو چوم لیا۔

ایسے ہی وقت باپ نے دروازے پر آ کر کہا۔ ''کیا ہوا؟ ابھی تک تیار نہیں ہوئیں؟ مہمان آنے ہی والا ہوگا۔ بیٹھک کی صفائی بھی کرنی ہے۔ جلدی کرو۔''

انہوں نے ناگواری سے اسے دیکھا پھر نیلو اپنی جگہ سے اٹھ کر بیٹھک میں چلی گئی۔ شکستہ دلی سے سوچنے لگی، باپ تو بیٹیوں کی ڈولیاں سجاتے ہیں، انہیں ایک ہی بار سہاگن بنا کر دینی اور شرعی طور پر گھر سے رخصت کرتے ہیں لیکن وہ تو ہر رات مجھے کسی کی بیوی بناتا ہے اور میں ہر صبح بیوہ بن جایا کرتی ہوں۔

اس نے نیلوفر کے جانے کے بعد فاخرہ کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔ ''یہ بہت خود سر ہوتی جا رہی ہے۔ ابھی تم نے دیکھا۔ مجھ سے کیسی زبان درازی کر رہی تھی؟ غصہ تو اس کی ناک پر دھرا رہتا ہے، میں نے اسی لیے اس کے سامنے کچھ نہیں کہا، اب کہہ رہا ہوں۔ ذرا تم بھی تیار ہو جاؤ۔''

اس نے ایک دم سے چونک کر اسے دیکھا پھر پوچھا۔ ''میں تیار ہو جاؤں؟ کیوں؟ کس لیے؟''

وہ چور نظروں سے دروازے کی طرف دیکھ کر دھیرے سے بولا۔ ''وہ دراصل آنے والے مہمان کے ساتھ ایک اور مہمان بھی آئے گا۔ کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔ بس تمہاری اس سے ملاقات کرانی ہے۔ میں نے یہ بات نیلو سے چھپائی ہے۔''

وہ ناگواری سے بولی۔ ''کیوں چھپائی ہے۔''

''وہ بات یہ ہے کہ...... کہ وہ تمہاری خوب صورتی سے جلتی ہے، اسی لیے کسی سے تمہارا سامنا نہیں کراتی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ تم اس سے آگے بڑھو۔ کسی نہ کسی بہانے تمہارا راستہ روکتی رہتی ہے۔ اسی لیے کہتا ہوں، تم بھی اسے نہ بتاؤ۔ اچانک معلوم ہوگا تو پھر وہ کچھ نہیں کر سکے گی۔''

اس نے قہر آلود نظروں سے باپ کو گھورا۔ اس وقت وہ محض ایک قصائی تھا۔ اپنی بیٹیوں کو خود غرضی کی چھری تلے رکھنے کے داؤ پیچ خوب جانتا تھا۔ وہ بیٹیاں نہیں پالتا تھا، گھر میں بکریاں باندھ کر رکھتا تھا۔ اس سے پہلے کہ ایک بیمار یا بوڑھی ہو اور دودھ دینا بند کر دے، وہ دوسری کو روزگار کی سان پر چڑھا دینا چاہتا تھا۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کھڑی ہوگئی۔ اسے گھورتی ہوئی کمرے سے باہر جانے لگی۔ اس نے ہاتھ پکڑ لیا۔ ''کہاں جا رہی ہو؟ پوری بات تو سن لو۔ تم میری لاڈلی بیٹی ہو۔ میں نیلو سے زیادہ تمہیں چاہتا ہوں۔ آج جو بندہ آ رہا ہے، وہ صرف مالدار ہی نہیں ہے، بلکہ بہت ہی سیدھا شریف بندہ ہے۔''

اس نے ایک جھٹکے سے اپنا ہاتھ چھڑاتے ہوئے چڑچڑے لہجے میں کہا۔ ''کیا وہ شریف بندہ میرے ساتھ نماز پڑھنے آ رہا ہے؟ تمہیں شرم نہیں آتی؟ کیسے باپ ہو، ایک کے بعد دوسری بیٹی کو مالِ غنیمت سمجھ رہے ہو۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''میں کسی غلط ارادے سے یہ ملاقات نہیں کرا رہا ہوں۔ تمہاری اس

سے شادی کرانا چاہتا ہوں۔ تمہارا گھر بسانا چاہتا ہوں۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''پہلی بار تم نے باجی سے بھی یہی کہا تھا۔ انہیں فریب میں رکھ کر ایک شخص سے ملاقات کرائی تھی پھر کیا ہو رہا ہے؟ تمہاری خود غرضی انہیں کہاں سے کہاں پہنچا رہی ہے؟''

''اس کی بات نہ کرو۔ اس کا تو مقدر ہی خراب تھا۔ تم خوب صورت ہو، تمہارا نصیب بھی خوب صورت ہوگا۔''

وہ حقارت سے بولی۔ ''جن بیٹیوں کا باپ تم جیسا ہو، وہ کبھی خوش نصیب نہیں ہو سکتیں۔''

''یہ نیلو میرے خلاف زہر اگلتی رہتی ہے۔ اس لیے تم مجھے بے ایمان اور بے غیرت سمجھ رہی ہو۔ میں تمہارا باپ ہوں۔ تمہیں عزت آبرو سے دلہن بنا کر اس گھر سے رخصت کرانا چاہتا ہوں۔'' وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بڑے پیار سے پچکارتے ہوئے بولا۔ ''چلو تیار ہو جاؤ۔''

وہ غصے سے کھول رہی تھی۔ باپ کا ہاتھ سر پر کسی گندی نالی کے کیڑے کی طرح رینگ رہا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر جانے لگی۔ وہ پیچھے سے چوٹی پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔ ''ابھی چار پیسے کما کر نہیں دیئے ہیں اور بڑی بہن کی طرح نخرے دکھا رہی ہے۔ میں ٹیڑھی انگلی سے گھی نکالنا خوب جانتا ہوں۔ چل تیار ہو جا۔''

اس نے ناگواری سے سر گھما کر اسے دیکھا، اس کی نگاہوں میں عجیب سی شیطانیت ناچ رہی تھی۔ مرد ذات سے نفرت کرنے والی ایسے وقت بھر گئی۔ وہ لاتوں کا بھوت تھا، باتوں سے جانے والا نہیں تھا۔

اس نے لاتیں نہیں چلائیں، پلٹ کر ایک ہاتھ اس کے منہ پر جڑ دیا۔ وہ ایک دم سے بوکھلا کر دو قدم پیچھے چلا گیا، بے یقینی سے بیٹی کو دیکھنے لگا۔ وہ اسی کا لہو تھی، اور لہو نے اپنا رنگ دکھا دیا تھا۔ باپ رشتوں کو پامال کرتا رہتا تھا۔ آج بیٹی بھی اس کے نقشِ قدم پر چلتی ہوئی رشتوں کے تقدس کو بھول گئی تھی۔

وہ حقارت بھرے لہجے میں بولی۔ ''گدھ مردار کو نوچتے ہیں، لیکن تم ان سے بھی گئے گزرے ہو، اپنی جیتی جاگتی بیٹیوں کو نوچ رہے ہو۔ دنیا کی کسی شریف زادی نے اپنے باپ پر ہاتھ نہیں اٹھایا ہوگا مگر تم نے مجھے ایسی گستاخی کرنے پر مجبور کر دیا۔''

اس کی ایسی توہین کبھی نہیں ہوئی تھی۔ بیوی جب تک زندہ رہی اس کے فیصلوں کے سامنے سر جھکاتی رہی۔ بڑی بیٹی بھی اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزار رہی تھی لیکن چھوٹی نے تو جیسے اس کے ہوش اُڑا دیئے تھے۔ وہ ذلت کے احساس سے غراتا ہوا قریب آیا، اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک زور کا جھٹکا دیتے ہوئے بولا۔ ''کمینی! تُو نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا؟''

وہ تکلیف کی شدت سے چیخ پڑی۔ نیلو بیٹھک میں تھی، اس کی چیخ سن کر دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی۔ وہاں کا منظر دیکھتے ہی ٹھٹک گئی۔ پل بھر کو یوں لگا جیسے اس کی جان باپ کی مٹھی میں آ گئی ہو۔

وہ فوراً ہی لپک کر ان کے قریب آئی، اس کے بالوں کو باپ کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔ ''یہ کیا کر رہے ہو؟ چھوڑو اسے......''

وہ اسے چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے اندر کا فرعون کہہ رہا تھا، بغاوت کو اُبھرنے سے پہلے ہی کچل دینا چاہیے۔ باپ کا رعب اور دبدبہ ان پر بچپن سے تھا، اسے جوانی کی آخری کمائی تک قائم رہنا چاہیے۔ وہ آج ثابت کر دینا چاہتا تھا کہ باغی بیٹیوں کی پٹائی کر سکتا ہے۔ جبراً ان سے احکامات کی تعمیل کرا سکتا ہے۔

نیلو اس کے جبر سے بہن کو بچانا چاہتی تھی۔ اس نے فاخرہ کے منہ پر ہاتھ مارا تو اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ''بس کر۔ اگر تُو نے اسے ہاتھ بھی لگایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔''

وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر غرایا۔ ''مجھے دھمکی دیتی ہے؟ کیا کر لے گی تُو؟''

''آج جسے تُو لا رہا ہے، اس کے منہ پر تھوک دوں گی۔ آج محلے والوں سے چیخ چیخ کر کہوں گی کہ یہاں تیرے دوست اور مہمان نہیں آتے ہیں، بیٹیوں کے گاہک آتے ہیں۔''

بڑی بیٹی کے باغیانہ انداز نے اسے چونکا دیا۔ فوراً ہی عقل نے سمجھایا کہ یہ چلتا ہوا سکہ رکے گا تو زندگی کی گاڑی رک جائے گی۔

فرعونیت ڈھیلی پڑ گئی۔ وہ ذرا پیچھے ہٹ گیا مگر جھنجلا کر بولا۔ ''تُو کیا سمجھتی ہے، میں تیری دھونس میں آ جاؤں گا۔ میں دیکھ لوں گا، تجھے بھی اور اسے بھی......تُو نے ہی اسے سر پر چڑھایا ہے۔ اسے میرے خلاف بھڑکاتی رہتی ہے۔''

فاخرہ نے غصے سے پاؤں پٹخ کر کہا۔ ''یہ مجھے کیا بہکائیں گی؟ میں نادان بچی نہیں ہوں۔ اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہوں۔ تم باپ نہیں ہو، شیطان ہو۔ بلکہ شیطان بھی تمہیں دیکھ

کر کان پکڑتا ہوگا۔''

وہ ایک ہاتھ فضا میں بلند کرتا ہوا اسے مارنے کے لیے آگے بڑھا۔ نیلو نے اس کے سامنے ڈھال بنتے ہوئے کہا۔ ''کیا سچ برداشت نہیں ہو رہا ہے؟''

اس کا ہاتھ اٹھا کا اٹھا رہ گیا۔ وہ ہاتھ بڑی بیٹی پر پڑتا تو گویا اپنے ہی منہ پر پڑتا۔ وہ پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''تُو ہی فساد کی جڑ ہے۔ میں تجھے ایسی جگہ لے جا کر ماروں گا، جہاں پانی بھی نہیں ملے گا۔''

''میں ایسی ہی جگہ مرتی رہتی ہوں۔ تُو مجھے زندگی کی کربلا میں مارتا رہتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا کرے گا؟ مگر ایک بات یاد رکھنا، جب تک میں زندہ ہوں۔ فاخرہ پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گی۔''

وہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولا۔ ''زیادہ ڈائیلاگ نہ بول۔ یہ میرا گھر ہے، یہاں وہی ہوگا جو میں چاہوں گا۔ یہ تیری بہن بعد میں ہے، میری بیٹی پہلے ہے۔ میں سیاہ کروں یا سفید تیرا اس معاملے سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔''

وہ اسے دھکا دیتا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ فاخرہ نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ''میں اسے قتل کر دوں گی۔''

''غصہ کرنے سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ تجھے بدترین حالات کو سمجھنا ہوگا۔ میری باتوں پر عمل کرنا ہوگا۔ ورنہ یہ قصائی کوئی بھی سخت قدم اٹھا سکتا ہے۔''

اس کی بات سنتے ہی دل ڈوبنے لگا۔ صورتِ حال ایسی تھی کہ وہ کوئی حجت نہیں کر سکتی تھی۔ سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے بولی۔ ''آپ کی بات مان لینے سے کوئی برات لے کر نہیں آ جائے گا۔ سب ہی ہمارے شرابی باپ کو جانتے ہیں۔ کوئی مجھے اپنے گھر کی بہو نہیں بنائے گا۔''

وہ تائید میں سر ہلا کر بولی۔ ''ہاں یہ تو ہے۔ ہمارے حالات ایسے ہیں کہ کوئی رشتہ مانگنے نہیں آئے گا۔ باہر سے پتا چل جاتا ہے کہ گھر اندر سے کھوکھلا ہے۔ لڑکی جہیز میں ایک تنکا نہیں لائے گی۔ تم خوب صورت ہو مگر شادی کے لیے لڑکی کی خوب صورتی نہیں دیکھی جاتی۔ کاش کوئی ایسا ہو جو تمہیں چار کپڑوں میں قبول کر لے۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''ایسی بے وقوفی تو کوئی دیوانہ ہی کر سکتا ہے۔''

نیلو سوچنے کے انداز میں اس سے ذرا دور گئی پھر پلٹ کر بولی۔ ''تمہارا دیوانہ میری

نظروں میں ہے۔''

اس نے پُرتجسس انداز میں پوچھا۔''کون ہے وہ؟''

وہ قریب آ کر بولی۔''وہی جس نے پیش گوئی کی تھی کہ تم کسی سے محبت کرو گی اور اس کی محبت میں اندھی ہو کر دیوانگی کی حدود کو چھونے لگو گی۔''

وہ منہ بنا کر بولی۔''ضروری تو نہیں کہ جس نے پیش گوئی کی ہے، میں اسی سے شادی کرلوں۔''

وہ سنجیدگی سے بولی۔''خواہ مخواہ انجان نہ بنو۔تم اچھی طرح جانتی ہو کہ وہ تمہارا دیوانہ ہے۔وہی تمہیں اس جہنم سے نجات دلا سکتا ہے۔''

وہ سر جھکا کر سوچنے لگی۔تصور میں مشتاق کی صورت ابھر رہی تھی اور ساتھ ہی ساتھ یہ سوچ بھی جنم لے رہی تھی۔''کیا یہی وہ درخت ہے، جس کی شاخوں میں میرے پیار کی پتنگ اٹکنے والی ہے؟''

اس نے بے اختیار اپنے ہاتھ کو دیکھا، جس کی لکیر پڑھ کر مشتاق نے پیش گوئی کی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ کو تھام کر سوچا......''اس نے تو میری زندگی میں آنے سے پہلے ہی اس ہاتھ کو تھام لیا تھا۔''

وہ اپنی ہتھیلی کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے سہلانے لگی۔ایسے وقت یاد آیا کہ وہ دایاں ہاتھ دیکھنا چاہتا تھا لیکن اس نے ایسا ہاتھ دکھایا تھا کہ وہ محبت کرنے والا کسی بھی لڑکی کا ہاتھ دیکھنا بھول گیا ہوگا۔

شام سے رات ہوئی اور رات سے صبح ہوگئی۔اس عرصے میں وہ نہ جانے کس دنیا میں کھوئی رہی؟ دل میں یہ تجسس چٹکیاں بھرتا رہا، کیا شادی کے بعد وہ اس مرد سے محبت کرنے لگے گی؟

ان تمام خیالات کے باوجود ایک بات ایسی تھی جو اسے الجھا رہی تھی، سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔وہ اپنے اندر جس اجنبی کو محسوس کرتی رہتی تھی، وہ مشتاق نہیں لگتا تھا۔نہ جانے وہ کون تھا جو اس کے اندر موجود رہتے ہوئے بھی اجنبی سا تھا۔وہ الجھتی رہی، اپنے آپ کو ٹٹولتی رہی لیکن عجیب سی گتھی تھی، سلجھنے سے زیادہ الجھ رہی تھی۔

☆======☆======☆

رات کا سیاہ آنچل اِدھر سے اُدھر تک پھیلا ہوا تھا۔ننھے ننھے ستارے اپنی مدھم مدھم سی

روشنی میں اس کے چہرے کو کسی حد تک واضح کر رہے تھے۔اسے یاد نہیں تھا کہ چاند کی آخری تاریخیں ہیں۔اسے تو ہر رات اپنی آخری رات لگتی ہے۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنے آس پاس دیکھا۔

ہر طرف خاموشی، سناٹا تھا۔اسے اپنی گہری سانس سسکتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔وہ چھت پر تھی۔وہاں پڑی ہوئی شکستہ چارپائی کو دیکھ رہی تھی۔وہ چارپائی اس کی جواں حسرتوں کی طرح جگہ جگہ سے ادھڑی ہوئی تھی۔بے دردی سے استعمال کیے جانے پر دہائی دے رہی تھی۔بیٹھنے والے بیٹھ کر اور لیٹنے والے لیٹ کر جا چکے تھے اور اسے عبرت ناک بنا چکے تھے۔

وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس کے ایک سرے پر آ کر بیٹھ گئی۔تمام تر شکستگی کے بعد بھی وہ اس قابل تھی کہ غموں سے شکستہ اور زندگی کی مسافت سے تھک جانے والے کے لیے کسی حد تک سہارا بن سکتی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا، ستاروں کی برات سجی ہوئی تھی، رات دلہن بنی ہوئی تھی مگر اس کا دولہا نہ جانے کہاں تھا؟ وہ جہاں دیکھ رہی تھی، وہاں اپنے ہی حالات دکھائی دے رہے تھے۔اس نے آنکھیں موند لیں، چھوٹی بہن فاخرہ کا چہرہ دکھائی دینے لگا۔وہ بند آنکھوں کے پیچھے دلہن کے روپ میں تھی، شرما کر مسکرا رہی تھی۔

اس نے اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔آج اس کنول جیسی بہن کو کیچڑ سے نکال کر اسے پیا دیس سدھار کر خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی پھر بھی کہیں کوئی بوجھ تھا جو اسے تھکن کا احساس دلا رہا تھا۔وہ خود کو ٹٹولنے لگی۔

اپنا محاسبہ کرنے میں ذرا دیر لگتی ہے۔کچھ دیر بعد ہی گھائل روح کا ایک ایک زخم واضح ہونے لگا۔اس نے افسردگی سے سوچا۔''میں کون ہوں؟ کیا ہوں؟ کچرا گھر ہوں، جہاں سے گزرنے والے گزرتے تو ہیں مگر پلٹ کر پھر نہیں دیکھتے۔''

اس نے سرد آہ بھر کر یوں آنکھیں کھول دیں۔آنکھیں تو اسی رات کھل گئی تھیں، جب پہلی بار اسے بے حیائی کی بساط پر بچھایا گیا تھا۔رات کے سناٹے میں دل رو رہا تھا۔اس سے پوچھ رہا تھا۔''تُو کب تک خالی مکان بنی رہے گی؟ آنے والے آتے ہیں اور تیرے ماتھے پر اپنے اپنے نام کی تختی لگا کر چلے جاتے ہیں۔یہ پیشانی تختیاں لگانے کے لیے نہیں جھومر سجانے کے لیے بنی ہے۔''

اس نے بڑے دکھ سے مسکراتے ہوئے سوچا۔''آج میں نے اپنی بہن کو خوش نصیب

بنا دیا ہے، اس کی پیشانی پر جھومر سجا دیا ہے۔ مجھے یقین ہے، اس کی پیشانی پر لگنے والی مشتاق
کے نام کی تختی اسے ہمیشہ نیک نام بنائے رکھے گی۔''

چھوٹی بہن سہاگن بن چکی تھی۔ پتا نہیں وہ خوش تھی یا رنجیدہ؟ رخصتی کے بعد سے اب
تک خاموش تھی، سادگی سے نکاح یوں پڑھوایا گیا تھا جیسے کوئی جرم کیا جا رہا ہو۔ بڑی بہن کی
طرح ان کے درمیان کوئی چور رشتہ نہیں ہوا تھا لیکن بعض حالات میں جائز کام بھی چھپ چھپا
کر اور ناجائز کام ڈنکے کی چوٹ پر کیے جاتے ہیں۔ وہ شرعی طور پر اس کی زندگی میں آئی تھی
پھر بھی نیک نامی کے ڈنکے نہیں بجے۔

حجلہ عروسی میں صرف دلہن ہی نہیں سیج کی پتیاں بھی آنے والے کی منتظر رہتی ہیں کہ وہ
اجنبی آئے گا اور اپنا بن کر بڑے پیار سے ظلم کرے گا۔ ایسا ظلم کہ اسے نکھار دے گا، سنوار
دے گا۔ ایسے نکھار کو ہی کہتے ہیں۔ ''رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد۔''

مگر وہ عجیب دلہن تھی۔ اسے نہ پس جانے کی حسرت تھی، نہ سہاگن کا رنگ و روپ
حاصل کرنے کی تمنا۔ وہ بڑی بے دلی سے پھولوں کی سیج پر سر جھکائے بیٹھی تھی۔ دلہنیں آنے
والے کی منتظر رہا کرتی ہیں لیکن وہ آنے والے حالات کی منتظر تھی۔ دل دھڑکنے کے بجائے
سوال کر رہا تھا، اس سے پوچھ رہا تھا۔ ''کیا یہی وہ عاشق ہے، جس کا عشق تجھے دنیا کے ہر
رشتے کو پیچھے چھوڑ دینے پر مجبور کر دے گا؟''

اس نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔ ''ہاں شاید؟ لیکن اس کے بارے میں سوچنے
کے باوجود دل اس کی طرف مائل نہیں ہو رہا ہے۔ میں اس کا تصور کرتی ہوں مگر چند لمحوں بعد
ہی وہ پردۂ ذہن سے غائب ہو جاتا ہے۔ پتا نہیں میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونے والا
ہے؟''

دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ سوچ کا تسلسل ٹوٹ گیا، وہ فوراً ہی سنبھل
کر بیٹھ گئی۔ آنے والے کو اپنی خوش قسمتی پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔ اسے اب تک یہی لگ رہا تھا
کہ وہ ایک طویل خوش فہمی میں مبتلا رکھنے والا خواب دیکھ رہا ہے۔

مگر وہ خواب نہیں تھی، اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں کے ساتھ اس کی سیج پر تھی۔ اب اس کی
ملکیت تھی، اس پر جیسے جی چاہتا، حکومت کر سکتا تھا لیکن وہ اس سے کچھ فاصلے پر رکھی ہوئی
ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

فاخرہ نے ایک ذرا کسمسا کر پہلو بدلا۔ اس کی موجودگی سے اپنائیت محسوس نہیں ہو رہی

تھی۔ وہ نہیں لگ رہا تھا، جس کا انتظار ہاتھ کی لکیریں کر رہی تھیں۔ آنے والے کو دلہن کا
زناٹے دار ہاتھ یاد تھا۔ اس نے آگے کی طرف جھک کر کہا۔ ''آج میں اجازت کے بغیر ہاتھ
پکڑنے کی غلطی نہیں کروں گا۔ حالانکہ تم گواہوں کے سامنے تین بار قبول کر چکی ہو۔ یہ یاد
دلانے کے بعد قریب آنے کی جرأت کر رہا ہوں۔''

وہ وہاں سے اٹھ کر اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا۔ پہلی قربت کا نشہ ہی کچھ اور ہوتا ہے
لیکن فاخرہ کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہوا، نہ دل دھڑک کر حلق میں آیا، نہ کسی جواں جذبے نے
انگڑائی لی۔ اسے تو یوں لگ رہا تھا جیسے اندر کے تمام تر جذبے اچانک ہی جماہی لینے لگے
ہیں، نیند آنے کا سگنل دے رہے ہیں۔

مشتاق نے بڑی محبت سے اس ہاتھ کو تھام لیا جس کی لکیر نے یہ چغلی کھائی تھی کہ وہ
مستقبل میں عشق کی معراج حاصل کرنے والی ہے۔

وہ ہاتھ دیکھ رہا تھا اور وہ شرمندہ سی ہو رہی تھی۔ وہ کیا جانتی تھی کہ جس پر ہاتھ اٹھایا تھا،
وہ ایک دن اسے ہاتھوں ہاتھ لے گا پھر وہ ہاتھ تو کیا، کبھی اس کے سامنے سر بھی نہیں اٹھا سکے
گی۔

مشتاق نے ذرا جھک کر بڑی چاہت سے حنائی ہتھیلی کو چوم لیا۔ وہ اسے چور نظروں
سے دیکھ رہی تھی، اس کے جذبوں کو سمجھ رہی تھی اور اپنے جذبوں کو جگانا چاہتی تھی، تاکہ ایک
شریکِ حیات کی حیثیت سے اس کا ساتھ دے سکے لیکن ایسا چاہنے کے باوجود اپنے دل سے
اپنے دماغ سے سمجھوتا نہیں کر پا رہی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اس کے چہرے کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ''جب نیلو
باجی نے مجھ سے کہا کہ وہ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھوں میں دینا چاہتی ہیں تو یقین جانو، میرے تو
ہاتھوں کے طوطے ہی اُڑ گئے تھے۔''

اتنا کہنے کے بعد وہ منہ کھول کر ہنسنے لگا۔ اس نے نظریں اٹھا کر اسے دیکھا پھر ایک ذرا
ناگواری سے منہ پھیر لیا۔ ایسے وقت باپ یاد آ گیا، وہ اپنا مطلب نکالنے کے لیے اسی طرح
منہ کھول کر ہنستا تھا۔ وہ سوچنے لگی۔ ''یہ بھی مرد ہے۔ خود غرض ہے، اس نے مجھے حاصل کرنے
کے لیے اپنے گھر والوں کو چھوڑ دیا ہے۔ کیا میں ایسے مطلب پرست کی محبت میں اندھی
ہونے والی ہوں؟''

اس کے والدین اور خاندان کے دوسرے بزرگ اسے اپنی بہو نہیں بنانا چاہتے تھے۔

ایک تو وہ غریب تھی پھر شرابی اور بدخصلت باپ کی وجہ سے دونوں بہنیں بدنام تھیں۔ مشتاق تو کیا کوئی بھی اسے اپنے گھر کی عزت نہ بناتا۔

اس نے بنا لیا تھا لیکن گھر کی عزت نہ بنا سکا۔ کرائے کے ایک مکان میں لے آیا تھا۔
فاخرہ اپنی بہن کی بدنصیبی سے خوف زدہ تھی۔ دوسری غریب لڑکیوں کو بھی دیکھا تھا، ایسے غریب حسن اور غریب نوجوانی کی چکاچوند دیکھ کر جس کے منہ میں پانی آتا ہے، وہی دکھاوے کے لیے نکاح پڑھا کر لے جاتا ہے پھر دل بھرنے کے بعد پان کی پیک کی طرح گھر سے باہر انہیں تھوک دیتا ہے۔

فاخرہ نے کبھی باپ پر بھروسا نہیں کیا، پھر مشتاق جیسے دل پھینک نوجوان پر کیا بھروسا کرتی؟ بڑی بہن کے سر سے اپنا بوجھ اُتارنے کے لیے اس عاشق کے پاس آ گئی تھی۔ پتا نہیں عشق کا نشہ کب اُترنے والا تھا اور کب اس کے چہرے پر باپ کا چہرہ مکڑی کے جالے کی طرح تننے والا تھا۔

وہ منہ پھیرے سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی اور وہ اس کے حسین وجود میں کبھی ڈوب رہا تھا، کبھی ابھر رہا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بے حس وحرکت یوں لیٹی ہوئی تھی جیسے اس کے جسم میں جان نہ رہی ہو۔ دل سے جان پہچان نہ ہو تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ کتنے ہی خوب صورت لمحات کا پتا نہیں چلتا کہ وہ کیسے گزر گئے؟ اسے بھی پتا نہ چلا کہ کتنا سارا وقت گزر چکا ہے اور وہ پتھر کے بت کو پوجتے پوجتے سو گیا ہے۔

کمرے کی نیم تاریکی میں اس نے ایک گہری سانس یوں لی، جیسے اب تک سانس لینا بھولی ہوئی تھی۔ آہستہ آہستہ دل کی دھڑکنیں ابھرنے لگیں، وہ جیسے زندہ ہونے لگی۔ اس نے آنکھیں کھول کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کمرے کا ماحول وہی تھا لیکن اس کے اندر کا ماحول بدل گیا تھا۔ اس کے اندر یہ زہریلی حقیقت چیخ رہی تھی کہ اس نے بھی اپنی بہن کی طرح ایک مرد کے ساتھ رات گزاری ہے۔ بہن کو روز صبح واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ پتا نہیں وہ کب اس کی واپسی کا ٹکٹ کٹانے والا تھا؟

وہ دھیرے سے سرک کر بستر سے اُتر گئی، لباس درست کرتی ہوئی واش روم میں آ گئی۔
سامنے دیوار پر ایک بہت ہی خوب صورت سا آئینہ لگا ہوا تھا، گھر کے آئینے کی طرح زنگ آلود اور ٹوٹا ہوا نہیں تھا۔ وہ اپنے عکس کو دیکھنے لگی۔ اسے اپنا چہرہ بجھا بجھا سا کچھ مردہ مردہ سا دکھائی دیا جیسے ابھی ابھی بھوکا عیاش گدھ اسے نوچ کر گیا ہو۔

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ روتے روتے فرش پر بیٹھنے لگی، ریت کے گھروندے کی طرح بکھرنے لگی۔ جو کبھی نہ چاہا تھا وہ ہو گیا تھا۔ اسے نیلو یاد آنے لگی، وہ بڑی محبت سے اسے یاد آنے لگی۔ آج سمجھ میں آ رہا تھا کہ وہ روز کس طرح جیتی اور مرتی رہتی ہے؟ کس طرح ہر رات اپنی روح کو کچلتی رہتی ہے؟

وہ بڑی دیر تک آنسو بہاتی رہی، خود کو بہلاتی رہی، نیلو کے حوالے سے یہ سوچ کر دل کسی حد تک ہلکا ہو گیا کہ اس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد نکاح پڑھوا کر آیا ہے۔ آئندہ اس نکاح کی حرمت کب تک قائم رہے گی، یہ مشتاق کے ایمان پر تھا۔ فی الوقت وہ جیسا بھی تھا، اس کا مجازی خدا تھا۔ اس کی تنہائیوں کا ساتھی تھا، ایسا ساتھی جس کا چہرہ ہر صبح بدلنے والا نہیں تھا۔

اس کا چہرہ بدلے یا نہ بدلے مگر فاخرہ کی زندگی بدل گئی تھی، دن رات بدل گئے تھے۔ مشتاق کی بھرپور توجہ اور محبتیں پانے کے باوجود ابھی وہ مطمئن نہیں تھی۔ ایسا لگتا تھا، کہیں کوئی کمی ہے، کوئی خالی جگہ ہے، جسے پُر ہونا ہے۔ مشتاق کی پیش گوئی کو درست ہونا ہے۔
شادی سے پہلے یہ تجسس تھا کہ شاید مشتاق اس کی زندگی کا اول آخر بننے والا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ سوچ کمزور ہوتی چلی گئی۔ یہ تجسس دھیما پڑنے لگا کہ وہ کون ہے، جسے اس کے دل کی دنیا میں آنا ہے اور عشق کے ماتھے کا جھومر بننا ہے؟

☆======☆======☆

موت ایک بار آتی ہے اور سارا قصہ تمام کر کے چلی جاتی ہے لیکن زندگی بڑی ظالم ہوتی ہے، روز مارتی ہے اور روز جلاتی ہے کبھی زندگی کو جلا دیتی ہے، کبھی بجھا دیتی ہے۔ وہ موت سے نہیں، زندگی سے سہمی رہتی تھی۔
بہن کو رخصت کر کے دل مطمئن تھا لیکن تنہائی نے اسے بالکل ہی توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ آنے والوں کو جانے پر مجبور کرنے لگا تھا۔ تتلی کے رنگ اُڑ جائیں تو وہ محض ایک اُڑنے والا کیڑا بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کے پاس پرواز کے لیے پَر تو تھے مگر اب اُڑان بھرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔

باپ بری طرح جھنجلایا ہوا تھا۔ فاخرہ کی شادی نے تو جیسے اس کی تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا تھا۔ بڑھاپے کا سہارا بننے والی بیساکھی کمزور ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ ریت کو کتنا ہی کس کر مٹھی میں بند کرو، وہ عورت کی جوانی کی طرح گرفت سے نکلتی چلی جاتی ہے۔ اب وہ

ریت کا گھروندا لگنے لگی تھی۔

اس نے آنگن میں جھاڑو لگاتی نیلو کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”تُو بیٹی نہیں دشمن ہے۔ تُو نے فاخرہ کو پرائی بنا دیا ہے۔ میں اس کے دروازے پر گیا تھا، اس نے مجھے گھر میں گھسنے نہیں دیا۔ وہ میری ملکیت تھی۔ تُو نے مجھ سے پوچھے بغیر اسے اس چھوکرے کے حوالے کر دیا۔ اس گھر کی خوش نصیبی پر جھاڑو پھیر دی۔ جی تو چاہتا ہے تیرا گلا دبا دوں۔“

وہ ایک ذرا بے پروائی سے بولی۔ ”نیکی اور پوچھ پوچھ؟ دیر کیوں کرتے ہو، دبا دو میرا گلا۔ میں کوئی گلہ نہیں کروں گی۔“

وہ بے بسی سے مٹھیاں بھینچ کر اسے دیکھنے لگا۔ وہ باسی مٹھائی بنتی جا رہی تھی مگر چاندی کا ورق چڑھا دینے سے مکھیاں بھنبھناتی ہوئی آ ہی جاتی تھیں۔ وہ خود اس کے سر کا درد ہی سہی لیکن دردِ سر کا علاج بھی تھی۔ فاخرہ تو کمان سے نکلا ہوا تیر بن چکی تھی۔ اب تو اسی پر تکیہ تھا اور آنے والے دنوں کی فکر تھی، کیا کرے، کیا نہ کرے؟

اس نے ایک ذرا نرم لہجے میں کہا۔ ”دیکھ! میں تیرے ہی بھلے کے لیے سوچتا رہتا ہوں۔ فاخرہ کی کسی اچھے اور مالدار گھرانے میں شادی ہو جاتی تو تجھے سارے جھمیلوں سے نجات مل جاتی۔ اس کے ذریعے ہم باپ بیٹی کا بھی کچھ آسرا ہو جاتا۔“

وہ بڑی حقارت سے بولی۔ ”یعنی تم اس کی شادی کو کاروبار بنانا چاہتے تھے؟“

وہ بڑی ڈھٹائی سے بولا۔ ”میں تم لوگوں کی بھلائی کے لیے ہر جگہ دو پیسے کا فائدہ سوچتا ہوں۔ وہ میری پھول جیسی بیٹی تھی۔ اس چھوکرے کی جھولی میں جا کر دو کوڑی کی ہو گئی۔“

وہ جھاڑو کو فرش پر پٹختے ہوئے بولی۔ ”شادی کے بعد لڑکی کو عزت ملتی ہے۔ اس کا مان بڑھ جاتا ہے۔ وہ تو دو کوڑی کی نہیں ہوئی، البتہ تمہاری پلاننگ فلاپ ہو گئی ہے۔ اب تم ہاتھ ملنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے۔“

وہ ایک دم سے بپھر کر بولا۔ ”میرے یہ ہاتھ ملنے کے لیے نہیں، نوٹ گننے کے لیے بنے ہیں۔“

وہ اس کی طرف تھوک کر بولی۔ ”کبھی فرصت ملے تو انگلیوں پر اپنے گناہوں کا حساب کر کے دیکھ۔ تیرے نوٹوں کی گنتی ایک دن ختم ہو جائے گی مگر تیرے چہرے کی کالک کبھی ختم نہیں ہو گی۔“

اس جملے نے باپ کو اندر تک سلگا دیا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ

پر جڑ دیا۔ وہ توازن قائم نہ رکھ سکی...... لڑکھڑاتی ہوئی زمین بوس ہو گئی۔ وہ اسے ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔ ”سالی! باپ کے سامنے زبان چلاتی ہے؟ ابھی تو تھپڑ مارا ہے، کچھ اور بولے گی تو گدی سے زبان کھینچ کر ہتھیلی پر رکھ دوں گا۔“

وہ غصے سے بڑبڑاتا ہوا گھر سے باہر چلا گیا۔ وہ دھیرے دھیرے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ایسے وقت اسے رونا چاہیے تھا لیکن وہ خلافِ توقع ہنس رہی تھی اور زیرِ لب کہہ رہی تھی۔ ”مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں۔ ابا! مکافاتِ عمل اسی کو کہتے ہیں۔ اب میرے نہیں، تمہارے جلنے کڑھنے کے دن آ رہے ہیں۔ تم یہ سوچ سوچ کر سلگتے رہو کہ فاخرہ کبھی بیریر چیک نہیں بن سکے گی۔ وہ جو تمہاری قسمت کے دروازے کھول سکتی تھی۔ وہ چڑیا پھر سے اُڑ چکی ہے۔“

اس نے قہقہہ لگایا۔ فرش پر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی، دونوں بازو پھیلا کر پھرکی کی طرح گھومنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا، زمین و آسمان اس کے ساتھ گھوم رہے ہوں۔ وہ ہنس رہی تھی، جھوم رہی تھی پھر نڈھال سی ہو کر بیٹھ گئی۔ فرش پر دونوں ہتھیلیاں ٹیک کر گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ زندگی میں جو زخم لگتے رہتے ہیں، ان سے مسرتوں کے لمحات میں بھی ٹیسیں اٹھتی رہتی ہیں۔ اسی لیے وہ تھک کر بیٹھ گئی تھی، زخموں کے ساتھ خوشیاں بھی ہانپ رہی تھیں۔

وہ کچھ دیر تک بیٹھی رہی، گزرتے ہوئے لمحوں سے ہمت اور حوصلہ چراتی رہی پھر کمر پر ہاتھ رکھتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ منہ اٹھا کر آسمان کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ”اے کاتبِ تقدیر! مجھے تجھ سے کوئی شکایت نہیں ہے، تُو نے میری تقدیر میں جو لکھ دیا ہے اسے میں چپ چاپ بھگت رہی ہوں لیکن اتنا سمجھ رہی ہوں کہ تُو بھی میرا مقدر دیکھ کر کچھ تو سوچتا ہو گا۔ آج نہیں تو کل کچھ تو کرم کرے گا۔“

وہ کچھ دیر تک آسمان کو ایسے تکتی رہی جیسے وہاں سے کوئی صدا آنے والی ہو پھر یہ سوچ کر سر جھٹکتی ہوئی کمرے میں چلی گئی کہ مقدر گردش میں رہے گا تو اسے نہ اوپر والے کی آواز سنائی دے گی، نہ کوئی آسمانی اشارہ ملے گا۔

دو دن گزر گئے۔ باپ جھنجھلا کر گیا تھا پھر واپس نہیں آیا تھا۔ اس کی گمشدگی پر کوئی تشویش نہیں تھی۔ وہ اس قابل ہی نہیں تھا کہ اس کی فکر کی جاتی۔ وہ دو دن اس نے بڑی آسودگی سے گزارے تھے۔ یوں لگ رہا تھا جیسے برسوں کی تھکن اُتر رہی ہے۔

وہ غسل سے فارغ ہو کر آئینے کے رُو برو آئی پھر گیلے بالوں کو کنگھی سے سلجھانے لگی۔

بالوں کی الجھن دور ہو رہی تھی لیکن دل کی الجھن بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ مقدس باپ کے گھناؤنے سائے میں کسی آئیڈیل کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ وہ آسیبی کالا بادل چھٹ گیا تھا۔ اب دل میں ہوک سی اٹھنے لگی تھی۔ کسی سے چاہے جانے کی خواہش ایک نئے جذبے کے ساتھ انگڑائی لے رہی تھی۔ شکستہ آئینہ اس سے سرگوشی کر رہا تھا، ابھی وقت ہے۔ ابھی تو گزرا ہوا وقت نہیں ہے۔ آئینہ سوئی سوئی سی آرزوؤں کو جگا رہا تھا اور بھیگی ہوئی قمیص بدن سے یوں چپک رہی تھی، جیسے شرارتی جذبے رہ رہ کر چپک رہے ہوں اور اس پر چہک رہے ہوں۔

اس نے بڑی حسرت سے اپنے آپ کو دیکھا۔ گیلی قمیص کسی شاعر کی غزل بن سکتی تھی، کسی مصور کے خالی کینوس میں رنگ بھر سکتی تھی، کسی حسنِ نظر رکھنے والے کو واہ واہ کہنے پر اور کسی دل جلے کو ہائے ہائے کہنے پر مجبور کر سکتی تھی لیکن حالات نے اس پر ایسی گرد جما دی تھی کہ وہ ہیرا ماند پڑ گیا تھا، اپنی آب و تاب دکھا نہیں پا رہا تھا۔

وہ سر جھٹک کر دوبارہ کنگھی کرنے لگی پھر ایک دم سے چونک گئی، ایسا لگا جیسے وہاں کوئی ہے۔ اس نے فوراً ہی پلٹ کر دیکھا، کمرا خالی تھا۔ کمرا ہی کیا پورا گھر خالی تھا۔ وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ آنگن میں آئی۔ شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔ کوئی ہے۔ اگر نہیں ہے تو بھی کوئی ہے۔

کوئی تو گلی میں آئے کہ وہ لبِ بام جائے
کوئی تو دستک دے
کہ دل کے دروازے بج اٹھیں
کوئی مسافر راستہ کیوں نہیں بھولتا
پیار کا ایک ٹمٹماتا ہوا دیا ہی سہی
اپنی ہتھیلی پر سجا کر کیوں نہیں لاتا
زندگی میں کتنی ویرانی ہے، کتنا سناٹا ہے
ہائے کسی کی آہٹ نہ سہی، کوئی پتہ ہی کھڑکے...... کہ دل تو دھڑکے......

ایک دم سے دل دھڑکنے لگا۔ دروازے پر دستک سنائی دی تھی۔ اس کی آرزوئیں، دعا کی طرح قبول ہوئی تھیں۔ کوئی آ گیا تھا، آ ہی گیا تھا۔

بیرونی دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ ''ٹھک، ٹھک'' کہ آواز کے ساتھ دل ''دھک

دھک'' کر رہا تھا۔ اس نے دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے دروازے کے قریب آ کر پوچھا۔
''کون ہے؟''

باپ کی آواز نے اس کی ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اس نے ناگواری سے دروازے کی چٹخنی کو دیکھا۔ جی چاہ رہا تھا، اسے کھولنے کے بجائے اس میں ایک بڑا سا تالا ڈال دے۔ دستک پھر سنائی دی۔ اس نے آگے بڑھ کر اسے کھولا تو باپ کے ساتھ کسی اجنبی عورت کو دیکھ کر چونک گئی۔ اس عورت کے ساتھ ایک ایسی بچی تھی، جو لڑکپن اور جوانی کے سنگم پر دکھائی دے رہی تھی۔

وہ اسے ایک طرف ہٹا کر اندر آتے ہوئے بولا۔ ''کیا ہو رہا تھا؟ دروازہ کھولنے میں بڑی دیر کر دی؟''

وہ اس عورت کو سوالیہ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ بھولے خاں نے اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''اری نیک بخت! باہر کیوں کھڑی ہے؟ اندر آ جا۔ یہی ہے اپنا آشیانہ......''

وہ بچی کے ساتھ اندر آ گئی۔ نیلو نے دروازہ بند کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کون ہے؟''

وہ اس عورت کو دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔ وہ بھی شرما کر مسکرا رہی تھی۔ وہ اس کی کمر کو بازو کے حصار میں لیتے ہوئے بولا۔ ''پہلے تیری ماں چلی گئی، پھر بہن چلی گئی اور تو اکیلی رہ گئی، دیکھ! مجھے تیرے اکیلے پن کا کتنا خیال ہے؟ اب تجھے نہ ماں کی کمی محسوس ہو گی اور نہ چھوٹی بہن کی۔''

اس نے ذرا چونک کر باپ کو دیکھا۔ بات سمجھ میں آ گئی تھی پھر بھی تصدیق لازمی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''میں کچھ سمجھی نہیں۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''اس میں نہ سمجھنے والی کون سی بات ہے؟ بھئی یہ تیری ماں ہے، وہ تیری بہن ہے اور اس رشتے سے یہ میری بیوی ہے اور وہ میری بیٹی۔ آئی بات کچھ سمجھ میں؟''

اس نے بے یقینی سے باپ کو دیکھا، وہ اس کا شانہ تھپکتے ہوئے بولا۔ ''میری بھولی بٹیا! میں نے شادی کر لی ہے۔''

وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''میں نہیں مانتی۔ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ تم بوڑھے ہونے کے ساتھ ساتھ بے روزگار بھی ہو۔ بھلا ایسے میں کون بے وقوف ہو گی جو تم سے شادی کرے گی؟ سچ بتاؤ، یہ دونوں کون ہیں؟''

وہ منہ پھاڑ کر ہنسنے لگا۔ اس عورت نے کہا۔ ''تم میرے منہ پر مجھے بے وقوف کہہ رہی ہو، میں نے ہی تمہارے باپ سے نکاح کیا ہے۔''

نیلو تعجب سے اسے دیکھنے لگی۔ وہ تیس برس کی بھرپور جوان عورت تھی۔ خوب صورت نہیں تھی لیکن قبول صورت تھی۔ اس نے پوچھا۔ ''تمہیں میرے ابا میں ایسی کون سی خوبی نظر آ گئی ہے، جسے دیکھتے ہوئے تم نے اتنا بڑا اور غلط قدم اٹھایا ہے؟''

اس عورت نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''یہ سوال پہلے اپنی ماں سے کرنا تھا کہ اس نے کیا دیکھ کر اس سے شادی کی تھی؟ اگر تمہاری ماں نے کوئی غلطی نہیں کی تھی تو پھر میں نے بھی کوئی غلطی نہیں کی ہے۔''

بھولے خاں بیٹی کی بات سن کر آگ بگولا ہو گیا تھا۔ اسے مارنے کے لیے آگے بڑھا۔ نئی بیوی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''کیا کر رہے ہو؟ ٹھنڈے دماغ سے کام لو۔ میں نے اس کی ماں کی جگہ لی ہے۔ یہ فوراً ہی مجھے قبول نہیں کرے گی۔''

نیلو نے ذرا ایک سنجیدگی سے کہا۔ ''ہاں...... نہیں کروں گی۔ تم نے میری ماں کی جگہ لے کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔ میں نے ایک ماں کو تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ایک عورت کے ناتے مجھے تم سے ہمدردی ہے۔''

باپ نے غرا کر اس کی طرف لپکتے ہوئے کہا۔ ''چپ ہو جا! نہیں تو اٹھا کر باہر پھینک دوں گا۔''

وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''تم مجھے اٹھا کر کیا پھینکو گے؟ تم سے تو اپنا بوجھ نہیں اٹھایا جاتا۔ کمانے کے لیے بوڑھے بن جاتے ہو۔ شادی کرتے وقت اپنی عمر نظر نہیں آئی؟ کبھی دو پیسے کما کر اس گھر میں نہیں لائے، پھر یہ دو بوجھ اٹھا کر کیوں لائے ہو؟''

وہ بولا۔ ''زیادہ ٹرٹر مت کر۔ یہ اپنی قسمت سے اس گھر میں آئی ہیں اور یہاں اپنی قسمت کا لکھا ہوا کھائیں گی۔''

وہ بڑے دکھ سے بولی۔ ''ہاں...... میں بھی اس گھر میں اپنی قسمت لے کر پیدا ہوئی تھی اور اب تک اپنی بدقسمتی کو بھگت رہی ہوں۔''

پھر اس نے نئی ماں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''مجھے تو قدرت نے اس گھر میں بھیج دیا ہے، لیکن تم یہ سمجھ لو کہ اپنی تقدیر پھوڑنے خود یہاں آئی ہو۔''

اس نے ایک نظر اپنے شوہر پر ڈالی پھر نیلو سے کہا۔ ''تم میرے حالات نہیں جانتیں۔

میں بدقسمتی کی دھوپ میں جلتی ہوئی تمہارے باپ کے سائے میں آئی ہوں۔ تمہاری باتوں سے اندازہ ہو گیا ہے کہ تمہیں اپنے باپ سے بڑی شکایتیں ہیں لیکن مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں تو ان کی احسان مند ہوں۔ یہ صرف مجھے ہی نہیں، میری بیٹی کو بھی ایک چھت اور چار دیواری کے ساتھ تحفظ دے رہے ہیں۔''

اس نے اپنی بیٹی کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''اس چار دیواری میں میری بچی باہر والوں کی میلی نظروں سے محفوظ رہے گی۔ یہاں آتے ہی مجھے جو سکون حاصل ہو رہا ہے، اسے تم نہیں سمجھ پاؤ گی۔ بس اتنا جان لو کہ میں ڈوب رہی تھی اور تمہارے ابو مجھے کنارے لگا رہے ہیں۔''

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب کے گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ نیلو کو اچانک ہی ایسا لگا، جیسے وہ آئینہ دیکھ رہی ہے۔ اس کے چہرے پر اسے اپنا چہرہ دکھائی دے رہا ہے۔ ہاں...... وہ کوئی نہیں تھی، اسی کا دوسرا روپ تھی۔ اس دنیا میں شاید تمام مظلوموں کے چہرے ایک ہی جیسے ہوتے ہیں؟

بھولے خاں نے اپنی نئی دلہن کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''نوشاد! تُو اس کی پرواہ نہ کر۔ یہ ٹیڑھی پیدا ہوئی ہے۔ ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ وہ سامنے میرا کمرا ہے۔ غزالہ کو لے کر وہاں جاؤ ذرا دیر آرام کر لو۔''

اس نے ایک نظر نیلو پر ڈالی پھر اپنی بیٹی کا ہاتھ تھام کر کمرے میں چلی گئی۔ وہ اس کے جاتے ہی چونک گئی، باپ کو ناگواری سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں اس گھر کا چولہا گرم رکھنے کے لیے خود کو جلاتی رہتی ہوں۔ اپنا اور تمہارا بوجھ اٹھانا دوبھر ہو گیا ہے اوپر سے ایک کا نہیں دو کا بوجھ اور لاد رہے ہو۔ اب تو یہاں فاقے ہوا کریں گے۔''

اس نے بڑے ہی شیطانی انداز میں مسکرا کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ''تُو نے ایک سونے کی چڑیا اُڑا دی۔ میں پرانا چڑیمار ہوں تُو نے ایک اُڑائی، میں دو لے آیا ہوں۔ ایک دودھ ہے تو دوسری بالائی ہے۔''

وہ ایک دم سے چونک کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔ بے یقینی سے انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ یہ عورت اپنے ساتھ اپنی بیٹی کو بھی داؤ پر لگائے گی۔''

وہ فاتحانہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں بکری کو بھی اور بکری کی ماں کو بھی چھری تلے لانے کے ہتھکنڈے خوب جانتا ہوں۔ میری یہ کھوپڑی بہت تیز ہے۔ دور تک سوچنے

کے بعد اصل کے ساتھ سود بھی لایا ہوں۔ یہ ماں بیٹی اپنا بوجھ بھی اٹھائیں گی اور اپنے ساتھ میرا بھی......''

وہ اسے ایک طرف ہٹا کر اپنے کمرے میں جاتے ہوئے بولا۔''قدرت کی مہربانیاں ہیں کیا کہیے؟''

وہ اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی پھر ہذیانی انداز میں چیخ کر بولی۔''نوشاد! اپنی غزالہ کو لے کر فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ اسے تم مسیحا سمجھ رہی ہو، یہ موت ہے۔ عزت کا قاتل ہے۔ اس نے اپنی بیٹیوں کی عزت نہیں رکھی، تم دونوں کی عزت کیا رکھے گا؟ کمرے سے نکل جاؤ۔ میں تم دونوں کو باہر تک چھوڑ کر آؤں گی۔''

وہ دروازے کو اندر سے بند کر چکا تھا۔ اس نے آگے بڑھ کر چیختے ہوئے کہا۔''چلی جاؤ نوشاد! اپنی بیٹی کو ابھی یہاں سے لے جاؤ۔ اب مجھ میں دوسری فاخرہ بچانے کی ہمت نہیں ہے۔ میں تھک گئی ہوں۔ زیادہ دور تک ساتھ نہیں دے سکوں گی۔ آؤ، باہر تک ساتھ چلوں گی۔''

کمرے کے اندر ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی، جیسے سننے والوں کو سانپ سونگھ گیا ہو۔ اس کی چیختی ہوئی آوازیں بند دروازے سے گویا سر پھوڑ رہی تھیں۔ وہ چیختے چیختے تھک گئی، دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر زمین پر بیٹھ گئی۔ دماغ ایک دم سے سن ہو گیا تھا۔ اندر سے ظاہر ہونے والی بے حسی نے اچھی طرح سمجھا دیا کہ باپ واقعی چڑیمار ہے۔ ماں بیٹی سے باقاعدہ سمجھوتا کرنے کے بعد انہیں یہاں لایا ہے۔

☆======☆======☆

وقت دبے پاؤں گزر رہا تھا مگر لمحہ بہ لمحہ اس کے اندر ہلچل مچا رہا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً بے اختیار اپنی ہتھیلی کو دیکھنے لگتی تھی۔ یہ پیش گوئی سرگوشی کرتی رہتی تھی کہ اس کے ہاتھ کی لکیر پر چلتا ہوا کوئی آئے گا۔ ضرور آئے گا۔

ہائے مگر کب آئے گا؟ اس پیش گوئی نے تو کہیں کا نہ رکھا تھا۔ دن رات کا سکون چھن گیا تھا۔ شادی سے پہلے یہ گمان تھا کہ شاید مشتاق ہی اس کا آئیڈیل بننے والا ہے لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بات سمجھ میں آئی کہ کوئی بہت قریب ہو کر بھی دل کو چھو نہیں پاتا اور جو دور ہے، جسے نہ آنکھیں اب تک دیکھ سکی ہیں، نہ تصور اب تک اسے چھو سکا ہے، وہ اجنبی دل میں گھسا رہتا ہے۔

شوہر کے ساتھ گزرنے والے دن رات بے کیف اور بے رنگ و بو تھے مگر اس اجنبی کے تصور سے عجیب رنگینی و سنگینی اور ایک تڑپا دینے والی دلچسپی پیدا ہو جاتی تھی۔ وہ رات تھی، مشتاق دن تھا۔ رات اور دن کا مسئلہ یہ ہے کہ رات کبھی دن سے نہیں ملتی اور دن کبھی رات سے ملنا چاہتا ہے تو شام ہوتے ہوتے بجھ جاتا ہے۔

وہ اس کے پاس آ کر بجھ سا جاتا تھا۔ پریشان ہو جاتا تھا، محبت سے پوچھتا تھا۔ ''تمہارے اندر وہ حرارت، وہ جوش و جذبہ کیوں نہیں ہے جو تمہارے ہاتھ کی لکیر میں ہے۔ ہاتھ کی لکیر کچھ اور ہے اور تمہاری سرد مہری کچھ اور کہتی ہے۔''

وہ خود پریشان تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مرد ذات سے جو بیزاری ہے وہ اس کے حواس پر اس قدر کیوں چھا جاتی ہے کہ محبت کا ایک ہلکا سا خوشگوار جھونکا بھی اس کے دل کو چھونے نہیں آتا؟

عشق انسان سے ہو یا پتھر کی مورت سے، وہ بے اختیار ہوتا ہے اور اس کا دل بے اختیار مشتاق کی طرف مائل نہیں ہوتا تھا۔ یہی سمجھ میں آتا تھا کہ شادی جلد بازی میں ہوئی ہے۔ پہلے کسی سے عشق ہوتا پھر شادی ہوتی تو ہاتھ کی لکیر کی آبرو رہ جاتی۔

اس نے اپنی ہتھیلی اس کے سامنے پھیلاتے ہوئے پوچھا۔''کیا ہاتھ کی لکیریں غلط کہتی ہیں یا تم نے غلط کہا تھا؟''

وہ اس کی ہتھیلی کو سہلاتے ہوئے بولا۔''نہ لکیر غلط ہے اور نہ ہی میں نے غلط کہا تھا۔ یہ اب بھی وہی کہہ رہی ہے کہ تم کسی کے عشق میں دیوانگی کی حد پار کر کے جنونی ہو جاؤ گی۔'' پھر وہ ایک سرد آہ بھر کر بولا۔''میں سچ کہہ رہا ہوں اور یہ سوچ کر شرمندہ ہو رہا ہوں کہ تمہاری دیوانگی اور تمہارا جنون میرے لیے کیوں نہیں ہے؟''

دن ایسے گزر رہے تھے، جیسے کسی آنے والے اجنبی کا انتظار کر رہے ہوں۔ بہت سارا وقت گزر گیا تھا، اسے مایوس ہو جانا چاہیے تھا۔ وہ مایوس ہو بھی جاتی مگر دل کا کیا کرتی جو ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھا۔

''کوئی آئے۔ جب آنا ہے تو آ ہی جائے۔''

یہ تجسس بھی اسے بھڑکاتا رہتا تھا کہ وہ کسی ایک مرد کی قربت سے گھبراتی ہے، کیا مشتاق کے بعد پھر کسی کو گلے لگائے گی؟

وہ اس جیسی بے جان بت کو پوجتے پوجتے تھک گیا تھا، وہ مجبور تھی، ہزار بار کوششیں

کرنے کے باوجود دل اپنے سرتاج کی طرف مائل نہیں ہو رہا تھا۔ وہ سر کا تاج تھا۔ سر پر ہی رہتا تھا۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی اس کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ وہ اسے بھرپور توجہ اور اپنائیت نہ دے سکی تھی لیکن زرخیز زمین پر ہل چلایا جائے تو مٹی نہ چاہنے کے باوجود سونا اگلتی ہے۔

وہ رسمی زندگی گزارنے والی شادی کے بعد ایک اور رسم ادا کرنے کے لیے تیار ہونے لگی۔ پہلے ازدواجی تعلق سے گزرنے کے بعد ذہن بھاری ہوتا تھا پھر پاؤں بھاری ہو گیا۔ یہ عجیب سا بوجھ تھا جسے اٹھا کر اسے تھکن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اس پر عجیب سی کیفیت طاری تھی، سرشاری کا میٹھا میٹھا نشہ تھا، جیسے اسے جینے کا اصل مقصد ملنے والا ہے۔

وہ بستر پر نیم دراز تھی، خیالوں کی اُڑان میں ایک ننھا منا سا بچہ اس کے ساتھ محوِ پرواز تھا۔ وہ اس کی انگلی تھامے اِدھر سے اُدھر ڈول رہی تھی، خوشی سے لہرا رہی تھی، ایسے ہی وقت چونک گئی دماغ میں ایک بہت ہی الجھا ہوا سوال کلبلانے لگا۔ ''یہ بچہ مشتاق کی طرح اور دوسرے مرد حضرات کی طرح آدم زاد ہو گا تو کیا تم اسے بھرپور ممتا اور چاہت دے سکو گی؟ کیا یہ تمہاری کوکھ سے نکل کر تمہارے دل میں جگہ بنا سکے گا یا مشتاق کی طرح تمہاری سرد آغوش سے سر ٹکراتا رہے گا؟''

ایسے سوالات کے ابھرتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا، وہ اٹھ کر بیٹھ گئی، بیٹھ کر بھی چین نہ ملا تو بستر سے اُتر کر ٹہلنے لگی، بڑھے ہوئے پیٹ کو دیکھنے لگی، اس پر دھیرے دھیرے ہاتھ پھیرنے لگی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس گفٹ پیک میں ایک پنچ ٹوائے ہے جو پیکٹ کے کھلتے ہی اس کے منہ پر ایک گھونسا مارنے والا ہے۔

☆======☆======☆

اتنا تڑپے کہ درد نہ رہا کوئی
اتنا ترسے کہ آس بھی نہ رہی
اتنا جاگے کہ جاگتی آنکھیں
بھول گئیں، خواب کیا ہوتے ہیں
اچھا ہے کوئی خواب نہ آئے
وہ آپ آ جائے
یقیں دلائے کہ وہ ہے

یہیں ہے
مجھے گدگدا رہا ہے
حنائی ہاتھوں کی رنگت
چرا رہا ہے
حیا کا گھونگھٹ اٹھا رہا ہے
پسینے میں مجھ کو
نہلا رہا ہے
آہ! خواب نہیں آتے
خیال آتے ہیں
وہ کب آئے گا؟
اداسی کی ایک دلہن
سر جھکائے بیٹھی ہے
وہ آئے نہ آئے
اس کا سایہ تو آئے

قلم چلتے چلتے رک گیا، اس غریب بچے کے دودھ کی بوتل کی طرح خالی ہو گیا جس کے پیٹ میں ابھی بھوک ناچ رہی تھی۔ اس کے دماغ میں بھی خیالات ناچ رہے تھے، رقص کی ایک ایک دھمک ابھی کورے کاغذ پر پڑنے والی تھی لیکن سیاہی نے ساتھ چھوڑ دیا تھا۔

کتنی عجیب بات تھی، زندگی سیاہی سے بھرپور پڑی تھی مگر قلم خالی ہو گیا تھا۔ نیلو نے ایک گہری سانس لے کر ڈائری بند کر دی، اس کے ساتھ ہی آنکھیں بھی بند ہو گئیں۔ تصور میں ادھورے خیالات ابھرنے لگے۔ وہ سنجیدگی سے سوچنے لگی۔ ''یہ اتفاق ہے یا قلم کی شرارت؟ وہاں رکا جہاں تمناؤں کی شدت دعائیہ انداز اپنا رہی تھی۔''

وہ آنکھیں بند کیے سوچ رہی تھی، خیالوں کی اُڑان پھر وہیں پہنچ گئی، تسلسل کو جوڑنے لگی۔ ''وہ آئے نہ آئے۔ اس کا سایہ ہی آئے.....''

☆======☆======☆

خیالوں کی گرہ بندھتے ایک بار پھر کھل گئی۔ دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ اس نے الجھ کر آنکھیں کھول دیں۔ کمرے سے باہر آ کر دیکھا، باپ دروازہ کھولنے جا رہا تھا۔ دستک

ایک بار پھر سنائی دی۔ بھولے خاں نے بلند آواز میں کہا۔ ''آ رہا ہوں بھائی! چھری کے نیچے دم تو لو۔''

اس نے آگے بڑھ کر چٹخنی گرائی تو جیسے خود بھی گر گیا۔ باہر کھڑے ہوئے شخص کو دیکھتے ہیں جھک کر یوں مصافحہ کرنے لگا جیسے اس سے ہاتھ نہ ملا رہا ہو، اس کے پاؤں چھو رہا ہو۔

بزرگوں کے پاؤں چھونے سے دعائیں ملتی ہیں، عزت ملتی ہے لیکن اسے ذلتِ عزیز تھی کیونکہ کمائی کا ذریعہ ذلت ہی تھا۔ وہ کسی بزرگ کے نہیں، دروازے پر آنے والے ان داتا کی قدم بوسی کے لیے جھکا تھا۔

نیلو نے ذرا گردن اٹھا کر دیکھا، آنے والا کچھ جانا پہچانا سا لگ رہا تھا۔ باپ کا اس سے جھک کر ملنا سمجھا رہا تھا کہ دکانداری چمکنے والی ہے۔

وہ افسردہ سی ہو گئی، ایک سرد آہ بھرتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتی تھی؟ پھر اسے دلہن بننا تھا، پھر ایک سہاگن کی سیج پر صبح تک کانٹے چننے تھے۔

اس نے بستر پر پڑی ہوئی ڈائری کو حسرت سے دیکھا پھر اسے اٹھا کر الماری کے سیف میں رکھ دیا۔ وہ سارے ارمانوں، ساری تمناؤں کو اسی طرح سیف میں سنبھال کر رکھ دیتی تھی۔

کچھ دیر بعد ہی یہ چھ نقطوں والا پاپ خوشی سے منہ پھاڑے ہنستا ہوا کمرے میں آیا۔ اس کے ہاتھوں میں دو لفافے تھے۔ وہ انہیں نیلو کے سامنے لہراتے ہوئے بولا۔ ''یہ دیکھ! صبح ہوتے ہی قسمت کی دیوی ہم پر مہربان ہو گئی ہے۔ کل رات ہی خواب میں دیکھا تھا کہ میں نے نیا سوٹ پہنا ہے۔ تعبیر اتنی جلدی مل جائے گی میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔''

وہ اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''جسے بیاہ کر لائے ہو، اسے بھیجو، وہ تمہارے نئے سوٹ کے ساتھ کفن بھی لے آئے گی۔''

وہ غصے سے گھورتے ہوئے بولا۔ ''تو مجھے کفن پہنانے کی فکر میں رہتی ہے لیکن میں اتنی آسانی سے مرنے والا نہیں ہوں۔''

نوشاد صحن میں بیٹھی بیٹی کے سر سے جوئیں نکال رہی تھی۔ ہاتھ نچا کر بولی۔ ''ہمیں اپنا بوجھ اٹھانا ہے۔ میں چلی جاتی ہوں۔''

وہ بولا۔ ''میں خود اس کا احسان نہیں لینا چاہتا مگر راجا گل نواز کا پیغام آیا ہے۔ وہ تو اسی کم بخت کو مانگتا ہے۔''

وہ راجا گل نواز کا نام سنتے ہی چونک گئی۔ دل ایک دم سے سینے میں دھماکے کرنے لگا۔ یہ نام اس کی زندگی میں دوسری بار آیا تھا اور پچھلی تمام یادوں کو جھنجھوڑنے لگا تھا۔ وہ یکبارگی پرواز کرتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔

وہ اس کی زندگی کا پہلا خریدار تھا۔ پہلی بار اسے گاڑی میں بٹھا کر اپنے بنگلے میں لے گیا تھا۔ عورت جیسی بھی ہو، اچھی ہو، یا بری ہو، اپنی زندگی کے پہلے مرد کو کبھی بھلا نہیں پاتی پھر ایسے مرد کو جس نے اس کے وجود کے ساتھ ساتھ اس کا دل بھی خرید لیا تھا۔

اس کے جھومتے ہوئے دل نے سوچا۔ ''وہ واپس آ گیا ہے۔ لندن میں اپنی فیملی کے ساتھ رہنے کے باوجود مجھے نہیں بھلا سکا۔ وہ وعدے کا پکا ہے، زبان کا سچا ہے اس نے سچ کہا تھا کہ پاکستان آتے ہی تجھے اپنے پاس بلائے گا۔''

وہ سوچ رہی تھی، تصور میں راجا گل نواز کا چہرہ ابھر رہا تھا۔ وہ بازو پھیلائے اسے بلا رہا تھا۔ اتنی بڑی دنیا میں وہی بازو تھے، جہاں پیار سے پناہ ملتی تھی۔ وہ کشاں کشاں اس پناہ کی طرف بڑھنے لگی پھر اچانک ہی ٹھٹک گئی۔ کسی سے ٹکرا گئی۔ باپ اسے پیچھے ہٹاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ ''منہ پر کہاں چڑھتی آ رہی ہو؟ یہ لو...... یہ لفافہ راجا صاحب نے تمہارے لیے بھیجا ہے۔''

اس نے لفافہ لیا پھر سوالیہ نظروں سے اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگی۔ باپ نے کہا۔ ''کھول کر تو دیکھ! کیا ہے اس میں؟''

وہ اس کے ہاتھ میں دوسرے لفافے کو دیکھ کر بولی۔ ''تمہیں جو چاہیے، وہ اس میں ہو گا۔''

وہ اپنے لفافے کو ہاتھ میں تولتے ہوئے بولا۔ ''راجا صاحب کا بندہ کہہ رہا تھا، اس میں پورے ایک ہزار ہیں۔ باقی ایک ہزار صبح ملیں گے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا ہے، مہنگائی بڑھ گئی ہے۔ صبح دو ہزار سے کم نہیں لوں گا۔''

اس نے ناگواری سے باپ کو دیکھا، اسے بھی لفافے کے اندر جھانکنے کا تجسس تھا لیکن وہ اس کی موجودگی میں اسے کھولنا نہیں چاہتی تھی۔ باپ نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''لا...... مجھے دے۔ میں اسے کھولتا ہوں۔''

وہ اسے مٹھی میں دباتی ہوئی دو قدم پیچھے ہٹ کر بولی۔ ''تمہارے لیے جو آیا ہے میں اس کا حساب نہیں کر رہی ہوں پھر تم کیوں اس لفافے کے پیچھے پڑے ہو؟''

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس بند لفافے میں کیا ہے؟ اس کے باوجود اندر ہی اندر لہرا رہی تھی، یہ سوچ کر خوش ہو رہی تھی کہ کوئی ہے، جو اس کے لیے کچھ بھیج سکتا ہے۔

باپ نے کہا۔ ''سوچ کیا رہی ہے؟ میں دیکھے بغیر ٹلنے والا نہیں ہوں۔''

اس نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ یہ سمجھ گئی کہ لفافہ کھولنے کے بعد ہی اس بڈھے سے پیچھا چھوٹے گا۔ اس نے مجبوراً اسے کھولا۔ وہ بڑے تجسس سے بیٹی کے قریب آ گیا۔ لفافے کے اندر سے ایک خط برآمد ہوا۔ وہ مایوسی سے پیچھے ہٹ کر بولا۔ ''کھودا پہاڑ نکلا چوہا......''

وہ اس خط کو دیکھ کر ٹھٹک گئی، دل نے دھڑک کر کہا۔ ''وہ مدتوں بعد آنے والا ملاقات سے پہلے محبت نامے کے ذریعے تیرے پاس آ گیا ہے۔ یہ نامہ میرے نام ہے۔ اس میں اس کی زبان ہوگی، اس کی باتیں ہوں گی، پتا نہیں اس نے کیا کیا لکھا ہوگا؟ مجھے یاد ہے، وہ بڑی شاعرانہ گفتگو کرتا ہے۔''

اسے اس کا لب ولہجہ یاد آنے لگا، وہ پہلی ملاقات یاد آنے لگی۔ اس کے بعد تو شاید وہ اس دنیا میں ہی نہیں رہی تھی۔ آج اچانک ہی ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ برسوں کے بعد سانس لے رہی ہے، دل دھڑک دھڑک کر اس کے زندہ ہونے کی منادی کر رہا ہے۔ دھڑکنیں ایسی بے ترتیب ہو رہی تھیں، جیسے دھڑکنے کا سلیقہ بھول گئی ہوں۔

وہ اس تہہ شدہ کاغذ کو کھولنا چاہتی تھی، پڑھنا چاہتی تھی۔ یہ جاننے کا تجسس تھا کہ پیا نے کیا سندیس بھیجا ہے؟ لیکن باپ سر پر سوار تھا۔ وہ خط کو اس کے سامنے لہراتے ہوئے بولی۔ ''غور سے دیکھ لو، یہ کاغذ ہے، نہ ڈالر ہیں، نہ پاکستانی کرنسی ہے۔ یہ کاغذ تمہارے کسی کام کا نہیں ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے خالی لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ انداز ایسا تھا، جیسے زبان بے زبانی سے دفع ہونے کو کہہ رہی ہو۔ وہ منہ بناتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی اس نے دروازہ کو اندر سے بند کر لیا۔ ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ وہ نامہ ابھی تک مٹھی میں دبا ہوا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اسے کھولتے ہی گل نواز رُوبرو چلا آئے گا۔

وہ خط کی ایک ایک تہہ کو بڑی احتیاط سے یوں کھولنے لگی، جیسے اس پر الفاظ نہ لکھے ہوں، موتی جڑے ہوں۔ ذرا سی چوک ہو گی تو بکھر جائیں گے۔ تہیں کھل گئیں بڑے سے کاغذ پر مختصر سی تحریر دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اسے سینے سے لگا لیا۔ پل

بھر کو یوں لگا، جیسے وہ آ لگا ہو۔

وہ کچھ دیر تک اسے محسوس کرتی رہی، اس کی قربت سے بہلتی رہی پھر دھڑکتے دل کے ساتھ اس تحریر کو پڑھنے لگی۔ تحریر کیا تھی؟ وہ خود آ کر بیٹھ گیا تھا اور بڑے ہی پیار بھرے لہجے میں اسے مخاطب کر رہا تھا۔

''جانِ حجلہ!

آج نہ جانے کتنے عرصے بعد تمہیں مخاطب کر رہا ہوں؟ ہماری ایک ہی ملاقات ہوئی ہے۔ میں اس ملاقات کی یادوں کے سہارے یہاں سے گیا تھا اور اب لوٹا ہوں تو وہی یادیں ساتھ ساتھ ہیں۔ مجھے نہیں معلوم جدائی کے اس لمبے عرصے میں کہاں تھا؟ جہاں جہاں بھی تھا، وہاں تم ہی تم تھیں؟ یقین کرو، اپنی ہر تنہائی میں تمہارے ساتھ ساتھ سانسیں لیتا رہتا ہوں۔''

وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ وہ ہونٹوں میں انگلی دبائے یوں مسکرا رہی تھی، جیسے اس کی بے تابی کو صرف محسوس ہی نہ کر رہی ہو بلکہ اسے تڑپتا ہوا بھی دیکھ رہی ہو۔ وہ اس تحریر پر ہاتھ پھیرنے لگی تڑپنے والے کو ایک ذرا سا سہلانے لگی، ذرا بہلانے لگی۔

وہ گویا ہوا۔ ''یہ کمرا، یہ گھر یہاں کے در و دیوار سب تمہیں بلا رہے ہیں۔ یہ فرش تمہاری قدم بوسی کے لیے بے چین ہے۔ میری سانسوں میں اب تک تمہاری مہک بسی ہوئی ہے، آؤ کہ یہ اور مہکنا چاہتی ہیں۔''

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوشِ قدح سے بزم میں چراغاں کئے ہوئے
پھر چاہتا ہوں نامہ دلدار کھولنا
جاں نذر دل فریبی عنواں کئے ہوئے

میں پیار سے بولنا ہی نہیں چاہتا، پیار سے تولنا بھی چاہتا ہوں۔ آ بھی جاؤ کہ وقت نہیں گزرے گا تم دل و جان سے گزر جاؤ۔ آؤ! مجھے خوشبوؤں سے نواز کر گل نواز بنا دو۔''

فقط اپنی خوشبو کا منتظر۔

تمہارا گل!

وہ اس کے بلانے کے انداز پر تڑپ گئی، خط کو سینے سے دبوچ کر سسکنے لگی۔ اس کے سینے سے سسکیاں ایسے نکل رہی تھیں، جیسے چاہنے والے کے لیے دعائیں نکل رہی ہوں۔ وہ زیرِلب بڑبڑائی۔ ''لوٹ کے آنا تھا تو مجھے میرے حوالے کیوں کیا تھا؟ میں خود کو دامن دامن بانٹ چکی ہوں۔ اس کھلے دَر کے مکان میں نہ جانے کون کون اپنے اپنے نام کی تختی لگا چکا ہے۔ اب تو میری طرف جو بھی نگاہ اٹھتی ہے خریدار کی طرح اٹھتی ہے۔ میں وہ خوشبو نہیں رہی گل! جسے تم ڈھونڈنے آئے ہو۔''

اتنا کہہ کر وہ ایک بار پھر سسک پڑی۔ بلائے جانے کی خوشی پر یہ اندیشہ حاوی ہونے لگا کہ اس کے حالات معلوم ہونے پر وہ اسے ٹھکرا نہ دے۔ زندگی میں اتنے زخم کھائے تھے کہ اب کسی نئے زخم سے تکلیف نہیں ہوتی تھی لیکن گل نواز کے بارے میں سوچ کر دل ڈوبنے لگا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کی طرف سے ایک ذرا بھی ٹھیس پہنچے گی تو اس کا دم نکل جائے گا۔

وہ اٹھ کر ٹہلنے لگی، آنے والے حالات پر غور کرنے لگی۔ جتنا سوچ رہی تھی، اتنا ہی الجھ رہی تھی۔ کچھ دیر تک ٹہلنے اور غور کرنے کے بعد یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ اس سے ملنے کے بعد ہی اس کے رویے کا پتا چل سکے گا۔

دن گزرا، شام ہوئی، شام گزری رات ہوگئی۔ جب سے بلاوا آیا تھا، وہ تب سے ملاقات کی تیاریوں میں مصروف رہی تھی۔ سارا دن آئینے کے سامنے رہی اپنے وجود کے ایک ایک حسین زاویے کی نوک پلک درست کرتی رہی۔ اس نے بالوں کو لپیٹ کر کبھی جُوڑا بنایا، کبھی کالی گھٹاؤں کی طرح انہیں شانوں پر بکھیر دیا۔ وہ طرح طرح سے سنور رہی تھی۔ مختلف انداز سے خود کو نکھار رہی تھی لیکن وہ شکستہ آئینہ اسے بگڑا ہوا چہرہ ہی دکھا رہا تھا۔

وہ الجھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے کتنی بار سوچا تھا، ایک بڑا سا نیا آئینہ خرید کر اپنے کمرے میں رکھے گی لیکن مہنگائی، گھر کے اخراجات اور باپ کی حکمرانی ایسی تھی کہ وہ سوچ کر رہ جاتی تھی۔ ایک بڑا سا تو کیا، چھوٹا سا بھی آئینہ خرید نہیں پاتی تھی۔ جو آئینہ سامنے تھا، وہ ایک کے بجائے دو صورتیں دکھاتا تھا اور وہ بھی بگڑی ہوئی صورتیں۔

بیرونی دروازے پر دستک سنائی دی، وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ فوراً ہی آئینے کے سامنے آ کر اپنا سراپا دیکھنے لگی۔ ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ دل ایسا باؤلا ہوا کہ حلق میں آ کر دھڑکنے لگا۔ کچھ دیر بعد ہی باپ نے کمرے میں آ کر کہا۔ ''تیار ہو تو آ جاؤ۔ بندہ آ گیا ہے۔'' یہ اس کی عادت تھی، جب بھی بیٹی کو کہیں رخصت کرتا تھا تو بڑی نرمی سے بولتا تھا۔

چاپلوسی تو اس کی گھٹی میں پڑی تھی۔ وہ چادر سنبھالتی ہوئی اس کے ساتھ باہر چلی گئی۔ چادر تو سنبھل رہی تھی لیکن پورا وجود ڈول رہا تھا۔ دل کی تو عجیب حالت تھی۔ سنبھالے نہیں سنبھل رہا تھا۔ ایک ہی خیال اس کے اندر گردش کر رہا تھا کہ اسے اس کی وحشتوں کا ساتھ ملنے والا ہے۔ وہ ساحل کی ریت ہے اور وہ جھونکا اسے اُڑانے والا ہے۔ وہ بہت دور تک نہ سہی، لیکن کسی حد تک تو اسے اپنے ساتھ اُڑا سکتا ہے۔

وہ خیالوں کی اُڑان بھرتی ہوئی اس کے پاس پہنچ گئی۔ کہاں تو صبح سے شام کرنے میں جیسے صدیاں لگ گئی تھیں، کہاں یہ کہ پلک جھپکتے ہی انتظار کا موسم گزر گیا تھا اور وہ اس کے رُوبرو ہوگئی تھی۔ سامنے پہنچتے ہی صم بکم سی ہوگئی تھی۔ آس پاس کی ہر چیز جیسے ہوا ہوگئی تھی۔ کوئی آواز، کوئی پکار کانوں کی دہلیز پار نہیں کر رہی تھی۔ سارا ماحول تھم سا گیا تھا، ایک وہی متحرک رہ گیا تھا، گونگے ہاتھوں کی بولیوں سے اس کا احوال پوچھ رہا تھا اور وہ بے حال ہو رہی تھی۔

وہ سمجھ رہی تھی کہ ملاقات کے بعد بے قراری کچھ کم ہو جائے گی لیکن کبھی کبھی آگ سے آگ بجھتی ہے۔ ورنہ بھڑکتی زیادہ ہے۔ وہ تو سوکھی لکڑی کی طرح آگ پکڑتی ہی جا رہی تھی۔ ایسے میں راکھ ہونے کی پرواہ نہیں تھی۔ دل دھڑک رہے تھے، شعلے بھڑک رہے تھے۔ جب گھٹائیں اُمنڈ کر آئیں، تب ساون بھادوں نے انہیں شانت کیا۔

وہ اس کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے بولی۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا ہے کہ مجھ بد نصیب کو اتنی محبتیں مل سکتی ہیں۔''

''اچانک ڈھیر ساری مسرتیں ملیں تو یقین نہیں آتا۔ اس کے باوجود ہم ان مسرتوں سے گزر رہے ہیں۔''

وہ بڑی چاہت سے اسے دیکھ رہی تھی پھر اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''بہت کچھ بدل گیا ہے، میں بدل گئی ہوں، آپ بدل گئے ہیں۔ آپ کی شادی ہو چکی ہے۔ آپ ایک بچے کے باپ بھی بن چکے ہیں مگر آپ کی باتیں اور آپ کے پیار کی وارداتیں نہیں بدلیں۔ وہی اندازِ دیوانگی ہے، سیدھے دل میں اُتر جاتے ہیں......''

وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گیا، اس کی گردن کی طرف جھکتے ہوئے بولا۔ ''میں صرف اپنے انداز کو ہی نہیں، اپنی ذات کو بھی تمہارے دل میں اُتارنا چاہتا ہوں۔''

وہ قربت سے پگھل رہی تھی مگر اس نے بڑے ہی کرب سے کہا۔ ''میں ایک کچا سا شکستہ

مکان ہوں، آپ ہمیشہ اس میں نہیں رہ سکیں گے۔"

وہ اس کے کرب کو محسوس کر رہا تھا۔ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا پھر بڑے ہی ٹھہرے ہوئے انداز میں بولا۔ "میں تمہیں تاج محل تو نہیں بنا سکتا لیکن جب تک پاکستان میں ہوں، تمہیں تنہائی کا احساس نہیں ہونے دوں گا۔"

اس نے بڑی حسرت سے اسے دیکھا پھر دل ہی دل میں کہا۔ "عارضی سہارا دینے والے تو فٹ پاتھ پر بھی مل جاتے ہیں۔ میں کیا کروں، میرا دل آپ ہی کو مانگتا ہے۔ آپ لندن میں اپنی بیوی اور بچے کے ساتھ ہیں، مجھے یہاں تنہا چھوڑ دیں۔ بس مجھے اپنے نام کر لیں۔ ہر عورت کے اندر چھپی ہوئی شریف زادی کسی ایک کے نام ہو کر جینا اور مرنا چاہتی ہے۔ حالات کی سولی پر لٹکنے والی یہ آخری خواہش ہے۔"

وہ حسرتوں کے صحرا میں بھٹک رہی تھی اور اسے بے اختیار دیکھے جا رہی تھی۔ وہ اس کے سامنے ہاتھ لہراتے ہوئے بولا۔ "کس سوچ میں گم ہو؟ کیا میں نے کچھ غلط کہہ دیا ہے؟"

وہ ایک گہری سانس لے کر انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "نہیں آپ غلط نہیں ہو سکتے، میرا مقدر ہی غلط ہے۔ بہت سوچتی ہوں، غور کرتی ہوں لیکن جینے کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔ پتا نہیں، میں کیوں پیدا ہوگئی؟ کوئی مکان، کوئی جانور، کوئی شوپیس اتنی بار نہیں بکتا ہوگا، جتنی بار میں رُلتی رہتی ہوں۔"

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ وہ اسے بازوؤں کے حصار میں لے کر تھپکنے لگا، خاموشی کی زبان سے تسلیاں دینے لگا۔ وہ تسلیاں نہیں، تحفظ چاہتی تھی لیکن حالات نے اس قابل نہیں چھوڑا تھا کہ وہ کھل کر اپنی ایک پاکیزہ خواہش کا اظہار کر پاتی، اس دلاسا دینے والے ہاتھ کو بڑی بے باکی سے تھام کر کہتی کہ ہر مسلمان شیطان مردود سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتا ہے۔ میں آپ کی پناہ مانگتی ہوں۔

وہ بڑی دیر تک سمیٹنے والے کے بازوؤں میں بکھرتی رہی پھر اس سے الگ ہو کر بولی۔

"وہ بڑی قسمت والیاں ہوتی ہیں، جنہیں دلہن کا روپ حاصل ہوتا ہے، کسی ایک کی قربت اور محبت حاصل ہوتی ہے۔ میں سہاگن نہیں بن پائی لیکن اپنی چھوٹی بہن کو دلہن بنانے کے بعد بہت پُرسکون ہوں پھر بھی یہ سکون، یہ خوشی میرے اندر کے خلا کو پُر نہیں کر رہی ہے۔"

وہ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ ایسے کھوئے کھوئے سے انداز میں بول رہی تھی، جیسے فاخرہ کے پاس پہنچ گئی ہو، اسے دلہن کے روپ میں دیکھ رہی ہو اور اس دلہن کے

اندر بیٹھ کر اپنے اندر کی دلہن کا ماتم کر رہی تھی۔ اس وقت ہونٹوں سے الفاظ یوں پھسل رہے تھے، جیسے دل کی دلدل میں کھلنے والے کنول کے پتے ٹوٹ رہے ہوں، بکھر رہے ہوں۔

وہ اس پر جھک کر اچانک ہی دھڑکتی ہوئی سرگوشی میں بولا۔ "دلہن بننا چاہتی ہو؟"

دل دھک سے رہ گیا۔ ایک لمحے کے لیے جیسے دھڑکنا بھول گیا اس نے بے یقینی سے سر گھما کر اسے دیکھا، دل کی بات محبوب کی زبان پر آ جائے تو لگتا ہے، وہ اس کے اندر بیٹھنے اور اس کے تمام چور جذبوں کو کھنگالنے کے بعد بول رہا ہے۔ وہ ایک ذرا پہلو بدل کر رہ گئی۔ اس نے تصدیق کرنے کے انداز میں پوچھا۔ "بولو؟ چپ کیوں ہو؟"

وہ فوراً ہی آگے کو جھک کر اس کے چٹان جیسے سینے سے لپٹ گئی۔ زندگی کے سیلاب میں بے دست و پا بہتے ہوئے ایک مضبوط سہارے سے آ کر ٹکرا گئی۔ ٹکرا کر جہاں پہنچی، وہیں تھم گئی۔

وقت بھی جیسے تھم گیا۔ وہ اس کی پناہ میں دبی دبی سی چھپی چھپی سی تھی، وہ اسے محبتیں دے رہا تھا، اس کے چہرے کو یوں چُھو رہا تھا، جیسے انگلی رکھ کر سبق پڑھ رہا ہو، چہرے کے نقوش کو ازبر کر رہا ہو۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔ نہ جانے کون کون سے جذبے تھے جن کی تکمیل ہو رہی تھی۔ کان کے پاس اس کی سرگوشی سنائی دی۔ "کہاں پہنچی ہوئی ہو؟"

وہ ایک ہائے کے ساتھ سانس چھوڑتے ہوئے بولی۔ "جہاں بھی ہوں، وہاں سے واپسی نہیں چاہتی۔"

وہ دھیرے سے بولا۔ "میں بھی نہیں چاہتا۔"

وہ خوشی سے کھل گئی، نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ "ہم جو چاہتے ہیں، وہ ہو سکتا ہے؟"

اس نے سانسوں کے ہجوم میں۔ "ہاں" کہا تو لگا۔ "ہائے جان!" کہہ رہا ہو۔

وہ اندر سے گھبرا کر بولی۔ "ان لمحات کو، ہمارے ارادوں کو کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ ہم جو سوچ رہے ہیں۔ کیا وہ ممکن ہے؟"

"لوگ تو ناممکن کو ممکن بنا دیتے ہیں، کیا ہم ایک مشکل کو آسان نہیں بنا سکتے؟"

اسے بڑا حوصلہ مل رہا تھا۔ ایسے وقت ہر عورت کے اندر سب سے پہلے سوکن چیختی ہے۔ لندن والی نے جھاڑو دکھاتے ہوئے کہا۔ "میں اپنے شوہر کو آسانی سے تمہاری جھولی میں

گرنے نہیں دوں گی۔''

اس نے پریشان ہو کر گل نواز کو دیکھا۔اس نے بڑے پیار سے پوچھا۔''کیا ہوا؟''

وہ ڈوبتے ہوئے لہجے میں بولی۔''آپ کی ایک چاہنے والی شریکِ حیات ہے۔آپ کا ایک پیارا سا بیٹا ہے۔کیا ان کے کچھ حقوق چھین کر مجھے دے سکیں گے؟''

وہ اس سے الگ ہوتے ہوئے بولا۔''چھین جھپٹ وہاں ہوتی ہے، جہاں انصاف نہیں ہوتا۔ میں تو انصاف کی بات کروں گا۔ میں سال کے چھ مہینے پاکستان میں گزارتا ہوں۔ایسے وقت وہ میرے ساتھ نہیں ہوتی۔وہ ایک تعلیم یافتہ باشعور عورت ہے۔میری اس بات سے قائل ہو جائے گی کہ میں نے اپنی ضرورت کسی چور دروازے سے پوری کرنے کے بجائے شادی کی ہے۔ مجھے یقین ہے، وہ میرے اس معاملے میں دردِ سر نہیں بنے گی۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔''کوئی عورت کتنی ہی تعلیم یافتہ اور باشعور کیوں نہ ہو، وہ کبھی اپنے شوہر کا بٹوارا نہیں چاہتی، اپنی حکومت میں کسی دوسری کو حصے دار نہیں بناتی۔اپنے شوہر کی سلطنت پر تنہا حکومت کرنے کے لیے عورت کو اپنا سب کچھ ہار کر جیتنا پڑتا ہے اور اپنی جیت کو ہار میں بدلنے والیاں اس دنیا میں بہت کم ہیں۔''

''میں تو اسے عورتوں کی حماقت کہوں گا۔جو کھلے دل سے اجازت نہیں دیتیں۔ان کے شوہر چور رستہ ضرور اختیار کرتے ہیں۔وہی راستہ جو میں اختیار کرنے والا ہوں۔''

یہ عورت کی فطرت ہوتی ہے کہ وہ بات سمجھنے کے باوجود نادانی ظاہر کرتی ہے۔وہ اس کی بات سمجھ گئی تھی پھر بھی انجان بنتے ہوئے بولی۔''کون سا راستہ؟''

وہ اس پر جھکتے ہوئے بولا۔''چور راستہ......مگر چور رشتہ نہیں، ہم چوری چھپے اپنے رشتے کو قانونی حیثیت دیں گے، ایک نام دیں گے، ایک پہچان دیں گے۔اب تمہارے وجود پر صرف میرے نام کی تختی لگی رہے گی۔تمہارے شیشے کے گھر میں آئندہ کوئی پتھر نہیں آئے گا۔''

وہ اسے بازوؤں میں بھر کر سمجھانے لگا کہ اس کے نام کی تختی کس طرح لگی رہے گی۔ نیلو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ ایسے وقت کیا کرے؟ دھاڑیں مار مار کر روئے یا خوشی سے ناچنا شروع کر دے؟ وہ اس کی گرفت میں تڑپ رہی تھی۔اس کے اندر گھسی جا رہی تھی اور وہ کھل کر قہقہے لگا رہا تھا۔

فاخرہ کی شادی کے بعد زندگی کی دوسری اور سب سے بڑی خوشی حاصل ہو رہی تھی۔

اب اس کی صرف ایک ہی رات نہیں، زندگی کی تمام راتیں دلہن بننے والی تھیں۔

☆======☆======☆

اسپتال ایک دوراہا ہے، یہاں سے کوئی موت کی طرف جاتا ہے اور کوئی نئے سرے سے زندگی کی طرف چل پڑتا ہے۔اس دوراہے پر کچھ بدنصیب ماتم کناں ہوتے ہیں اور کچھ خوش نصیبوں کو نئی زندگی کی خوشیاں مل جاتی ہیں۔

یہاں کبھی زندگی کی آخری ہچکی سسکتی ہے، کبھی نئی زندگی کی ننھی منی صدائیں سنائی دیتی ہیں۔اور ایسی زندگی بھی ملتی ہے، جس کا پہلے سے کوئی وجود نہیں ہوتا۔ایسا وجود تخلیق کی کوکھ سے تڑپ کر نکلتا ہے اور ایک ماں کو خدا کے بعد تخلیق کار بنا دیتا ہے۔

فاخرہ تخلیق کے کرب سے گزرنے کے بعد ساری تکلیف بھول گئی تھی۔اس ننھے منے سے وجود کو دیکھ رہی تھی، یقین کرنا چاہتی تھی کہ وہ اسی کے وجود سے باہر آیا ہے جانے کب سے اس کے اندر چھپا ہوا تھا؟ کیا اس وقت سے، جب وہ دلہن بنی تھی یا تب سے جب وہ خود پیدا ہوئی تھی؟......

اس کے اندر عجیب سے خیالات پیدا ہو رہے تھے۔جو بھی سوچ ابھر رہی تھی، وہ یہی کہہ رہی تھی کہ یہ تیرے وجود میں برسوں سے پوشیدہ خزانے کی طرح چھپا ہوا تھا۔تیری زندگی میں مشتاق کے بجائے کوئی دوسرا بھی آتا تو نتیجے کے طور پر یہی تیرے پہلو میں آتا۔

وہ اسے بڑی محبت سے چھو رہی تھی، وہ روئی جیسا نرم نرم سا تھا، اس کی انگلیوں کے پوروں کو جیسے اپنے اندر سمو رہا تھا۔دل تھا کہ اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ایسے وقت کوئی اس سے پوچھتا، یہ کیا دوغلا پن ہے؟ باپ سے بے زار، بیٹے سے محبتیں ہزار۔باپ کی طرف کبھی دل مائل نہیں ہوا اور اپنے بیٹے کے لیے ایسی ممتا اُمنڈ رہی ہے، جیسے اس ایک بیٹے کو پیدا کرنے کے لیے ہی پیدا ہوئی تھی۔

اس نے جھک کر اسے چوم لیا۔اسے دیکھتے وقت، چومتے وقت سوچ پیدا ہوئی۔''بے شک، یہ میری پیدائش کے پہلے لمحے سے میرے اندر چھپا ہوگا لیکن اسے دنیا میں لانے کا وسیلہ مشتاق ہے۔چاہے شوہر کوئی بھی ہوتا، بیٹا تو یہی ہوتا مگر ناک نقشہ یہ نہ ہوتا۔شاید یہ کشش بھی نہ ہوتی، جو ابھی محسوس ہو رہی ہے۔''

اس کے دل نے انکار کیا۔''نہیں۔مجھے اس کے ناک نقشے سے نہیں، اس کے وجود سے پیار ہے۔کیونکہ یہ میرے وجود سے نکل کر آیا ہے۔یہ مشتاق پر نہیں، مجھ پر گیا ہے۔اس

کی صورت دیکھو تو صاف پتا چلتا ہے کہ یہ باپ جیسا نہیں، ہو بہو ماں جیسا ہے۔"

وہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھی کہ اس کے بیٹے میں اس مرد کا بھی حصہ ہے، جس کی طرف دل کبھی مائل نہیں ہوا، جس کے ساتھ کبھی عشق کے مرحلے میں داخل نہیں ہوئی، بس اس سے رسمی سی ازدواجی رفاقت رہی۔

اس رسمی سی رفاقت کا ننھا سا نمونہ اس کے پہلو میں رکھا ہوا تھا۔ وہ اسے بڑی توجہ سے، بڑی لگن سے دیکھنے لگی۔ جانے کیسے اس ننھے سے چہرے پر اچانک ہی مشتاق کا چہرہ ابھرنے لگا، جیسے خاموشی کی زبان سے کہنے لگا۔ "تم مجھے آنکھوں سے دل میں اُتار رہی ہو۔ میں اسی باپ کا بیٹا ہوں جس کی اہمیت سے تم منکر ہو۔ تمہارے ہزار انکار کے باوجود میری ولدیت اسی کی رہے گی۔ کیا میں اپنے باپ کے لیے تمہارے دل میں محبت کا شعلہ بھڑکا نہیں سکوں گا؟"

اس نے الجھے ہوئے ذہن سے معصوم بیٹے کا سوال سنا۔ اس سوال کا جواب وہ نہیں جانتی تھی۔ پتا نہیں کیا وجہ تھی، وہ اچانک ہی بلبلا کر رونے لگا۔ ننھا سا گلابی سا چہرہ سرخ ہونے لگا، جیسے جواب نہ ملنے پر طیش میں آ رہا ہو۔

وہ ایک دم سے تڑپ گئی۔ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اسے آغوش میں لے کر چومنے لگی، بہلانے لگی۔ چپ کرانے کے لیے دودھ کی نہر منہ میں لگا دی۔ یوں ممتا کا خزانہ لٹاتے وقت بڑا سکون حاصل ہو رہا تھا۔ اس نے بڑے سرور میں آنکھیں بند کر لیں، ان لمحوں کو اپنے اندر جذب کرنے لگی۔

ایسے ہی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا، مشتاق ایک بوڑھی نرس کے ساتھ اندر آیا تھا۔ اس نے کہا۔ "بڑے ڈاکٹر صاحب آئے ہیں۔ بچے کو چیک اَپ کے لیے لے جانا ہے۔"

اس نے پریشان ہو کر ممتا سے سیراب ہوتے ہوئے بچے کو دیکھا پھر کہا۔ "یہ بھوکا ہے۔ تھوڑی دیر رک جاؤ۔ ذرا اس کا پیٹ بھر جانے دو پھر لے جانا۔"

نرس نے کہا۔ "او بی بی! دودھ بعد میں پلاتی رہنا۔ بڑے ڈاکٹر ابھی آئے ہیں، ابھی چلے جائیں گے۔ وہ کسی کا انتظار نہیں کرتے...... لاؤ اسے مجھے دو۔"

وہ اسے اپنی آغوش میں سمیٹتے ہوئے بولی۔ "وہ کسی کا انتظار نہیں کرتے تو نہ کریں۔ میں ان کی خاطر اسے بھوکا نہیں رکھوں گی۔"

نرس نے مشتاق کو دیکھا۔ اس نے فاخرہ سے کہا۔ "دس منٹ لگیں گے۔ اتنی سی دیر میں اسے کچھ نہیں ہوگا۔ چیک اَپ ضروری ہے۔ یہ ابھی اسے واپس لے آئیں گی۔"

وہ اسے گھورتے ہوئے بولی۔ "دس منٹ لگیں یا بیس منٹ۔ اس کی بھوک ختم ہوگی تب ہی اس سے دودھ چھڑاؤں گی۔"

نرس نے ناگواری سے کہا۔ "کیوں خوامخواہ وقت برباد کر رہی ہو؟ میں نے کہا نا، ڈاکٹر صاحب تھوڑی دیر کے لیے آئے ہیں۔ چلے جائیں گے تو بچے کا چیک اَپ رہ جائے گا۔"

اس نے پریشان ہو کر مشتاق کو دیکھا۔ وہ اسے سمجھانے کے انداز میں بولا۔ "ابھی اس کی بھوک اتنی اہم نہیں ہے، جتنا کہ چیک اَپ اہم ہے۔ لاؤ، اسے سسٹر کو دو۔ بعد میں دن رات دودھ پلاتی رہنا۔"

نرس اس کی ممتا سے بیزار ہو رہی تھی۔ ناگواری سے بولی۔ "او بی بی! اتنے چونچلے نہ دکھاؤ۔ اس کی بھوک تم سے برداشت نہیں ہو رہی ہے۔ جب یہ انجکشن لگاتے وقت روئے گا تب کیا کرو گی؟ اسے ایسی ممتا دو گی تو یہ مر جائے گا۔"

اس کی بات سنتے ہی وہ بپھر گئی۔ ایک دم سے تڑخ کر بولی۔ "مرے گی تُو، مرے گا تیرا خصم۔ میرے بچے کے لیے کالی زبان سے کوئی بات نکالی تو میں تیرا منہ نوچ لوں گی۔ جا کہہ دے اپنے ڈاکٹر سے...... میں اپنے بچے کا معائنہ نہیں کراؤں گی۔ اس کی دوا، اس کا علاج خدا نے میرے سینے میں محفوظ رکھا ہے۔ اسے سوئی چبھونے والے انجکشنوں کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ ایسی شعلہ بار نظروں سے گھور رہی تھی، جیسے ابھی کاٹ کھائے گی۔ نرس اس کے تیور دیکھ کر سہم گئی۔ ذرا پیچھے ہٹ گئی پھر غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ مشتاق نے غصے اور بے بسی سے فاخرہ کو دیکھا پھر معذرت چاہنے کے لیے نرس کے پیچھے چلا گیا۔

وہ اپنے لاڈلے کو دودھ پیتا دیکھ رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کی جان بچے کے اندر سما گئی ہے۔ خود ایک خالی وجود ہے اور آئندہ اسے اپنے خول میں چھپائے رکھنے کے لیے زندہ رہے گی۔

وہ اس کی قربت میں مست تھی، ایسے ہی وقت مشتاق کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ ناگواری سے کہہ رہا تھا۔ "تمہیں میری عزت کا، ایک شوہر کے مان مرتبے کا کوئی خیال، کوئی لحاظ نہیں ہے۔ تم نے بچے کو معائنے کے لیے نہیں دیا۔ میرے کہنے کے باوجود انکار کر دیا۔ کیا

میں اس کا باپ نہیں ہوں؟''

''سینے میں باپ کا دل ہوتو بھو کے بچے کو سوئی چبھونے کے لیے لے جانے کی بات نہ کرتے۔ میرے بچے کی خوش نصیبی سے باپ بن گئے، یہی بہت ہے۔ خواہ مخواہ اکڑ نہ دکھاؤ۔''

''تمہارے ایسے تیور دیکھ کر وہ تھپڑ یاد آ جاتا ہے، جو شادی سے پہلے ایک وارننگ تھا کہ میری زندگی میں آؤ گی تو مجھے کبھی محبت نہیں دو گی، ہاتھ اٹھائے بغیر نفرت اور بیزاری کے اَن دیکھے تھپڑ مارتی رہو گی۔ کیا ہی اچھا ہوتا کہ میں اس پہلے تھپڑ سے ہی سبق حاصل کر لیتا؟''

فاخرہ نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ مشتاق نے بچے پر ایک نظر ڈالی پھر کہا۔

''تمہارے دل میں میرے لیے جو برائے نام محبت تھی، پچھلے تین دنوں سے وہ بھی نہیں رہی۔ دن رات بچے کی طرف توجہ دے رہی ہو اور مجھے نظر انداز کر رہی ہو۔ اتنا بھی نہیں سوچ رہی ہو کہ میرے ہونے سے یہ ہے، میں نہ ہوتا تو یہ بھی نہ ہوتا۔''

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ اس کا بجھا بجھا سا چہرہ اس کے اندر کی کیفیت سمجھا رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''کیا تم اس کی پیدائش پر خوش نہین ہو؟''

وہ ایک گہری سانس لے کر اس کے قریب بیٹھ گیا، اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ پہلو بدل کر بولی۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟''

''تمہارے چہرے کا رنگ دیکھ رہا ہوں۔ بہت خوش ہو۔ اس نے آ کر تمہاری دنیا ہی بدل دی ہے۔''

وہ تائید میں سر ہلا کر بولی۔ ''ہاں۔ پہلے یہ اندیشہ تھا، دل دہلتا رہتا تھا کہ پتا نہیں کیا ہونے والا ہے؟ مگر اس نے تو ہو کر میری دنیا ہی بدل دی ہے، میری سوچ بدل دی ہے۔ اسے دیکھ کر لگتا ہے، پہلے میں ادھوری تھی، اب مکمل ہو گئی ہوں۔''

''عورت صرف اپنے شوہر کی رفاقت سے مکمل ہوتی ہے۔''

وہ جیسے حقیقت سے نظریں چرا رہی تھی، اس سے کترا رہی تھی۔ بات بدلتے ہوئے بولی۔ ''مجھے باجی یاد آ رہی ہیں۔ انہیں یہ بتانے کی بے چینی ہو رہی ہے کہ وہ خالہ بن گئی ہیں۔''

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا، پھر اس کا ہاتھ تھام کر ہتھیلی کو سہلاتے ہوئے بولا۔ ''شادی کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے میں غلط پیش گوئی کرتا ہوں۔ لکیروں کی تحریروں

سے انجان ہوں، بس قیاس آرائیاں کرتا ہوں۔ تمہاری ایک لکیر دیکھ کر میں نے جو پیش گوئی کی تھی وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پھیکی پڑتی جا رہی تھی۔ شادی اور ازدواجی تعلقات سے گزرنے کے بعد بھی تم جیسی تھیں، ویسی ہی رہیں۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟''

وہ قائل ہونے کے انداز میں بولی۔ ''ہاں...... تم درست کہہ رہے ہو۔ تمہاری پیش گوئی نے مجھے تجسس میں مبتلا کیا تھا۔ یہ شادی بھی ایک تجسس کا نتیجہ ہے۔ میں خود کو آزمانا چاہتی تھی۔ امید تھی کہ میں اسی کے عشق میں گرفتار ہوں گی جو میرے انتہائی قریب رہے گا لیکن تمہارے آنے سے بھی میری سوچ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔''

اس نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ ''کیا اب تم نے اپنا تجزیہ کیا ہے؟ کیا اب کسی تبدیلی کو محسوس کر رہی ہو؟''

اس نے ایک ذرا چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ''سوچو! غور کرو! کیا تم کسی مرد ذات کی طرف مائل نہیں ہو رہی ہو؟ اپنے آس پاس دیکھو! کوئی جنس مخالف ہے جو تمہیں ہر لمحہ اپنی طرف کھینچ رہا ہے اور تم جانے انجانے میں اس کی طرف کھینچی چلی جا رہی ہو۔''

وہ شوہر کی باتیں سن رہی تھی مگر اس کی نظریں اس ننھے منے سے وجود پر جمی ہوئی تھیں۔ جو ابھی اس کے سہارے کا محتاج تھا مگر جوان ہونے کے بعد چٹان جیسا مضبوط ہو کر سہارا دینے والا تھا۔

وہ چشمِ تصور میں اپنے گبرو جوان بیٹے کو دیکھنے لگی، وہ اس کے چوڑے چکلے سینے سے لگی ہوئی تھی بلکہ چھپی ہوئی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ساری دنیا کی نظروں سے اوجھل ہو گئی ہے، محفوظ ہو گئی ہے۔ عجیب سی بات تھی۔ ہمیشہ جنس مخالف سے، نفرت کرنے والی کا دل جوان بیٹے کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ اس کے مضبوط بازوؤں کی پناہ میں آ کر وہ خود کو بہت محفوظ اور پُر سکون تصور کر رہی تھی۔ نہ جانے یہ کیسا تصور تھا کہ وہ اس میں گم ہونے کے بعد اپنے مجازی خدا کو بھول گئی تھی۔

وہ کچھ دیر تک اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا مگر بتِ جاں میں جان نہ پڑی۔ وہ ایک گہری سانس لے کر ہارے ہوئے جواری کی طرح وہاں سے اُٹھ گیا، سر جھکا کر کمرے سے باہر آیا۔ اسے شدت سے احساس ہو رہا تھا۔ کہ وہ فاخرہ کے حسن و شباب کی چکا چوند میں اندھا ہو گیا تھا۔ ایک اندھے کی طرح بھٹک رہا تھا، نہ گھر کا رہا تھا، نہ گھاٹ کا، نہ بیوی کا رہا تھا نہ

ماں کا۔

وہ چلتے چلتے ٹھٹک گیا۔ سامنے ماں کھڑی ہوئی تھی۔ جب سے فاخرہ اس کی زندگی میں آئی تھی، تب سے ماں باپ کے گھر میں بیٹے کا داخلہ ممنوع ہو گیا تھا۔

ماں اپنی ممتا سے مجبور ہوتی ہے۔ وہ شوہر سے چھپ کر بیٹے سے رابطہ رکھتی تھی۔ کبھی کسی بس اڈے پر ملتی تھی، کبھی اس فیکٹری کے گیٹ پر پہنچ جاتی تھی، جہاں بیٹا کام کرتا تھا۔ ماں ہر ملاقات میں پوچھتی تھی کہ تمہیں اپنے غلط فیصلے کا احساس ہو رہا ہے؟

اسے تو شادی کی پہلی رات سے ہی احساس ہونے لگا تھا لیکن غلطی کرنے والے شرمندگی کے باعث اعتراف نہیں کرتے۔ اپنی غلطی کو سدھارنے اور شرمندگی کو چھپانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

ماں اس کا ہاتھ پکڑ کر سمجھاتی تھی۔ ''بیٹے! اس کی بڑی بہن کے بارے میں طرح طرح کی باتیں بنائی جاتی ہیں۔ باتیں بنانے والے چھوٹی پر بھی کیچڑ اچھالتے ہیں۔ کیا تم ایسی بدنام ہونے والی کے ساتھ پوری زندگی گزار سکو گے؟''

وہ سر جھکا کر بولا۔ ''یہ ضروری نہیں ہے کہ بدنام ہونے والے بدکردار بھی ہوں۔ فاخرہ ایسی نہیں ہے۔''

''تم دنیا والوں کی زبان کہاں تک پکڑو گے؟ تمہاری بہن کے سسرال والوں نے صاف طور سے کہہ دیا ہے کہ ہم بدنامی کو گھر لائیں گے تو وہ ہماری بیٹی کے لیے برات نہیں لائیں گے۔''

''امی! اسی لیے تو میں نے اسے گھر سے دور رکھا ہے۔ ابو نے تو کہہ دیا ہے، نہ اسے گھر میں آنے کی اجازت ملے گی، نہ مجھے......''

''وہ کیسے اجازت دے سکتے ہیں۔ ابھی اور چار بیٹیاں بیٹھی ہیں۔ وہ تمہارے لیے جیسی بھی ہے، ہمارے لیے تو دشمن ہے۔ ہمارا پلا پلایا بیٹا ہم سے چھین لیا ہے۔''

وہ ایسی باتوں سے کترا جاتا تھا۔ اس وقت ماں کو اسپتال میں دیکھ کر بولا۔ ''آپ یہاں؟ خیریت تو ہے؟''

ماں نے بیٹے کو گہری نظروں سے دیکھا۔ وہ نظریں کہہ رہی تھیں۔ ''تم جانتے ہو، میں یہاں کیوں آتی ہوں؟''

بیٹے نے سر جھکا لیا۔ وہ بولی۔ ''جب سے سنا ہے کہ پوتا ہوا ہے، تب سے اسے دیکھنے

کے لیے دل مچل رہا ہے۔ تمہارے ابو نے سب ہی کو سختی سے منع کیا ہے کہ کوئی بچے کو دیکھنے نہیں جائے گا۔ میں تین دنوں سے دل کو سمجھا رہی ہوں۔ آج بہت مجبور ہو کر تمہارے باپ سے چھپ کر آئی ہوں۔''

وہ ماں کے شانے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ ''ان کے حساب سے غلطی میں نے کی ہے۔ مجھے گھر سے نکال کر سزا دے دی گئی ہے۔ میرے بیٹے کو تو سزا نہیں ملنی چاہیے۔ آپ آئیں، وہ آپ کا پوتا ہے۔ اسے آپ کی گود میں ہونا چاہیے۔''

وہ ماں کے ساتھ چلتا ہوا فاخرہ کے کمرے تک آیا پھر دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ''فاخرہ! دیکھو، کون آیا ہے؟''

اس نے سر اٹھا کر دیکھا، پھر ساس کو دیکھتے ہی ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ فوراً ہی اپنے بیٹے پر دوپٹا ڈال کر اسے چھپا لیا۔ تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کیوں آئی ہیں؟ جب مجھے ان کے گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ہے تو تم میری اجازت کے بغیر انہیں یہاں کیوں لائے ہو؟''

وہ ماں کے سامنے شرمندہ سا ہو رہا تھا۔ غصہ دکھاتے ہوئے بولا۔ ''کیا بکواس کر رہی ہو؟ یہ میری امی ہیں، میرے بیٹے کی دادی ہیں۔ یہ جب چاہیں کسی اجازت کے بغیر آ سکتی ہیں۔''

''جب میں ان کے پاس نہیں جا سکتی تو یہ بھی مجھ سے ملنے نہیں آ سکتیں۔''

ساس نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے نہیں، اپنے پوتے سے ملنے آئی ہوں۔''

''یہ صرف میرا بیٹا ہے۔ کسی کا پوتا نہیں ہے۔ جب دودھیال والے اس کی ماں کے لیے مر چکے ہیں تو اس کے لیے بھی مر چکے ہیں۔''

مشتاق اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''زبان کو لگام دو، منہ توڑ دوں گا۔''

وہ تن کر بولی۔ ''رک کیوں گئے؟ آؤ توڑ دو میرا منہ...... میری جان لے لو...... لیکن میں اپنے بیٹے کا منہ اس عورت کو نہیں دکھاؤں گی۔ اگر کوئی اسے چھوئے گا تو میں اس کے ہاتھ توڑ دوں گی۔'' وہ اس کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولی۔ ''کیا تمہارے دل میں انصاف نہیں ہے؟ جو مجھ پر کیچڑ اچھالتے ہیں، مجھے اپنے دروازے پر آنے نہیں دیتے تم انہیں میرے پاس لائے ہو؟ اگر مجھ سے اور میرے بچے سے محبت ہے تو انصاف سے فیصلہ کرو۔ پہلے مجھے

اس گھر میں لے جاؤ، جہاں مجھے عزت نہیں ملی۔ اپنی ماں کی عزت کرانا چاہتے ہو تو اس سے میری بھی عزت کراؤ۔"

مشتاق نے دروازے کی طرف دیکھا پھر کہا۔ "یوں چیخ چیخ کر مت بولو۔ کیا تماشا بنانا چاہتی ہو؟"

"اگر تم چاہتے ہو تماشا نہ ہو، تمہاری اور تمہارے ماں باپ کی ناانصافیاں دنیا والوں کو معلوم نہ ہوں تو انہیں واپس لے جاؤ۔ ورنہ میں بدنام ہوں تو سب کے سامنے ان سے اپنی بدنامی کا ثبوت طلب کروں گی۔ یہ جو نیک نام بنتی ہیں تو انہیں بھی اپنی نیک نامی کا سرٹیفکیٹ پیش کرنا ہوگا۔"

ساس نے اسے ذرا چونک کر دیکھا۔ وہ مشتاق سے بولی۔ "یہ نہ بھولو کہ میں تمہاری بہن کی سہیلی رہ چکی ہوں۔ اس کے بہت سے اہم رازوں سے واقف ہوں۔ یہ میری شرافت ہے کہ میں نے تمہاری نیک نامی کی خاطر اس پر کبھی کیچڑ نہیں اچھالی۔"

پھر اس نے ساس کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "کیچڑ اچھالنا میں بھی جانتی ہوں، آپ میرے بیٹے کو ہاتھ لگا کر تو دیکھیں۔"

ساس نے گھبرا کر، پریشان ہو کر اپنے بیٹے کو دیکھا پھر وہ ایک دم سے پلٹ کر اتنی تیزی سے باہر گئیں جیسے ٹائیفون کے چھڑکتے ہی مکھیاں چلی جاتی ہیں۔

مشتاق نے غصے اور بے بسی سے اسے دیکھا پھر پاؤں پٹختا ہوا ماں کے پیچھے چلا گیا۔

☆======☆======☆

حالات بدل جائیں تو ظاہر سے باطن تک سب کچھ بدل جاتا ہے۔ ایک ذراسی تبدیلی نے جینے کا ڈھنگ بدل دیا تھا۔ اس کے وجود کے خالی مکان کو گھر کر دیا تھا۔ اس کے ماتھے کی نیم پلیٹ پر ایک ہی نام ثبت ہو گیا تھا اور اس نام سے جڑتے ہی وہ مکمل ہو گئی تھی۔ تکمیل کا ایک ایک پل، ایک ایک لمحہ نیا نویلا سا لگ رہا تھا اور نئی نویلی دلہن اس عروسی کمرے میں راجا گل نواز کی منتظر تھی۔

بستر پر گلاب کی پتیاں بکھری ہوئی تھیں۔ نیلو اس حنائی ہتھیلی سے انہیں اور ادھر اُدھر کر رہی تھی۔ اس کے تمام تر جذبے ان ملائم پتیوں کی نرمی اور ٹھنڈک سے ہم رنگ اور ہم آہنگ تھے۔ ان کا اور دلہن کا مقدر ایک تھا۔ دونوں کھل رہی تھیں اور دونوں ہی کھلنے اور مسلے جانے کے لیے ہوتی ہیں۔ حنا کی پتیاں ہوں یا سیج کا پھول ہو مسلنے کے بعد ان پر رنگ اور نکھار آتا

ہے۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر دروازے کی طرف دیکھا، آہٹ پہ کان تھے، در پہ نظریں مگر وہ نظر آنے والا نہ جانے کہاں رہ گیا تھا، اس نے سر اٹھا کر دیوار گیر گھڑی میں وقت دیکھا۔ ایک گھنٹا گزر گیا تھا۔ تشویش بڑھنے لگی تو وہ بستر سے اُتر کر بیرونی دروازے کی طرف آئی پھر کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کرنے لگی۔ دور کسی کمرے میں کوئی باتیں کر رہا تھا۔ الفاظ واضح نہیں تھے لیکن بولنے کا انداز سمجھا رہا تھا کہ جھگڑا ہو رہا ہے۔

اس نے کچھ سوچ کر ہینڈل پر دباؤ ڈالا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔ وہ ذرا جھک کر باہر جھانکنے لگی۔ کوریڈور ادھر تک ویران دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے سمت کا اندازہ کیا، باتوں کی آواز ڈرائنگ روم سے آ رہی تھی۔

وہ کمرے سے نکل کر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس طرف جانے لگی۔ الفاظ واضح ہونے لگے، آواز اور لب ولہجہ بھی واضح ہونے لگا۔ وہ پاپ کی دنیا سے نکل آئی تھی مگر باپ نے اس کا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ اس کا تعاقب کرتا ہوا یہاں تک آ پہنچا تھا۔ وہ دروازے پر رک گئی، باپ اور گل نواز کے درمیان ہونے والی باتیں سننے لگی۔

وہ کہہ رہا تھا۔ "آپ جھوٹ بول رہے ہیں، وہ اپنے باپ، اپنے سرپرست کی اجازت کے بغیر اتنا بڑا اقدم کیسے اٹھا سکتی ہے؟"

گل نے ہاتھ میں تھاما ہوا کاغذ اس کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ "یہ نکاح نامہ دیکھنے کے بعد بھی آپ کو یقین نہیں آ رہا ہے۔"

"کاغذ کا ٹکڑا دکھا کر آپ میری بیٹی کو مجھ سے نہیں چھین سکتے۔ نیلو کو بلائیں، ورنہ میں پولیس کو بلا لوں گا۔ باپ کی مرضی کے بغیر بیٹی کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ یہ نکاح نامہ جعلی ہے۔ میں آپ پر کیس کروں گا۔"

وہ بولا۔ "قانونی جنگ کی بات نہ کریں۔ یہ نکاح نامہ رجسٹرڈ ہے، اسے چیلنج کریں گے تو منہ کی کھائیں گے اور اگر یہی شوق ہے تو ابھی میرے ساتھ تھانے چلیں۔"

اس نے سوچتی ہوئی نظروں سے اپنے داماد کو دیکھا۔ ایک سونے کی چڑیا پہلے ہی اُڑ چکی تھی۔ اب دوسری کو بھی پَر مل گئے تھے۔ یہ ایسا نقصان تھا کہ وہ برداشت نہیں کر پا رہا تھا۔ ایک ذرا جھنجھلا کر بولا۔ "آپ میری بیٹی کو تو بلائیں۔"

نیلو نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔ "مجھے بلا کر کیا کرو گے؟

یہاں کیوں آئے ہو؟"

اس نے چونک کر بیٹی کو دلہن کے لباس میں دیکھا پھر اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

"بیٹی! یہ میں کیا دیکھ رہا ہوں؟"

وہ ناگواری سے بولی۔ "سہاگ کا جوڑا تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا، کیونکہ تم صرف کفن پہنانا جانتے ہو۔"

وہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "نہیں...... ایسا نہیں ہوسکتا۔ تم ایسا نہیں کرسکتیں۔ شادی بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ اتنا بڑا قدم اٹھانے سے پہلے میری رائے تو لی ہوتی۔"

"کیوں لیتی؟ جب میں نے فاخرہ کو دلہن بناتے وقت تم سے اجازت نہیں لی۔ تو پھر اپنی زندگی کا یہ اہم فیصلہ کرنے کے لیے تم سے مشورہ کیوں لیتی؟ تمہاری بتائی ہوئی ڈگر پر مجھے جتنے گام چلنا تھا وہ میں چل چکی ہوں۔"

اس نے بے بسی سے بیٹی کو دیکھا، وہ ریت کی طرح مٹھی سے پھسل چلی تھی۔ اب لاکھ جتن کے بعد بھی ہاتھ آنے والی نہیں تھی۔ اس نے گل نواز کو مخاطب کرتے ہوئے شکایتی انداز میں کہا۔ "یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔"

وہ بولا۔ "میں نے برا نہیں کیا۔ میں اسے اپنا نام دے کر لایا ہوں۔ آپ باپ ہیں، آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ بیٹی سہاگن بن گئی ہے۔"

وہ دل ہی دل میں بڑبڑایا۔ "اونہہ۔ یہاں ماتم کرنے کو جی چاہ رہا ہے اور یہ نئے داماد جی خوش ہونے کا مشورہ دے رہے ہیں۔ بھلا یہ میرے نقصان کو کیا سمجھیں گے؟ بیٹی نے نکاح نہیں کیا ہے، بلکہ میری طرف فاقوں کا منہ کھول دیا ہے۔ اب ان کا منہ بند کرنے کے لیے داماد جی! آپ کو اپنی سیف کا منہ کھولنا ہوگا۔"

وہ جبراً مسکراتے ہوئے بولا۔ "بیٹی کے سہاگن بننے پر والدین سے زیادہ بھلا اور کسے خوشی ہوگی؟ میں بھی خوش ہوں۔ بس صدمہ ہے تو صرف اس بات کا کہ اس نے مجھے دھوکے میں رکھ کر شادی کیوں کی؟ چور راستہ اختیار کیوں کیا؟"

گل نواز نے کہا۔ "جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ اب اس بحث میں الجھ کر کیا ملے گا؟"

اس نے ایک نظر بیٹی پر ڈالی پھر بڑے ہی درد بھرے لہجے میں کہا۔ "بیٹی کا گھر بس گیا ہے، مجھے واقعی خوش ہونا چاہیے، مگر کیا کروں؟ ایک طرف شادی خانہ آبادی ہوئی ہے اور دوسری طرف مجھ بوڑھے کی بربادی کا وقت آ گیا ہے۔ اس ہانپتی کانپتی عمر میں ایک یہی میرا سہارا تھی۔"

اتنا کہہ کہ اس نے چور نظروں سے داماد کو دیکھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس کی باتیں داماد کو متاثر کر رہی ہیں یا نہیں؟ دوسری طرف بیٹی خاموشی سے اسے گھور رہی تھی۔ اس کی بے غیرتی کی انتہا دیکھنا چاہتی تھی۔

وہ ایک ذرا توقف سے بولا۔ "میری حالتِ زار ایسی ہو جائے گی کہ یہ کمزور ہاتھ لقمہ اٹھاتے وقت بھی لرزنے لگیں گے۔"

نیلو نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جو کہنا چاہتے ہو، کھل کر کہو۔"

وہ باچھیں پھیلا کر مسکراتے ہوئے بولا۔ "اب میں کھل کر کیا کہوں؟ تم سمجھدار ہو، راجا صاحب نے بھی دنیا دیکھی ہے۔ چہرے سے دل کا حال جان لیتے ہوں گے۔"

وہ سسر کی بات سن کر مسکرانے لگا۔ نیلو نے ذرا حقارت بھرے لہجے میں کہا۔ "یہ صرف دل کا حال ہی نہیں جانتے، بندے کی رگ رگ کو بھی پہچان لیتے ہیں۔"

گل نے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ "اور میں تو انہیں برسوں سے پہچانتا آ رہا ہوں۔ ان کا تو مجھ پر بڑا احسان ہے۔"

نیلو نے چونک کر اسے دیکھا۔ بھولے خاں یوں خوش ہو گیا تھا جیسے واقعی اس نے کوئی بہت بڑا احسان کیا ہو۔ گل نواز نے نیلو کو محبت سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "یہ قصائی کے بجائے باپ ہوتے تو تم میری زندگی میں نہ آتیں۔"

بھولے خاں جھینپ کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ نیلو مسکرانے لگی۔ گل نواز نے کہا۔

"حکومت ہم سے سیلز ٹیکس وصول کرتی ہے۔ علاقے کے بدمعاش غنڈا ٹیکس لیتے ہیں اور یہ باپ، بیٹی ٹیکس وصول کرنے آیا ہے۔"

وہ بے حیائی سے مسکراتے ہوئے بولا۔ "آپ تو بڑے لوگ ہیں جب چاہیں ہم سے مسخری کر سکتے ہیں۔ میں تو آپ کو سخی داتا مان کر آیا ہوں۔ آپ جانتے ہیں، میرا کوئی جوان بیٹا نہیں ہے، بڑھاپے کا کوئی سہارا نہیں ہے۔ بس یہی ایک جوان بیٹی تھی۔ جس کے دم سے میرا بڑھاپا گزر رہا تھا۔ اب تو آپ کے دم قدم سے اور آپ کی سخاوت ہی سے دو روٹیوں کا سہارا چاہتا ہوں۔ میں یہاں بیٹی کے گھر میں لقمے توڑنا نہیں چاہتا۔ بس آپ اتنی رقم دے دیں کہ کسی کی محتاجی کے بغیر میرا بڑھاپا گزر جائے۔"

نیلو نے ناگواری سے کہا۔ "تم تو شیطان کی عمر لے کر آئے ہو۔ تمہارا بڑھاپا تو ہماری

جوانی کو کھانے کے بعد بھی بھوکا ہی رہے گا۔تم ہمیشہ ہاتھ پھیلا کر مانگتے ہی رہو گے۔''

وہ جلدی سے انکار میں ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا۔''نہیں......نہیں...... میں ہمیشہ کی جھنجھٹ نہیں رکھنا چاہتا۔بس ایک بار موٹی رقم دے دو پھر ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔''

وہ غصے میں کچھ بولنا چاہتی تھی۔گل نواز نے تھپکنے کے انداز میں اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔''ذرا ادھر آؤ۔''

وہ اس کے ساتھ چلتی ہوئی ڈرائنگ روم سے باہر آئی پھر کوریڈور میں رک کر بولی۔''میں آپ کی دریا دلی کو خوب جانتی ہوں۔ان کا بڑھاپا دیکھ کر آپ کا دل پسیج رہا ہوگا۔''

وہ بولا۔''اگر ہم تھوڑی سی مدد کریں اور ان کا بڑھاپا کسی کی محتاجی کے بغیر عزت سے گزر جائے تو اچھی بات ہے۔''

''آپ ان کی تھوڑی سی مدد کیا کرنا چاہتے ہیں؟ کیا انہیں کچھ رقم دینا چاہتے ہیں؟''

''ہاں۔یہ پسماندہ علاقے میں رہتے ہیں۔پچیس پچاس ہزار میں ایک چھوٹی سی دکان کھول کر عزت سے تین وقت کی روٹیاں کھا سکتے ہیں۔''

وہ بولی۔''عزت کی روٹی تو ان کے نصیب میں ہی نہیں ہے۔جب میں نے فاخرہ کی شادی کر دی اور انہیں دوسری جوان بیٹی کا آسرا نہ رہا تو یہ ایک جوان عورت کو بیوی بنا کر لے آئے۔اب اس عورت کو کیش کر رہے ہیں۔اس کے بعد اس کی بیٹی کو کیش کریں گے۔آپ انہیں بڑی رقم دیں گے تو یہ ایک اور شادی کریں گے،کسی غریب کی جوان بیٹی کو بیاہ کر لے آئیں گے۔''

وہ قائل ہونے کے انداز میں اسے دیکھ رہا تھا۔اس نے کہا۔''آپ چاہتے ہیں کہ یہ عزت سے کمانے کے لیے کوئی دکان کھول کر بیٹھ جائیں،یہ تو بس ایک ہی دکان کھولنا جانتے ہیں۔

ادھر دونوں باتوں میں مصروف تھے اور دوسری طرف بھولے خاں بے چین ہو رہا تھا۔ہاتھ ملتے ہوئے سوچ رہا تھا۔''نیلو کو تو مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہے۔میرے ہر معاملے میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔اب نہ جانے اپنے میاں کو کیا پٹیاں پڑھا رہی ہوگی؟ ضرور اسے میرے خلاف بھڑکا رہی ہوگی۔''

کوئی کھٹکا ہوا تھا۔اس نے اچک کر دروازے کی طرف دیکھا۔وہاں دور دور تک کوئی نہیں تھا۔اس نے بے بسی سے سوچا۔''ایک تو یہ بڑے بڑے گھر بھی خوب ہوتے ہیں،بندوں کو

آوازوں سمیت اپنے اندر چھپا لیتے ہیں۔کان لگا کر سننا بھی چاہوں گا تو بیٹی داماد کی آواز سنائی نہیں دے گی۔پتا نہیں دونوں کیا کھچڑی پکا رہے ہیں؟''

وہ ٹہل رہا تھا،ہاتھ مسل رہا تھا اور بے چینی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔وہ منتظر تھا تو صرف اس بات کا کہ داماد جی اسے کتنی رقم دینے والے ہیں؟ یہ خیال بھی پریشان کر رہا تھا کہ کہیں بیٹی اپنے میاں کا ہاتھ نہ روک لے۔

انتظار ختم ہوا۔وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے تو بھولے خاں نے بڑے ہی بھونڈے انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔''میں تو سمجھ رہا تھا،آپ بینک چلے گئے ہیں۔''

نیلو نے اس کی باچھوں سے بہتے ہوئے تھوک کو دیکھ کر ناگواری سے کہا۔''بلی کو خواب میں چھیچھڑے ہی نظر آتے ہیں۔''

وہ بیٹی کو نظر انداز کر کے داماد کو پُر امید نظروں سے دیکھنے لگا پھر باچھوں سے بہتے ہوئے لعاب کو ایک ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے سے صاف کرتے ہوئے بولا۔''آپ مطمئن رہیں۔ایک بار یہاں سے جاؤں گا پھر کبھی پلٹ کر نہیں آؤں گا۔اب یہ آپ کے سخاوت بھرے دھکے پر ہے،جتنی زور سے دھکا دیں گے،میں یہاں سے اتنی ہی دور چلا جاؤں گا۔''

وہ غصے سے بپھر کر بولی۔''میں بھیڑ بکری نہیں ہوں جو میری قیمت وصول کرنے آئے ہو۔تمہیں یہاں سے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی۔''

اس نے گھور کر بیٹی کو دیکھا،وہ بنتی ہوئی بات بگاڑنا چاہتی تھی۔حالات کا تقاضا تھا کہ وہ غصے کے جواب میں غصہ نہ دکھائے۔بھاگتے بھوت کی لنگوٹی ہی سہی وہ کچھ نہ کچھ وصول کر کے جانا چاہتا تھا۔اس نے موقع کی مناسبت سے ذرا نرم لہجے میں کہا۔''بیٹی! میں تیری قیمت وصول کرنے نہیں آیا ہوں تُو میرے حالات اچھی طرح جانتی ہے۔مجبور نہ ہوتا تو کبھی داماد جی کے آگے ہاتھ نہ پھیلاتا۔ذرا میری یہ جیب دیکھ!''

وہ خالی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کے اور گل نواز کے آگے جھکتے ہوئے بولا۔''آپ بھی دیکھیں! یہ میرے پیٹ کی طرح خالی ہے۔آپ کی ایک ذرا سی کرم نوازی اس کا پیٹ بھر سکتی ہے۔''

اس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی فقیر اپنی جھولی پھیلا رہا ہو۔نیلو نے نفرت سے گھورتے ہوئے کہا۔''یہاں سے تمہیں ایک تنکا بھی نہیں ملے گا۔گھر میں جو دو مرغیاں پال رکھی ہیں،

انہیں ذبح کرتے رہو اور اپنا پیٹ بھرتے رہو۔"

وہ اندر ہی اندر غصے سے کھول رہا تھا، تلملا رہا تھا پھر بھی عاجزانہ لہجے میں بولا۔ "بیٹی! تجھے یہ عالیشان کوٹھی اور اس کا مالک مبارک ہو لیکن ایک بزرگ کی حیثیت سے سمجھاتا ہوں، غرور نہ کر۔ دولت کو دیکھ کر لہو کے رشتے سے آنکھیں نہ پھیر۔ بہت پچھتائے گی۔"

وہ اس کے سامنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔ "اگر میرے مقدر میں پچھتاوا لکھا ہے تو مجھے پچھتانے دو لیکن خدا کا واسطہ، یہاں سے چلے جاؤ۔"

دال کسی طرح گل نہیں رہی تھی۔ داماد بھی اپنی نئی دلہن کے سامنے بت بنا کھڑا تھا۔ نہ اسے سمجھا رہا تھا، نہ اپنی جیب جھاڑ رہا تھا۔ بھولے خاں نے ایک ذرا مایوسی سے انہیں دیکھا پھر اپنا آخری حربہ آزمایا۔ رونی صورت بنا کر بولا۔ "تُو کہتی ہے، میں چلا جاؤں مگر کیسے جاؤں؟ جانے کا کرایہ ہوگا تو جاؤں گا ناں۔"

اسے امید تھی کہ اس بہانے سو دو سو کا آسرا تو ضرور ہو جائے گا۔ پوری لنگوٹی نہ سہی، اس کی ایک کترن ہی سہی۔ نیلو نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ یہ سمجھ میں آ گیا تھا کہ جونک بنا نمک کے نہیں ہٹے گی۔ اس نے گل کو دیکھا پھر کہا۔ "یہاں سے ان کے گھر تک کا بس کا کرایہ چھ روپے ہے، آپ انہیں دس روپے دے دیں۔"

اس کی بات سن کر بھولے خاں کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ بپھر کر بولا۔ "میں خیرات نہیں مانگ رہا ہوں۔ میں نے تجھے بچپن سے پالا پوسا ہے، اپنا حق مانگ رہا ہوں اور تُو ہے کہ دس روپے کی بھیک دے رہی ہے؟ باپ کو دو چار ہزار دینے میں تیری جان نکل رہی ہے؟"

وہ منہ پھیر کر بولی۔ "تم تو بھیک لینے کے بھی مستحق نہیں ہو۔"

اس نے گل نواز کی جیب سے دس کا ایک نوٹ نکال کر باپ کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔ "دروازے پر آئے ہو۔ گھر کا کچرا باہر پھینکا جا رہا ہے۔ اسے اٹھاؤ اور جاؤ۔"

اس نے غصے سے تلملا کر بیٹی کو دیکھا پھر قدموں میں پڑے ہوئے دس کے نوٹ کو دیکھ کر گل نواز سے کہا۔ "یہ آپ کی محنت کی کمائی کو کچرا کہہ رہی ہے۔ تعجب ہے، آپ خاموش ہیں؟ ایک باپ کے ذلیل ہونے کا تماشا دیکھ رہے ہیں۔"

پھر اس نے جھک کر اس نوٹ کو اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اتنا غرور اچھا نہیں ہوتا۔ اس سے روزی حاصل ہوتی ہے اور اسے نیچے پھینکا جا رہا ہے۔"

نہ بھوت ہاتھ آیا، نہ لنگوٹی، نہ اس کی کترن، ہائے افسوس......! ہاتھ آئی تو اس کی ایک دھجی۔ وہ اسے اٹھا کر یوں جانے لگا جیسے تنکے کا سہارا لے کر کنارے لگنے جا رہا ہو۔

باپ سے نجات مل گئی۔ یہ نجات مستقل تھی یا عارضی، یہ تو آنے والا وقت ہی بتا سکتا تھا۔ کبھی وقت اتنی خاموشی سے گزرتا ہے، جیسے آئندہ کچھ نہیں ہوگا پھر جو کچھ ہوتا ہے وہ پہلے تو سمجھ میں نہیں آتا، رفتہ رفتہ پتا چلتا ہے کہ بدنصیبی سرنگ بناتی ہوئی پھر خوشیوں کو دبوچنے آ رہی ہے۔

بھولے خاں نے کوٹھی سے باہر آ کر بیٹی کو ایک موٹی سی گالی دی۔ "کتے کی بچی!"

بعض اوقات گالی دینے والے کو پتہ نہیں چلتا کہ وہ خود کو گالیاں دے رہا ہے۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ "کتیا کے پاس اتنے نوٹ ہو گئے ہیں کہ اب انہیں کچرا کہنے لگی ہے۔ میں نے تو اس کے وجود کو کچرا بنا دیا تھا۔ پتا نہیں کیسے اس مہنگے گلدان میں پہنچ گئی ہے؟"

اس نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے نوٹ کو دیکھا پھر بڑبڑایا۔ "مجھے دس روپے کی بھیک دی ہے۔ میں بھی دس نمبری ہوں، اگر اسے کوٹھی والی سے پھر کوٹھے والی نہ بنا دیا تو میرا نام بھولے خاں نہیں......"

دوسری طرف مشتاق کی ماں بی بانو غصے سے کھولتی ہوئی اسپتال سے باہر آئی۔ وہ بڑے ارمانوں سے اپنے پوتے کو کلیجے سے لگانے اور چومنے آئی تھی۔

جس بہو کو پان کی پیک کی طرح دروازے کے باہر تھوک دیا تھا۔ آج اس بہو نے بھی تھوک کی پچکاری ماری تھی۔ پوتے کی ایک جھلک بھی نہیں دکھائی تھی۔ پہلے بیٹے کو چھینا تھا، اب پوتے سے محروم کر رہی تھی۔

وہ اسپتال کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔ "دیکھ لوں گی۔ تجھے دیکھ لوں گی۔ صرف اپنے بیٹے کو ہی نہیں، تیرے بیٹے کو بھی تجھ سے نہ چھین لیا تو میں اپنے باپ کی بیٹی نہیں۔"

وہ دو بہنیں بڑی کوششوں اور دشواریوں کے بعد دلدل سے نکل کر کنارے آئی تھیں لیکن دلدلی ارادے پھر انہیں پکار رہے تھے۔

☆======☆======☆

اس خالقِ کائنات نے اچھی صورتیں اور اچھی سیرتیں پیدا کیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان صورتوں اور سیرتوں والے ایک دوسرے کو اس کی سطح سے گرانے اور ایک دوسرے کی شخصیت کو مسخ کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ جیسے ان کا کوئی اور کام ہی نہ ہو۔ بس سامنے والے کو کم تر

بنانا ہے تاکہ اپنی برتری ثابت ہو سکے۔

دنیا کی کوئی ماں ایسا بچہ کبھی پیدا نہیں کرتی جس میں کوئی عیب ہو۔ جسمانی عیب ہو یا ذہنی کمزوریاں ہوں۔ وہ حمل کے دوران میں ہی اس بچے کی فطرت کا خاصا بن جاتی ہیں۔ بھولے خاں کی فطرت میں تخریب کاری رچی بسی تھی۔ وہ گرانا جانتا تھا، سنبھالنا نہیں جانتا تھا۔ بڑی ڈھٹائی سے مسکرا کر بولتا تھا۔ مکان بنانے والوں کو، ہوائی جہاز بنانے والوں کو دولت ملتی ہے لیکن ان مکانوں کو اور ان ہوائی جہازوں کو بم کے دھماکوں سے اُڑاؤ تو دہشت گردی کے صلے میں کبھی اچھی خاصی رقم ہاتھ آتی رہتی ہے۔ کچھ لوگوں کو بنانے سے روزی حاصل ہوتی ہے اور کچھ لوگوں کو بگاڑنے سے۔

اس نے پہلے اپنی جوان اور وفادار بیوی کے رشتے کو بگاڑا۔ گھر بیٹھے پیٹ بھرنے کا آسرا ہو جائے تو پھر محنت مزدوری نہیں ہوتی۔ اس نیک بخت کی موت کے بعد اس نے بڑی بیٹی نیلو کو بہلا پھسلا کر بدبختی کے راستے پر لگا دیا۔

ہر انسان اپنی فطرت سے مجبور ہوتا ہے۔ نیلو کی فطرت میں شرم و حیا رچی بسی تھی اس کے اندر کا عورت پن چیخ چیخ کر کہتا تھا کہ وہ کسی ایک مرد کے ساتھ شریفانہ ازدواجی زندگی گزارنا چاہتی ہے۔ اس نے اپنی بہن فاخرہ کو اس راستے پر آنے نہیں دیا۔ باپ سے مخالفت کی اور اسے دلہن بنا کر اس جہنم سے دور بھیج دیا۔ اللہ تعالیٰ ہر انسان کو سنبھلنے کے مواقع عطا فرماتا ہے۔ نیلو کو بھی ایک موقع ملا۔ راجا گل نواز نے سہارے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو اس نے فوراً وہ ہاتھ تھام لیا۔ ایک صاف ستھری زندگی گزارنے کے لیے اس کی پناہ میں آ گئی۔

اس کے بعد اس کہانی کو ان الفاظ کے ساتھ ختم ہو جانا چاہیے کہ پھر وہ دونوں بہنیں اپنے اپنے مجازی خدا کے ساتھ ہنسی خوشی ازدواجی زندگی گزارنے لگیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی طرح ہر عورت کو خوش نصیب بنائے۔ آمین!

لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ کہانی ختم نہیں ہوتی۔ جب تک سانسیں چلتی رہتی ہیں۔ تب تک زندگی کانٹوں پر سے گزرتی رہتی ہے۔ جو بدنصیب ہوتے ہیں وہ اپنے سامنے والوں کی خوش نصیبی برداشت نہیں کر پاتے انہیں بھی اپنی طرح بدنصیب بنا دینا چاہتے ہیں۔ یا ان کی خوش نصیبی اپنے نام کر لینا چاہتے ہیں۔

بھولے خاں بیٹی کی خوش نصیبی کا حصہ دار بننا چاہتا تھا۔ بیٹی نے دس روپے کا نوٹ اس کے سامنے بھیک کے ٹکڑے کی طرح پھینک دیا تھا اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ آئندہ اس

کے دروازے پر نہ آئے۔

وہ جوان بیٹی کی کمائی سے ہاتھ دھو کر دس روپے کی بھیک کبھی قبول نہ کرتا لیکن اس وقت وہ مجبور ہو گیا تھا۔ جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں تھی۔ واپسی کا کرایہ ضروری تھا۔ لہٰذا وہ دس روپے اٹھا کر اس کوٹھی سے باہر آ گیا۔ قسمیں کھانے لگا کہ اپنی بے عزتی کا بدلہ ضرور لے گا۔ یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ ذلت اور بے غیرتی سے زندگی گزارنے والے بھی اپنی بے عزتی محسوس کرتے ہیں۔

وہ بس میں بیٹھ کر گھر جاتے وقت جھنجھلا رہا تھا۔ دونوں بیٹیاں ہاتھ سے نکل گئی تھیں۔ پھر بھی وہ ناامید نہیں تھا۔ اسی لیے وقت سے پہلے ہی بہت کچھ سوچنے سمجھنے کے بعد نوشاد کو بیاہ کر گھر لے آیا تھا۔ اصل کے ساتھ سود بھی لایا تھا۔

نوشاد کی ایک بیٹی تھی جو جوان ہو چکی تھی۔

اگرچہ نوشاد نوخیز نہیں تھی پھر بھی دو وقت گھر میں چولہا جل جاتا تھا اور ہر دوسری تیسری رات اس کے لیے ٹھرے کی ایک بوتل آ جایا کرتی تھی لیکن دو میں سے ایک مشین بند ہو جائے تو صرف ایک سے گزارا نہیں ہوتا دوسری کی فکر ستانے لگتی ہے کہ دوسری کیسے چالو ہو گی اور اگر نہ ہو سکی تو اسے کس طرح کام میں لایا جا سکے گا۔

وہ گھر پہنچ کر دروازے کو ایسے پیٹنے لگا جیسے اپنے بدترین حالات کی پٹائی کر رہا ہو۔ اندر سے نوشاد کی چیختی ہوئی آواز سنائی دی۔ ”آ رہی ہوں...... آ رہی ہوں۔ دروازے سے سر پھوڑ رہے ہو۔ آتے ہی سمجھا رہے ہو کہ بیٹی نے ٹکا سا جواب دیا ہے۔“

اس نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا۔ دونوں کی نظریں ملیں پھر وہ بولی۔ ”اپنا غصہ باہر تھوک کر آؤ یہاں اندر آ کر تماشا کرو گے، چیزیں اٹھا کر پھینکو گے، ہمیں گالیاں دو گے تو میں ابھی بیٹی کو لے کر چلی جاؤں گی۔“

وہ اندر آتے ہوئے بولا۔ ”چلی جاؤ۔ مجھے چھوڑ کر چلی جاؤ۔ میں جس کے ساتھ بھی نیکی کرتا ہوں وہی میرے ساتھ برائی کرتی ہے۔ سگی بیٹی نے مجھے بڑھاپے میں دھوکا دیا ہے۔ تم تو پھر بھی پرائی ہو۔ مگر یہ سوچنا چاہیے کہ میں نے ہی تمہیں یہ چار دیواری دی ہے۔ تم اپنی جوان بیٹی کے ساتھ یہاں عزت سے ہو۔ کیا کرتی ہو کیا نہیں کرتی کوئی نہیں جانتا۔ کوئی تم پر انگلی اٹھانے والا نہیں ہے۔ میں تمہارے سامنے ڈھال بنا رہتا ہوں۔ تمہارا محافظ بن کر رہتا ہوں۔ تمہاری طرف کوئی پتھر نہیں آنے دیتا اور تم دھمکیاں دے رہی ہو کہ بیٹی کو لے کر چلی

جاؤ گی؟"

وہ ذرا نرم پڑ کر بولی۔ "اور کیا کروں؟ تم تو دونوں بیٹیوں کا غصہ مجھ پر اُتارتے ہو وہ تمہیں چھوڑ کر چلی گئیں۔ میں تو نہیں جا رہی ہوں۔"

پھر اس نے بیٹی کو آواز دی۔ "غزالہ! پڑوسن کے ہاں جا کر برف لے آ۔ گھر میں آدھا لیموں رکھا ہے، ٹھنڈا میٹھا شربت بنا کر اپنے باپ کو پلا۔"

وہ ناگواری سے بولا۔ "میں نے تجھے کل ہی سمجھایا تھا۔ مجھے اپنی بیٹی کا باپ نہ بنا۔ مجھے بیٹی کے رشتے سے نفرت ہے۔ میری وہ بیوی وفادار تھی۔ بے چاری وفا کرتے کرتے مر گئی۔ تُو بھی وفادار ہے لیکن بیٹی کو جوان ہوتے ہی پَر لگ جاتے ہیں۔"

"تم فکر نہ کرو میں پَر کاٹنا جانتی ہوں۔ میری بیٹی مجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جائے گی۔"

وہ ایک گہری سانس لے کر بولا۔ "تمہیں میری بیٹیوں کی بے وفائی اور بغاوت سے بہت کچھ سیکھنا چاہئے۔ غزالہ کو ایسی ٹریننگ دیتی رہو کہ وہ ہمارے ہاتھوں میں ناچتی رہے اور دوسروں کو نچاتی رہے۔"

"تم اطمینان رکھو نیلو سے دھوکا کھانے کے بعد میری آنکھیں کھل گئی ہیں، مجھے بھی اپنا بڑھاپا ابھی سے دکھائی دے رہا ہے۔"

وہ دانت پیس کر بولا۔ "نیلو کو تو میں نہیں چھوڑوں گا۔ وہ سمجھتی ہے اس بڑے گھر میں جا کر عیش کرے گی۔ میں اس کی تمام عیاشی خاک میں ملا دوں گا۔"

وہ سمجھانے کے انداز میں بولی۔ "اسے بھول جاؤ وہ بہت بڑے آدمی کے سائے میں ہے۔ تم اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکو گے۔"

"میرا نام بھولے خاں ہے لیکن میں بھولا اور کمزور نہیں ہوں۔ جب سیدھے راستے سے میرا کوئی مطلب پورا نہیں ہوتا ہے تو میں سرنگ بنا کر چور راستوں سے اپنا مطلب پورا کر لیتا ہوں۔"

"راجا گل نواز پر نیلو کا جادو چل چلا ہے۔ تم اس جادو کا توڑ کیسے کرو گے؟"

اس نے اپنی بیوی نوشاد کو دیکھا۔ پھر کہا۔ "میں تمام راستے پلاننگ کرتا آیا ہوں۔ تم یہ تو مانتی ہو کہ وہ مغرور لڑکی ایک مسلا ہوا پھول ہے۔ اس میں وہ تازگی اور کشش اب کبھی پیدا نہیں ہو گی جو ابھی ہماری غزالہ میں ہے۔"

نوشاد نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "بے شک میری بیٹی میں جو

حسن، جو تازگی اور کشش ہے، وہ نیلو میں کبھی پیدا نہیں ہو گی لیکن غزالہ کی تیاری میں ابھی کم از کم ایک برس ضرور لگے گا۔"

وہ بڑے فخر سے بولا۔ "جو میرا تجربہ ہے وہ تمہارا نہیں ہو سکتا۔ میں ان دولت مند عیاشوں کو اچھی طرح جانتا بھی ہوں اور پہچانتا بھی ہوں۔ یہ لوگ کم سن لڑکیوں پر مرتے ہیں۔ غزالہ بالکل ہی کم سن نہیں ہے۔ نوخیز ہے اور اسے نوخیز لگنا چاہئے اس کے سامنے نیلو بالکل پھیکی پڑ جائے گی۔"

نوشاد نے دعویٰ کیا۔ "ایک عورت کی حیثیت سے جو میرا تجربہ ہے وہ تمہارا نہیں ہو سکتا۔ میں اپنی بیٹی کو تم سے زیادہ جانتی ہوں۔ اسے دھیمی دھیمی آنچ میں پکا رہی ہوں۔ تم اس معاملے میں جلدی نہ کرو۔"

"میرے اندر جو بات پک رہی ہے۔ تم اسے سمجھنے کی کوشش کرو۔ ضروری نہیں کہ ہانڈی پک جائے اور تم اسے دسترخوان تک پہنچا دو۔ بات کو سمجھو، پکنے کے دوران میں جو خوشبو کسی بھوکے کی ناک تک پہنچتی ہے اس اشتہا انگیز خوشبو کو وہاں تک پہنچا دو۔"

نوشاد نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"ہم کسی طرح غزالہ کا سامنا راجا گل نواز سے کرائیں گے۔ ایسے وقت راجا صاحب کا مزاج اور ان کے تیور ہماری سمجھ میں آئیں گے کہ وہ غزالہ میں کیا دیکھ رہے ہیں اور کیا سمجھ رہے ہیں اور ہم آئندہ انہیں کس طرح شیشے میں اُتار سکیں گے۔"

نوشاد نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔ "بات کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔"

اس وقت غزالہ دو ہاتھوں میں شربت کے دو گلاس اٹھائے وہاں آ گئی۔ بھولے خاں نے شربت کا گلاس اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اسے سر سے پاؤں تک ایسی ننگی آنکھوں سے دیکھا کہ ایکسرے مشین بھی ایسے نہیں دیکھتی۔ وہ تو فوراً ہی ہڈیوں کا ڈھانچا پیش کر دیتی ہے۔ اور کہتی ہے۔ "ہائے لوگو! تم گوشت پوست کی ایسی حسیناؤں کو قبر کے کیڑوں کی طرح ساری زندگی چاٹتے رہتے ہو لیکن انجام تو تمہارا بھی یہی ہے۔ تمہیں بھی ہڈیوں کا ڈھانچا بن جانا ہے۔"

بہت کم لوگ اپنی قبر کے آخری انجام کو پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ وہ دونوں لیموں کا ٹھنڈا میٹھا شربت پی رہے تھے اور نیلو کی زندگی میں زہر گھولنے کی تدبیریں کر رہے تھے۔ کسی کی خوش نصیبی دیکھی نہیں جاتی۔ کسی کو بلندی سے اپنی سطح پر لانے اور اپنی سطح سے بھی نیچے گرانے

میں جوخوشی اور آسودگی حاصل ہوتی ہے وہ کسی کے ساتھ نیکی کرنے سے حاصل نہیں ہوتی۔
یہی انسانی فطرت کا المیہ ہے۔

☆======☆======☆

مشتاق کی ماں بی بانو، نامرادی اور توہین کے احساس سے تلملا رہی تھی۔ نامرادی یہ تھی کہ اپنے نوزائیدہ پوتے کی صورت دیکھنے کو نہیں ملی تھی۔ اور توہین کا احساس اس لیے تھا کہ بہو نے پوتے کو اپنے آنچل سے ڈھانپ لیا تھا۔ اس کی صورت دیکھنے نہیں دی تھی۔ اور اسے الٹے پاؤں وہاں سے جانے کو کہا تھا۔

بہو نے بھی اپنی توہین کا بدلہ لیا تھا۔ بی بانو نے اسے اپنی بہو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اپنے گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی۔ اسے اس بات کا صدمہ تھا کہ فاخرہ نے اس کے جوان بیٹے کو چھین لیا ہے۔

بی بانو نے اور تمام رشتہ داروں نے مشتاق سے کہا تھا کہ وہ فاخرہ کو گھر کی عزت نہ بنائے۔ اگر ایسا کرے گا تو اسے گھر میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ پھر واقعی اس کا اور فاخرہ کا داخلہ اس گھر میں بند ہو چکا تھا لیکن ماں اپنی ممتا سے مجبور ہوتی ہے۔ بی بانو چھپ چھپ کر اپنے بیٹے سے ملتی تھی اسے سمجھاتی تھی۔ ''فاخرہ ہمارے گھر کی بہو بننے کے قابل نہیں ہے۔ اس کا باپ بدقماش ہے شرابی ہے۔ محلے والے ان کے بارے میں طرح طرح کی باتیں کرتے ہیں۔ ایسی بدنام لڑکی ہمارے شریف گھرانے میں آئے گی تو ہماری بیٹیوں کا تمہاری بہنوں کا رشتہ کسی شریف گھرانے سے کبھی نہیں آئے گا۔''

شاید ہی کسی جوان بیٹے پر والدین کی نصیحتیں اثر کرتی ہوں گی۔ مشتاق ایک کان سے سنتا تھا، دوسرے کان سے نکال دیتا تھا۔ فاخرہ کا دیوانہ تھا، اسے اپنی شریکِ حیات بنا کر اس کے ساتھ زندگی گزار رہا تھا۔ قریب ہونے سے پتا چلتا ہے کہ دور کے ڈھول سہانے ہوا کرتے ہیں۔ فاخرہ دور سے ہی بھلی تھی۔ قریب آنے کے بعد یہ ثابت کر رہی تھی کہ کبھی ایک اچھی شریکِ حیات نہیں بن سکے گی۔

ایک بے غیرت باپ کے سائے میں رہنے کے بعد وہ مردوں سے اس قدر نفرت کرنے لگی تھی کہ شوہر کے قرب سے بھی کتراتی رہتی تھی۔ مشتاق کے سمجھانے منانے پر مجبور ہو کر ایک شریکِ حیات کے فرائض انجام دیتی تھی۔ اس دوران اس کے رویے سے صاف پتا چلتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ زندگی گزارنا نہیں چاہتی ہے، چونکہ عورت مجبور ہوتی ہے مرد کے

سہارے کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتی اس لیے وہ حالات سے سمجھوتا کر رہی ہے۔

بی بانو کو اپنے بیٹے اور بہو کی ازدواجی زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ بس ایک ہی بات کہتی تھی کہ بہو کو چھوڑ دو اور واپس چلے آؤ۔ پچھلے ڈیڑھ برس تک ساس اور بہو میں یہی رسہ کشی رہی۔ ڈیڑھ برس کے بعد یہ خوشخبری ملی کہ بہو نے ایک بیٹے کو جنم دیا ہے۔ ایسے وقت وہ اپنے پوتے کو دیکھنے کے لئے تڑپنے لگی۔

اس کے شوہر انصار احمد نے اور دوسرے بیٹوں نے سختی سے منع کیا کہ اسے پوتے کو دیکھنے کے لیے اسپتال نہیں جانا چاہئے۔ انصار احمد نے کہا۔ ''بی بانو! وہ میرا بھی پوتا ہے میرے پہلے بیٹے کا پہلا بیٹا ہے۔ اسے گود میں لینے اور چومنے کو میرا بھی جی چاہتا ہے لیکن ہمارے بیٹے کا فرض ہے کہ وہ اسے بہو کے پاس نہ رہنے دے۔ اس گھر میں لے کر آئے وہ ہمارا خون ہے ہماری نسل ہے۔''

بی بانو نے دو روز تک صبر کیا لیکن دل نہیں مان رہا تھا۔ پوتے کو دیکھنے کے لیے اندر ہی اندر مچل رہا تھا۔ آخر وہ اسپتال گئی تو فاخرہ نے اس کے ساتھ وہی سلوک کیا جو وہ اب تک بہو کے ساتھ کرتی آئی تھی۔ اسے پوتے کی صورت نہیں دیکھنے دی صاف کہہ دیا۔ ''جب آپ لوگ میری صورت دیکھنے کے روادار نہیں ہیں تو میں آپ لوگوں کو اپنے بیٹے کی صورت بھی نہیں دیکھنے دوں گی۔ آپ اپنے بیٹے کو لے جاسکتی ہیں تو لے جائیں لیکن جب تک مجھے اس گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں ملے گی۔ اس وقت تک میرا بیٹا وہاں تو کیا آپ کی گود میں بھی نہیں جائے گا۔ اسے آپ ہاتھ بھی نہیں لگا سکیں گی۔''

مشتاق نے اپنی ماں کی حمایت میں کچھ کہنا چاہا تو فاخرہ نے کہا۔ ''تم نہ ماں کی حمایت کرو، نہ بیوی کی، صرف انصاف کی بات کرو۔ مجھ میں ایسے کیا کیڑے پڑے ہیں کہ تمہارے گھر والے اور خاندان والے مجھ سے دور بھاگتے ہیں۔ مجھے اپنے گھر میں آنے نہیں دیتے جب وہ آنے نہیں دیتے تو پھر میرا بیٹا ان کے پاس کیوں جائے گا؟ اگر تم انصاف نہیں کرو گے تو میں تمہاری کوئی بات نہیں مانوں گی۔''

بہو کی باتیں سن کر بی بانو نے اس پر کیچڑ اچھالنی چاہی۔ اس کو اور اس کی بہن کو بدنام کرنا چاہا تو وہ بولی۔ ''آپ یہ نہ بھولیں کہ آپ کی بیٹی سعدیہ میری سہیلی رہ چکی ہے ہم دسویں جماعت تک ساتھ تعلیم حاصل کرتی رہی ہیں۔ اس کے ایسے کئی راز میرے پاس ہیں کہ میں انہیں بیان کروں تو آپ اور آپ کا پورا خاندان کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔''

وہ پریشان ہو کر بیٹے کو دیکھنے لگی فاخرہ نے کہا۔ ''کسی پر کیچڑ اچھالنے سے پہلے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھ لینا چاہیے آپ مجھے اور میری بہن کو بدنام کرتی پھرتی ہیں۔ یہ میری شرافت ہے کہ میں نے آپ کی بیٹی کو بدنام نہیں کیا ہے۔ صرف اس لیے کہ آپ کی بیٹی کے بھائی صاحب میرے شوہر ہیں۔ میں ان کی عزت رکھنے کی خاطر آپ لوگوں کا لحاظ کرتی رہتی ہوں۔''

ساس کو یہ سن کر شاک پہنچا تھا کہ بہو کے ہاتھوں میں اس کی بیٹی کی کمزوریاں ہیں۔ وہ جب چاہے اسے اور اس کے خاندان والوں کو پتھر مار سکتی ہے۔

وہ جھنجھلا کر بہو کے کمرے سے نکل آئی۔ اسپتال سے باہر آ کر غصے سے سوچنے لگی۔ ''کم بخت میرے بیٹے کو چھین بیٹھی ہے اور اب پوتے کو بھی مجھ سے دور کر رہی ہے۔ میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ ایسا انتقام لوں گی کہ نہ شوہر اس کا رہے گا اور نہ بیٹا۔ یہ میرے بیٹے کے پاس خالی ہاتھ آئی تھی۔ خالی ہاتھ اپنے باپ کے گھر جائے گی۔''

بیٹا ماں کے پیچھے چلتا ہوا باہر آیا ماں نے غصے سے کہا۔ ''لعنت ہے تم پر، جورو کے غلام بن گئے ہو۔ وہ تمہارے سامنے مجھے کیسی کیسی باتیں سناتی رہی اور تم چپ چاپ سنتے رہے۔''

وہ ماں کے شانے پر ہاتھ رکھ کر سمجھانے کے انداز میں بولا۔ ''امی! وہ انصاف کی بات کر رہی ہے آپ خود ٹھنڈے دماغ سے غور کریں۔ ہم کسی کو ٹھوکر ماریں گے تو وہ بھی جواباً ہمیں ٹھوکر مارے گا۔ آپ نے اور ابو نے اسے گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی تو پھر وہ آپ کو اپنے سامنے اور اپنے بیٹے کے سامنے کیسے آنے دے گی۔''

''وہ صرف اس کا بیٹا نہیں ہے، تمہارا بھی ہے۔ ہمارا بھی خون ہے وہ...... کیا اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے؟''

''میں سب جانتا ہوں بیٹے پر جتنا میرا حق ہے اتنا ہی اس کا بھی ہے۔ اگر ابھی میں اس پر جبر کرتا اور اس سے بیٹے کو چھین کر آپ کی گود میں دیتا تو وہ اس پر ہنگامہ برپا کر دیتی۔ لوگ جمع ہو جاتے سبھی کو معلوم ہو جاتا کہ بہو اپنا بچہ ساس کی گود میں کیوں نہیں دے رہی ہے۔ بات بہت دور تک پہنچتی۔ یہ ناانصافی سامنے آتی کہ جب اسے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی جا رہی ہے تو پھر آپ اسے اپنی بہو نہ مان کر اور اس کے بیٹے کو اپنا پوتا مان کر یہاں کیوں آئی ہیں۔ پوتے کو کلیجے سے لگانا ہے تو بہو کو بھی گلے لگائیں۔''

''تمہارے منہ میں اپنی زبان تو ہے نہیں، جب بھی بولتے ہو اسی کتیا کی زبان سے

بولتے ہو۔''

''پلیز امی! آپ کسی کو گالی نہ دیں۔ گالی دینے والے چھوٹے لوگ سمجھے جاتے ہیں۔''

''وہ تو ہمیں چھوٹا بنا رہی ہے، پورے خاندان کو بدنام کر رہی ہے۔ ابھی تمہاری بہن کی نیک نامی پر داغ لگا رہی تھی اور تم چپ چاپ سن رہے تھے۔''

''اور میں کیا کرتا؟ کیا یہ حقیقت ہے۔ ہم نہیں جانتے ہیں کہ سعدیہ نے دوبار ایسی غلطیاں کی ہیں جسے ہم نے بڑی مشکلوں سے چھپایا ہے۔ اپنی عزت رکھی ہے، فاخرہ اس کی راز دار سہیلی تھی۔ یہ باتیں صرف وہی جانتی ہے اور یہ فاخرہ کا بڑا پن ہے، شرافت ہے کہ آپ اسے بدنام کر رہی ہیں لیکن وہ جواباً ایسا کچھ نہیں کر رہی ہے۔''

ماں نے بڑی بے بسی سے بیٹے کو دیکھا۔ وہ ہاتھ سے پھسل چکا تھا، لیکن دل کہہ رہا تھا کہ ابھی پانی سر سے نہیں گزرا ہے بیٹا واپس آ سکتا ہے۔ اسے سمجھانا منانا ہوگا۔ میں اسے نظروں سے دور نہیں ہونے دوں گی۔ اس بے حیا سے اسے چھین کر رہوں گی۔

اس نے بیٹے کا ہاتھ تھام کر بڑی محبت سے کہا۔ ''آؤ یہاں بینچ پر بیٹھو۔''

وہ اس کا ہاتھ تھام کر ساتھ چلتی ہوئی ایک پتھر کے بنے ہوئے بینچ کے پاس آئی۔ مشتاق وہاں بیٹھ گیا۔ وہ کھڑی رہی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہنے لگی۔ ''میں ماں ہوں یہ نہ سمجھو کہ تمہاری پریشانیاں نہیں سمجھتی ہوں تم بہت کچھ چھپانے کی کوششیں کرتے ہو۔ میں نے تمہیں نو ماہ تک پیٹ میں چھپا کر رکھا ہے، تم مجھ سے اپنی کوئی بات نہیں چھپا سکو گے۔ سچ بولو کیا تم پریشان نہیں رہتے ہو؟''

اس نے جھجکتے ہوئے نظریں اٹھا کر ماں کو دیکھا وہ بولی۔ ''سچ بولو کیا تم اس عورت سے خوش ہو؟''

وہ فوراً ہی کوئی جواب نہ دے سکا۔ منہ پھیر کر دوسری طرف دیکھنے لگا، وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی۔ ''ماں کی جان! تم بچپن سے دیکھتے آ رہے ہو کہ میں اپنی اولادوں میں سب سے زیادہ تمہیں چاہتی ہوں۔ تمہارے لیے جان دیتی رہتی ہوں۔ تم نے ایک عورت کے لیے ماں کو چھوڑ دیا۔ یہ میں نے برداشت کر لیا لیکن یہ کیسے برداشت کروں کہ تم پھر بھی خوش نہیں ہو۔ اندر ہی اندر پریشان رہتے ہو۔ اپنی ماں سے بھی پریشانیوں کو چھپاتے رہتے ہو۔''

وہ اس کے پاس بیٹھ کر بولی۔ ''نہیں بیٹے ماں پر اتنا ظلم نہ کرو۔ بے شک اس عورت کے ساتھ رہو لیکن ماں کو اپنے دکھ درد میں شریک کرو۔''

وہ اپنی ایک ہتھیلی سے اس کی پشت کو سہلاتے ہوئے بولی۔ ”تم بچپن سے لے کر جوان ہونے تک جب بھی بیمار پڑتے تھے، ذرا سی بھی چھینک تمہیں آتی تھی تو میں ڈاکٹروں کے پاس لیے لیے گھومتی تھی۔ بیٹے! ماں سے اس کی مسیحائی کا حق نہ چھینو وہ عورت تمہیں بیمار بنا رہی ہے۔ مجھ سے حقیقت نہ چھپاؤ۔ اس کے تیور بتاتے ہیں کہ وہ بہت ہی بدمزاج ہے اور تم سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہے۔ سچ بولو یہی بات ہے نا؟“

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ”امی! سبھی میاں بیوی آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔ کیا ابو آپ سے نہیں لڑتے ہیں؟“

”بے شک ان کا مزاج ذرا گرم ہے۔ وہ لڑتے ہیں لیکن میں تو ان سے نہیں لڑتی۔ اگر بیوی کے دل میں محبت ہو شوہر کے لیے وفاداری ہو تو وہ لڑتی نہیں۔ وہ جائز بولتا ہو یا ناجائز بولتا ہو اس کے سامنے سر جھکاتی رہتی ہے۔ کیا وہ محبت سے سر جھکانا جانتی ہے؟“

”اس نے ماں کو دیکھا پھر جلدی سے نظریں چرالیں۔ بڑے دکھ سے سوچنے لگا۔

”میری تو ایک ہی جائز بات ہے کہ وہ مجھ سے محبت کرے لیکن ڈیڑھ برس گزرنے کے بعد میرے بچے کی ماں بننے کے بعد بھی وہ مجھے دل سے محبتیں نہیں دے رہی ہے۔“

اس نے ایک گہری سانس لے کر سوچا۔ ”اس کے ہاتھ کی لکیر کہتی ہے کہ وہ کسی کو دل و جان سے چاہتی ہے یا آئندہ چاہے گی پتا نہیں وہ کون ہے؟ اس کی زندگی میں آچکا ہے یا آنے والا ہے؟ اور اگر آچکا ہے تو کیا یہ بات وہ مجھ سے چھپا رہی ہے؟“

وہ سر جھکائے سوچ رہا تھا۔ یہ بھول گیا تھا کہ ابھی ماں اس کے پاس بیٹھی ہوئی ہے، اس نے کوئی سوال کیا ہے اور وہ اس کا جواب چاہتی ہے۔ ادھر وہ اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی یہ خوب سمجھ رہی تھی کہ اس کی کسی دکھتی رگ پر انگلی رکھ چکی ہے، وہ بے چین ہو گیا ہے لیکن اپنی عادت کے مطابق ماں سے بھی اپنی بے چینی اور اپنا دکھ چھپا رہا ہے۔

وہ ایک گہری سانس لے کر بولی۔ ”نہ تم اپنے اندر کی بات بتاؤ گے اور نہ میں جان سکوں گی لیکن اس کے خاندانی حالات کو سامنے رکھ کر بہت کچھ سمجھ سکتی ہوں۔ اس کی ماں اس کے باپ کی وفادار نہیں تھی۔ کبھی کبھی راتوں کو یہ کہہ کر چلی جاتی تھی کہ اپنے میکے جا رہی ہے پھر صبح واپس آجاتی تھی اپنے شوہر کے اعتماد کو دھوکا دیتی رہتی تھی۔“

وہ تڑپ کر بولا۔ ”پلیز امی! اس کی ماں مر چکی ہے۔ اسے خواہ مخواہ بدنام نہ کریں۔“

”خدا گواہ ہے۔ میں اسے خواہ مخواہ بدنام نہیں کر رہی ہوں۔ اس کے محلے میں رہنے

والی ایک نہیں دو دو عورتوں نے یہ بات بتائی ہے۔“

وہ بے چینی سے پہلو بدلنے لگا۔ بی بانو کے سازشی دماغ نے کہا۔ ”یہ اس کی دکھتی رگ ہے۔ جہاں لوہا گرم ہے وہیں چوٹ پڑ رہی ہے۔“

اس نے کہا۔ ”تم چاہو تو میں اس محلے کی دو عورتوں کو تمہارے سامنے لے آؤں۔ وہ بے چاری بہت سیدھی سادی ہیں نہ کسی کے لینے میں رہتی ہیں، نہ دینے میں۔ نماز پڑھتی ہیں، روزے رکھتی ہیں، کبھی جھوٹ نہیں بولتیں جو سچ ہو، وہی بولتی ہیں۔ تم ابھی چلو میں ابھی ان سے سامنا کراتی ہوں۔“

”رہنے دیں امی! سبھی کے اندر کچھ اچھائیاں اور کچھ برائیاں ہوتی ہیں۔ اگر فاخرہ میں کوئی خامی ہے تو اسے درست کروں گا۔“

”عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ اسے کوئی درست نہیں کر سکتا۔ جب اس کی ماں مرگئی تو اس کی بڑی بہن نیلو اسی سلسلے میں بدنام ہونے لگی۔ پتا چلا کبھی وہ بھی راتوں کو باہر جاتی ہے اور صبح واپس آتی ہے۔ پوچھو تو یہی کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی نانی کے گھر گئی تھی۔“

وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ”بس کریں امی! میں فاخرہ کے بارے میں اتنا جانتا ہوں کہ جب سے وہ میری زندگی میں آئی ہے کسی رات گھر سے باہر نہیں گئی۔ اپنی بڑی بہن سے کبھی کبھی دن کے وقت ملنے جاتی ہے تو شام سے پہلے واپس آجاتی ہے۔“

”ہاں تو اسے راتوں کو کہیں جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ تم تمام دن گھر میں نہیں رہتے ہو صبح آٹھ بجے جاتے ہو اور شام کو چھ بجے واپس آتے ہو۔ تمہارے پیچھے کیا ہوتا ہے کیا تم نے کبھی معلوم کرنے کی کوشش کی ہے؟“

یہ بات اسے ایسی لگی جیسے ماں نے پتھر مارا ہو۔

بزرگوں کا کام ہے نصیحت کرنا۔ بچوں کو ہر پہلو سے سوچ سمجھ کر زندگی گزارنے کے طور طریقے بتانا کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا ہے؟ وہ دیکھتا تھا اور سمجھتا تھا کہ فاخرہ بری نہیں ہے۔ عورت ہو یا مرد وہ اپنی باتوں سے اور رہنے سہنے کے طور طریقوں سے پہچانا جاتا ہے۔ فاخرہ کا طور طریقہ ابتدا سے یہی تھا کہ وہ اس سے کتراتی رہتی تھی۔ شادی کے بعد جیسے مجبور ہو گئی تھی۔ جبراً بیوی کے فرائض ادا کر رہی تھی۔ صاف پتا چل جاتا تھا کہ وہ اسے دل سے نہیں چاہتی ہے۔ کبھی کبھی تنہائی میں بیٹھ کر گہری سوچ میں گم ہو جاتی تھی۔ وہ گہری سوچ صاف طور پر سمجھاتی تھی کہ اس کے دل و دماغ میں کوئی دوسرا بسا ہوا ہے اور وہ اسے اپنے اندر چھپائے

رکھتی ہے۔

یہ خیال اسے بے چین کر دیتا تھا۔ یقین کی حد تک اس شبہے میں مبتلا کر دیتا تھا کہ بیوی اس کی ہے لیکن محبتیں کسی اور کو دیتی ہے۔ وہ مسلسل فریب کھا رہا ہے۔ ہاتھ کی لکیر اور اس کا رویہ دونوں ہی اس کے کردار کے ایک تاریک پہلو کو پیش کر رہے ہیں اور وہ بڑی سادگی سے حقیقت کو جھٹلا رہا ہے۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ماں نے بھی اٹھتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

اس نے سر جھکا کر دیکھا پھر کہا۔ ''آپ ابو سے چھپ کر آئی ہیں۔ دیر ہو رہی ہے آپ کو گھر جانا چاہیے۔''

''تمہارے باپ سے زیادہ تم ضروری ہو، میں ان سے نمٹ لوں گی۔ تم یہاں بیٹھو اور مجھ سے باتیں کرو۔''

''نہیں۔ بچے کے لیے دودھ اور فیڈر لے کر آنا ہے۔''

وہ بولی۔ ''ہائے ہائے! کیا وہ میرے پوتے کو اپنا دودھ نہیں پلاتی ہے؟''

''پلاتی ہے لیکن دودھ کم آتا ہے بچے کا پیٹ نہیں بھرتا۔ پلیز آپ جائیں۔''

''ٹھیک ہے میں جا رہی ہوں، لیکن وعدہ کرو رات کو گھر آؤ گے۔''

وہ بڑے دکھ سے بولا۔ ''گھر کے دروازے میرے لیے بند ہیں۔''

''تم اس کی پرواہ نہ کرو۔ میں ابھی جا کر تمہارے ابو کو سمجھاؤں گی۔ سب سے کہوں گی کہ تم آنے والے ہو۔ دیکھ لینا سب کتنے خوش ہوں گے۔ آج رات کا کھانا تم ہمارے ساتھ کھاؤ گے۔''

وہ رات کو گھر آنے کا وعدہ کر کے اسپتال کے اندر فاخرہ کے پاس جانے لگا۔ وہ ماں کو چھوڑ کر بیوی کی طرف جا رہا تھا۔ اپنی کوکھ سے پیدا ہونے والی اولاد پرائی ہوتی رہے تو ماں کا دل نہیں مانتا وہ اپنے کلیجے کے ٹکڑے کو واپس لانے کے لیے دل ہی دل میں قسمیں کھا رہی تھی۔

وہ گھر پہنچی۔ ایک بیٹی نے دروازہ کھولا وہ اس بیٹی کو دیکھ کر اندر آتے ہوئے بولی۔

''سعدیہ کہاں ہے؟''

صحن میں اس کا شوہر چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔ ''پہلے تم یہ بتاؤ کہاں گئی تھیں؟''

وہ اپنے میاں کے تیور دیکھ کر بھانپ گئی کہ اسے پوتے کے پاس جانے کا علم ہو چکا ہے۔ وہ اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولی۔ ''میں کہیں بھی جاتی ہوں۔ آپ کبھی مجھ سے نہیں پوچھتے۔ پھر آج پولیس والے بن کر کیوں انکوائری کر رہے ہیں؟''

پھر اس کے مقابل چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''میں تین جوان بیٹوں کی اور پانچ بیٹیوں کی ماں ہوں اب میرے اندر کیا رہ گیا ہے؟ باہر آنکھ مٹکا کرنے تو جاتی نہیں ہوں۔''

''میں خوب سمجھتا ہوں تم اسپتال گئی تھیں وہاں بیٹے اور پوتے سے مل کر آ رہی ہو۔''

''تو کیا ہوا؟ کوئی گناہ کر کے تو نہیں آ رہی ہوں۔''

''یہ تو سراسر اس دو کوڑی کی لڑکی کے سامنے جھکنے والی بات ہے۔ سچ بتاؤ کیا اس نے تمہیں سلام کیا تھا، تمہاری عزت کی تھی؟''

اس نے شکست خوردہ انداز میں میاں کو دیکھا، پھر ذرا نرم پڑتے ہوئے کہا۔ ''نہیں آپ نے ٹھیک کہا تھا وہ پکی حرافہ ہے اس نے پوتے کی صورت بھی نہیں دیکھنے دی۔ جو منہ میں آتا گیا بولتی چلی گئی۔''

''اور تمہارا وہ لاڈلا بیٹا چپ چاپ سنتا رہا؟''

''آپ طعنے نہ دیں وہ بے چارہ تو خود بھی پریشان ہے۔ منہ سے بولتا نہیں ہے لیکن میں اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ شادی کر کے پچھتا رہا ہے۔ ندامت سے چپ رہتا ہے میں نے آج اسے گھر بلایا ہے۔ آپ اعتراض نہیں کریں گے۔''

اس کی تمام بیٹیاں اور بیٹے صحن میں آ رہے تھے وہ انہیں دیکھ کر بولی۔ ''تم سب بھی اچھی طرح سن لو۔ تمہارا بھائی آج رات آ رہا ہے۔ اچھا کھانا پکاؤ، پہلے کی طرح اس کے ساتھ ہنستے بولتے رہو۔ ہم اسے محبتیں نہیں دیں گے تو وہ چڑیل اسے جھوٹی محبت کے شکنجے میں کستی رہے گی۔''

وہ تمام بچے اپنے باپ کے طرف دیکھنے لگے۔ باپ نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''مجھے تو اس پر غصہ آ رہا ہے۔ پیدا کرنے والے ماں باپ کو چھوڑ کر بیوی کے آنچل میں جا کر چھپ گیا ہے۔ میں تو چاہتا تھا کہ اسے ٹھوکریں ملتی رہیں۔''

بی بانو نے کہا۔ ''اسے ٹھوکریں مل رہی ہیں۔ وہ بہت پریشان ہے جب یہاں آتا رہے گا تو میں محبت سے اس کے اندر کی باتیں اگلوا پاؤں گی کسی نہ کسی طرح اس چڑیل سے اس کا پیچھا چھڑاؤں گی لیکن اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ وہ پریشان ہے تو ہم اسے گلے لگائیں

اسے محبتیں دیتے رہیں۔"

بڑی بیٹی سعدیہ نے کہا۔"انصاف کی باتیں کریں جب گلے لگانا ہے تو فاخرہ کو بھی گھر لائیں۔اسے بھی محبتیں دیں۔"

بی بانو نے ہاتھ نچا کر کہا۔"تم ضرور اس کی حمایت کرو گی۔بچپن کی سہیلی کو راز دار بنا کر رکھا تھا۔اب نتیجہ کیا ہو رہا ہے؟ جانتی ہو اس نے تمہیں بدنام کرنے کی دھمکی دی ہے۔"

"میں فاخرہ کو آپ سے زیادہ جانتی ہوں وہ کبھی میری بدنامی نہیں چاہے گی۔بدنامی کرنا ہوتی تو پچھلے ڈیڑھ برس میں وہ آپ لوگوں سے اچھی طرح انتقام لے سکتی تھی مجھے بے عزت کر کے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے سکتی تھی لیکن وہ ایسا نہیں کر رہی ہے اور نہ کبھی کرے گی۔"

ماں ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی پھر بولی۔"بکواس مت کر۔اس کمینی کی حمایت کر رہی ہے جس نے میرا بیٹا مجھ سے چھین لیا۔"

باپ نے غصے سے کہا۔"یہ تو اپنی سہیلی کی حمایت میں اس لیے بولے گی کہ اس کی کمزوریاں اس کے ہاتھ میں ہیں۔"

پھر وہ سعدیہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔"تجھے اس بات کا ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ کس طرح ہمیں بدنام کرنے والی غلطیاں کرتی رہی تھی۔اگر ہم بھاگ دوڑ نہ کرتے اور اس لڑکے کا منہ بند نہ کرتے تو آج تیرا رشتہ کہیں سے نہ آتا۔"

بی بانو نے کہا۔"رشتہ خود نہیں آیا ہے ہم نے منت سماجت کی ہے۔ایسی بدنام لڑکیاں آسانی سے بیاہی نہیں جاتیں۔اس کے بعد چار بیٹیوں کی لائن لگی ہوئی ہے۔اگر وہ بدنام لڑکی بہو بن کر ہمارے گھر میں قدم رکھتی تو کبھی اس کا رشتہ نہ آتا۔"

وہ سعدیہ کے پاس آ کر اس کے شانے پر ہاتھ مار کر بولی۔"سچ سچ بتا تیرا کون سا راز اس کے پاس ہے؟ اگر ہمیں بدنام کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی پکا ثبوت ہے تو ہمیں بتا دے میں مشتاق سے کہوں گی۔وہ اسے بہلا پھسلا کر اس ثبوت کو حاصل کر لے گا۔"

سعدیہ نے کہا۔"میں فاخرہ کے بارے میں ایک ہی بات جانتی ہوں کہ وہ خدا سے ڈرتی ہے دل کی بہت اچھی ہے۔مجھ پر کبھی کوئی آنچ نہیں آنے دے گی۔"

ماں نے کہا۔"بکواس مت کر۔تم اپنے عاشق کو محبت نامے لکھ کر بھیجا کرتی تھیں۔جب بات کھلی اور ہم نے اس لڑکے کا محاسبہ کیا تو اس نے تمہارے خطوط کی فوٹو اسٹیٹ

کاپیاں ہمارے حوالے کی تھیں اور یہ کہا تھا کہ تم اصل تحریر اپنے پاس رکھتی تھیں اور اس کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں اس کے پاس بھیجتی تھیں۔"

سعدیہ نے کہا۔"وہ پکا جھوٹا ہے فریبی ہے اگر سچا ایماندار ہوتا تو اپنے والدین کو رشتہ مانگنے کے لیے یہاں ضرور بھیجتا لیکن اس کی نیت میں شروع سے کھوٹ تھا اس نے میری اصل تحریریں اپنے پاس چھپا کر رکھی ہیں۔میرے تین تین جوان بھائیوں کی دھونس میں آ کر اس نے وہ فوٹو اسٹیٹ کاپیاں واپس کی تھیں اور آپ نے یقین کر لیا کہ وہ سچ بول رہا ہے۔"

ماں نے کہا۔"بالکل یقین کرنے کی بات ہے ساری چالاکی فاخرہ کی ہے۔وہ تمہارے خطوط اس کے پاس لے جایا کرتی تھی لیکن پہلے اس کی فوٹو کاپیاں بنوا لیتی تھی۔اصل اپنے پاس رکھتی تھی اور وہ کاپیاں اس کے حوالے کرتی تھی۔اس بے چارے کو جو خطوط ملے تھے اس نے وہی ہمارے حوالے کیے تھے۔"

وہ اپنی دوسری بیٹیوں کو مخاطب کرتے ہوئے بولی۔"دیکھ لو تمہاری بڑی بہن نے کیا گل کھلائے ہیں۔تم سب بھی کالج جاتی ہو، اسکول جاتی ہو، تم نے بھی کتنی سہیلیاں بنائی ہوں گی۔اپنی بہن کی ٹھوکروں سے سبق حاصل کرو کسی سہیلی پر آنکھ بند کر کے بھروسا نہ کرو۔اپنے گھر کے راز کسی کو نہ بتایا کرو۔بتانے سے یہی ہوتا ہے جو تمہاری بہن کے ساتھ ہو رہا ہے۔"

اس کے میاں نے کہا۔"خدا کا شکر ہے کہ اس کا رشتہ طے ہو چکا ہے۔شادی کی تاریخ مقرر ہو چکی ہے اب جب تک یہ یہاں سے دلہن بن کر رخصت نہیں ہو گی۔اپنے گھر کی نہیں ہو جائے گی اس وقت تک میری جان سولی پر لٹکی رہے گی۔یہی اندیشہ رہے گا کہ پتا نہیں فاخرہ ہمارے خلاف کیا کرنے والی ہے؟"

سعدیہ بڑے دکھ سے اپنے ماں باپ کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔"ہم نے کلام پاک اٹھا کر طاق پر رکھ دیا ہے۔اس کتاب ہدایت کو نہ کبھی پڑھنے کی اور نہ کبھی سمجھنے کی توفیق ہوئی ہے۔ورنہ سورۃ الناس پڑھنے سے کم از کم یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان کس طرح وسوسوں اور اندیشوں میں مبتلا رہتا اور اپنے رب کی پناہ مانگتا رہتا ہے۔یہ لوگ وسوسوں میں مبتلا رہ کر فاخرہ کی ازدواجی زندگی کو تباہ و برباد کرنا چاہتے ہیں۔جب یہ میرا گھر بسائیں گے تو ڈھیر ساری دعائیں دیں گے۔دن رات اللہ تعالیٰ سے یہی چاہتے رہیں گے کہ میں اپنے شوہر اور سسرال والوں کے ساتھ شاد و آباد رہوں لیکن یہی دعائیں وہ فاخرہ کو نہیں دے رہے ہیں۔یہی ہماری دنیا ہے یہی ہماری انسانیت ہے کہ ہم کسی کو دعائیں بھی نہیں دے سکتے۔"

☆======☆======☆

بیٹے کی پیدائش نے تو اس کے دن رات ہی بدل ڈالے تھے۔ رات بھر اسے لوریاں دینے اور تھپک تھپک کر سلانے میں کب صبح ہو جاتی تھی کچھ پتا ہی نہ چلتا تھا۔ اگر چہ تمام رات لوریاں گنگنائی نہیں جاتیں۔ بچہ سو جائے تو ماں چپ ہو جاتی ہے لیکن وہ بیٹے کی قربت میں ایسی مست ہو جاتی تھی کہ گنگناتی ہی چلی جاتی تھی۔

مشتاق کی بے چینی اور بے زاری بڑھنے لگتی تھی۔ پہلے خیرات کے طور پر ہی سہی اس کی قربت نصیب ہو جاتی تھی اب وہ رہا سہا آسرا بھی ختم ہو رہا تھا۔ والدین نے اور دوسرے ناراض رشتہ داروں نے اپنے گھر کے دروازے کھول دیے تھے۔ ماں باپ شفقت سے سر پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔ بھائیوں، بہنوں اور رشتہ داروں سے ایسی محبتیں مل رہی تھیں کہ ایسے وقت فاخرہ کے پیار کی کمی اور اس کے رویے کی بیگانگی اسے اور تڑپانے لگتی تھی۔

یہ بات ایک حقیقت کی طرح ذہن میں نقش ہونے لگتی تھی کہ اپنے، اپنے ہی ہوتے ہیں۔ کوئی نکاح قبول کر کے بیوی بن جانے والی اپنا تن من سب کچھ نچھاور کر کے بھی خون کے رشتوں سے زیادہ پیار دے سکتی ہے نہ قربانی دے سکتی ہے۔

ایک طرف محبتوں کی سوغات ملتی رہے۔ دوسری طرف پیار کی بھیک بھی نہ ملے تو سبھی سوغات کی طرف جاتے ہیں کوئی کشکول اٹھا کر مانگنا گوارا نہیں کرتا۔ پھر بھی اس نے کئی بار اسے پیار سے مانگنا چاہا مگر وہ اسے طرح دیتی رہی۔ دھرتی کتنے ہی نخرے اور بے نیازی دکھائے مگر ساون بڑا ڈھیٹ ہوتا ہے اس کے نہ چاہنے کے باوجود گرجتا ہوا آ کر برستا چلا جاتا ہے۔

اس نے صبر بھی کیا اس پر جبر بھی کیا لیکن وہ پیار محبت والی بات نہ بنی۔ چھیننے سے وہ مل تو جاتی تھی مگر دل سے مائل نہیں ہوتی تھی۔ اپنی ماں کی یہ بات دھیرے دھیرے دماغ میں پکنے لگی تھی کہ شاید وہ میاں بیوی کی حیثیت سے دور تک ساتھ نہیں چل سکیں گے۔

اس نے کن انکھیوں سے بیڈ پر بیٹھی ہوئی فاخرہ کو دیکھا۔ بیٹے کا نام فاخر رکھا گیا تھا۔ وہ سو چکا تھا لیکن وہ اب تک اسے تھپک رہی تھی۔ دھیمی دھیمی سی آواز میں گنگنا رہی تھی وہ غصے سے اٹھ کر بیڈ پر آتے ہوئے بولا۔ ''جب یہ سو چکا ہے تو کیوں تھپک رہی ہو؟ تمہارا لاڈ پیار اس کی عادتیں خراب کر دے گا۔ یہ ہر وقت تم سے ہی چپکا رہے گا پھر تم کوئی دوسرا کام نہیں کر سکو گی۔ میرا مطلب ہے......''

اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے چپ رہنے کا اشارہ کیا پھر دھیمی آواز میں کہا۔ ''پلیز...... آہستہ بولیں...... یہ کچی نیند سوتا ہے جاگ جائے گا۔''

وہ جھنجھلا کر بولا۔ ''جاگنے دو کیا لاٹ صاحب کے لیے میں بولنا چھوڑ دوں؟''

''جھنجھلا کیوں رہے ہو؟ میں تو صرف دھیمی آواز میں بولنے کو کہہ رہی ہوں۔''

اس نے ناگواری سے بچے کو دیکھا۔ پھر بڑی محبت سے شکایت کی۔ ''جب سے یہ آیا ہے تب سے تم میری دنیا سے نکل گئی ہو۔ مجھے گھر کے کچرے کی طرح نکال پھینکا ہے۔ ہر وقت اسی سے لگی رہتی ہو، ذرا انصاف سے سوچو یہ وقت میرا ہے لیکن تم اس کو اہمیت دے رہی ہو۔''

وہ مسکرا کر بولی۔ ''ممتا وقت کا حساب نہیں کرتی مجھے تو ہوش ہی نہیں رہتا، میں اسے دیکھتے ہی، چھوتے ہی نہ جانے کہاں گم ہو جاتی ہوں۔ پھر اس کی دنیا سے نکل کر واپس اس دنیا میں نہیں آنا چاہتی۔''

''کیا یہ کبھی نہیں سوچو گی، سمجھو گی کہ مجھے بھی تمہاری محبت اور توجہ کی ضرورت ہے؟ بے شک تم سارا دن اس سے لگی رہو میں شکایت نہیں کروں گا لیکن رات کے وقت تو اسے پالنے میں ڈال دیا کرو۔''

اس نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''سمجھا کرو۔ اسے جھولے میں سونے کی عادت نہیں ہے۔''

''عادت نہیں ہے تو عادت ڈال سکتی ہو۔ ابھی یہ بچہ ہے جس طرح ڈھالو گی اسی طرح ڈھل جائے گا۔ اسے بیچ سے ہٹاؤ ادھر داہنی طرف لٹا دو۔''

اس نے گھور کر اسے دیکھا پھر کہا۔ ''کیا یہاں بیڈ کے کنارے لٹا دوں؟ کیا اسے یہاں سے گرانا چاہتے ہو؟''

''میرا یہ مطلب نہیں ہے۔''

''یہی مطلب ہے۔ اپنے مطلب کے لیے یہ نہیں سوچ رہے ہو کہ بیٹا نیچے گر سکتا ہے اسے نقصان پہنچ سکتا ہے۔''

وہ ایک دم سے پھٹ پڑا۔ تکیہ اٹھا کر اپنے سر پر مارتے ہوئے بولا۔ ''بیٹا...... بیٹا...... بیٹا میں تنگ آ گیا ہوں تمہارے بیٹے سے۔ دنیا کی سبھی عورتیں مائیں بنتی ہیں مگر تمہارے چونچلے نہ جانے کب ختم ہوں گے؟ ایک بیٹا پیدا کر کے نہال ہو گئی ہو۔ نہ شوہر کی پرواہ نہ

چولہے ہانڈی کی، جب سے یہ آیا ہے تب سے گھر کا کھانا کبھی کبھی نصیب ہوتا ہے۔ ہوٹلوں سے کھانا آتا ہے۔ کبھی پکاتی بھی ہو تو ایسا لگتا ہے خواہ مخواہ فرض ادا کر رہی ہو۔ کچن میں بھی بچے کا دھیان رہتا ہے۔ کھانا تو کھانا چائے میں بھی ذائقہ نہیں ملتا۔ میں پوچھتا ہوں اس کیڑے مکوڑے کو پیدا کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟''

وہ بھی ایک دم سے پھٹ پڑی حلق پھاڑ کر چیختے ہوئے بولی۔ ''کیا؟ کیڑا مکوڑا؟ تم میرے بچے کو کیڑا کہہ رہے ہو؟ اگر کوئی دوسرا کہتا تو میں کہتی کہنے والے کے منہ میں کیڑے پڑیں گے۔ کیا تمہاری والدہ صاحبہ بھی تمہیں پیدا کر کے یہ کہتی تھیں جو تم میرے بیٹے کو کہہ رہے ہو؟''

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر بیڈ سے اُتر گئی۔ پھر بچے کو اٹھا کر سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔

''اسے حقیر سمجھتے ہو تو سمجھتے رہو۔ میں اسے لے کر اپنی باجی کے پاس جا رہی ہوں۔ تم اپنے بستر پر ہاتھ پاؤں پھیلا کر آرام سے سوتے رہو۔''

وہ اپنا اور بچے کا سامان سمیٹنے لگی۔ مشتاق نے اس کا ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔ ''یہ کیا کر رہی ہو؟ اتنی رات کو کہاں جا رہی ہو؟''

''میں اپنے اور بچے کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتی۔ جب یہ انسان نہیں ہے، جراثیم ہے تو ہمارے جانے کے بعد یہاں جراثیم کش دوائیں چھڑکتے رہنا۔''

وہ اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر جبراً ایک جگہ بٹھاتے ہوئے بولا۔ ''میں نے غصے سے ایسا کہہ دیا تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں بیٹے سے نفرت کرتا ہوں۔ میں بھی اسے دل و جان سے چاہتا ہوں۔ تم صرف ایک ماں کی ہی نہیں باپ کی محبت کو بھی سمجھو۔ یہ میرا خون ہے میری جان ہے۔''

وہ اندر سے خوش ہو گئی۔ باہر سے منہ بنا کر بولی۔ ''میں اسے پالنے میں نہیں سلاؤں گی۔''

''اچھی بات ہے۔ نہ سلاؤ یہ بیڈ پر رہے گا۔''

''میں اسے ایک کنارے نہیں سلاؤں گی۔ ورنہ یہ گر پڑے گا۔''

اس نے بے بسی سے اسے دیکھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ گھر چھوڑ کر جائے اس کے جاتے ہی یہ بات کھل جاتی کہ محبت کی شادی ناکام ہو گئی ہے۔ جس عورت کے لیے اس نے ماں باپ کو چھوڑا تھا وہی عورت اس پر تھوک کر چلی گئی ہے۔

وہ یہ بھی سمجھ رہا تھا کہ ابھی یہ بچہ ہے اس لیے بے اختیار اس کی طرف کھنچی جاتی ہے۔ جب دو چار بچے اور ہوں گے ممتا دوسرے بچوں میں تقسیم ہونے لگی تو یہ نارمل ہو جائے گی۔ بچوں کے ساتھ باپ کو بھی برابر محبتیں دینے لگے گی۔

اس نے آگے کو جھک کر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا۔ ''جس طرح تمہیں فاخر اپنی طرف کھینچتا ہے اسی طرح تم مجھے بے ساختہ اپنی طرف کھینچتی رہتی ہو۔ تم قریب ہو کر بھی قریب نہیں آتیں تو میں برسٹ آؤٹ ہو جاتا ہوں۔''

وہ اسے شانے سے تھام کر بیڈ کی طرف لاتے ہوئے بولا۔ ''آؤ یہاں بیٹھو! ہم مل کر سوچیں گے تو کوئی مناسب راستہ نکل ہی آئے گا۔ ایسا راستہ جس پر چل کر نہ تم اپنے بچے سے دور رہو اور نہ میں تم سے۔ حقوق اور فرائض دونوں ہی ادا ہوتے رہیں گے۔''

دونوں میں صلح ہو گئی۔ اس رات کے بعد وہ حقوق اور فرائض کے درمیان لٹکنے لگے۔ ازدواجی لمحات سے گزرتے وقت ایسا ہی لگتا تھا جیسے سولی پر لٹکی ہوئی ہو۔ وہاں سے پلٹ کر جب فاخر کو سینے سے لگاتی تو ایسا لگتا تھا جیسے ایک عذاب سے گزر کر آئی ہے۔ رگوں میں منجمد ہونے والا لہو پھر سے بدن میں دوڑنے لگا ہے اور اسے پھر سے زندگی کی نوید ملنے لگی ہے۔

اچھا برا وقت جیسا بھی تھا، گزر رہا تھا۔ بیٹا پہلے بستر پر پڑا رہتا تھا پھر گھٹنوں کے بل رینگنے لگا۔ پھر میز اور کرسی کا سہارا لے کر خراماں خراماں چلنے لگا۔ فاخرہ خوشی کے مارے اس کے ساتھ ساتھ دوڑتی تھرکتی پھرتی تھی۔ اسے ایسا لگتا تھا جیسے وہ ننھے ننھے قدم بڑھانے والا فرش پر نہیں اس کے دل پر خراماں چل رہا ہے۔ دل کی ہر دھڑکن پر اس کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی تھی۔

مشتاق بیٹے کے معاملے میں بہت محتاط رہتا تھا جیسے وہ اس کا نہیں کسی اور کا بچہ ہو۔ فاخرہ کو خوش رکھنے کے لیے وہ بچے کو ڈانٹتا بھی نہیں تھا۔ وہ واقعی خوش ہو کر اپنی قربت کی اتنی خیرات دے دیتی کہ بے چارا بہل جاتا تھا۔ یہ بہلاوا ہی بہت تھا۔

بی بانو تشویش میں مبتلا رہتی تھی۔ بیٹے کو صرف ڈھیر ساری محبتیں ہی نہیں اوپری جیب خرچ بھی دیا کرتی تھی اور سمجھاتی تھی۔ ''تم آتے ہو تو میرے پوتے کو بھی ساتھ لایا کرو۔ اس پر صرف تمہاری بیوی کا حق نہیں ہے وہ تمہارا خون ہے ہماری نسل ہے اس پر ہمارا حق زیادہ ہے۔''

وہ سمجھاتا تھا۔ ''امی! ابھی وہ بچہ ہے فاخرہ اسے باہر لے جانے نہیں دیتی جب وہ ذرا

چلنے پھرنے کے قابل ہوگا تو میں اسے باہر گھمانے پھرانے کے بہانے یہاں لایا کروں گا۔''

پانچ برس گزر گئے تو بی بانو نے کہا۔''اب تو اسے یہاں لاسکتے ہو؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔''وہ دنیا کی نرالی ماں ہے۔ پاگل کی بچی ہے میں اسے باہر لے جاتا ہوں تو وہ بھی ساتھ ہو جاتی ہے۔ میں نے اسے سمجھایا کبھی باپ بیٹے کو تنہا چھوڑ دیا کرو لیکن وہ کہتی ہے بیٹا سیر کرے گا تو ماں بھی ذرا باہر کی ہوا کھا کر آئے گی۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ اپنے شوہر، اپنے بیٹے کے باپ پر بھروسا نہیں کرتی ہے؟''

''وہ مجھ پر کسی طرح کا شبہ نہیں کرتی۔ میں کیا بتاؤں؟ یہ اس کی شروع ہی سے عادت ہے کہ بچے کو ایک منٹ کے لیے بھی اپنے سے جدا نہیں کرتی ہے۔''

''لعنت ہے اس پر اور اس کی ممتا پر۔ میں کچھ نہیں جانتی کل ہی کسی بہانے سے اسے یہاں لاؤ جب سے وہ پیدا ہوا ہے مجھ سے بہانے کرتے آرہے ہو، بیوی سے کوئی بات بنا کر جھوٹ بول کر اسے یہاں نہیں لاسکتے؟''

''میں کل کا وعدہ نہیں کرسکتا مگر ہاں کوئی تدبیر کروں گا۔ وہ آج کل میری باتیں ماننے لگی ہے میں اسے ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ مناسب موقع دیکھ کر آپ کو پوتے سے ضرور ملاؤں گا۔''

بی بانو نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر پوچھا۔''تم ایسی کون سی باتیں منواتے ہو جو پہلے وہ نہیں مانتی تھی اور اب ماننے لگی ہے؟''

وہ ایک دم سے جھینپ گیا کوئی جواب نہ دے سکا۔ اِدھر اُدھر منہ پھیر کر نظریں چرانے لگا۔ وہ تھوڑی دیر تک اسے ٹٹولتی ہوئی نظروں سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی۔''ڈیڑھ برس میں ایک بیٹا ہوا اب اور چار برس گزر چکے ہیں۔ اب کوئی اولاد کیوں نہیں ہورہی ہے؟''

''میں۔ میں کیا کہوں؟ یہ تو خدا کی دین ہے۔ وہی بہتر جانتا ہے۔''

''خدا تو دیتا ہے بندہ لینے سے انکار کرے تو اور بات ہے۔ سچ بتاؤ، کیا خاندانی منصوبہ بندی پر عمل کررہے ہو؟''

''ایسی کوئی بات نہیں ہے امی!''

''آج کل کی لڑکیاں اپنی خوبصورتی اور جوانی کو برقرار رکھنے کے لیے بچے پیدا کرنے سے کتراتی رہتی ہیں۔ میاں اولاد کے لیے ضد کرے تو اسے اُلو بناتی رہتی ہیں۔ نہ تم کبھی

پوچھو گے نہ وہ اندر کی بات کبھی بتائے گی۔''

وہ سوچ میں پڑ گیا۔ دل ہی دل میں حساب کرنے لگا۔ اس کا بیٹا فاخر اب چلنے پھرنے اور دوڑنے بھی لگا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے تقریباً پانچ برس گزر گئے تھے اور اس نے سنجیدگی سے اس بات کا نوٹس نہیں لیا تھا کہ ایک کے بعد دوسری اولاد کیوں نہیں ہورہی ہے؟

اس رات اس نے فاخرہ سے پوچھا۔''فاخر چار برس سے اوپر کا ہو چکا ہے میں حیران ہوں کہ ہماری اور کوئی اولاد کیوں نہیں ہورہی ہے؟''

بیٹا سو رہا تھا۔ وہ اس پر جھک کر اسے چومتے ہوئے بولی۔''میرے لیے یہ کافی ہے۔''

''وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس کے لیے بھی تو کسی کا ہونا ضروری ہے۔ میرا مطلب ہے کوئی بہن بھائی آجائے تو اس کا اکیلا پن دور ہو جائے گا۔''

اس نے مسکرا کر اپنے میاں کو دیکھا پھر پوچھا۔''تمہیں ایسا لگتا ہے یہ اکیلا ہے۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے یہ تنہا کیسے ہوسکتا ہے؟ میں ہی اس کی بہن ہوں، بھائی ہوں، ماں ہوں اور اس کی دوست بھی ہوں۔ میں ہمیشہ ہی اس کی سب کچھ رہوں گی۔''

پھر وہ منہ دبا کر ہنستے ہوئے بولی۔''پتا ہے میں تو خود کو اس کی وہ...... وہ سمجھتی ہوں۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔''وہ......؟ میں نہیں سمجھا وہ کیا ہوتا ہے؟''

وہ فاخر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔''یہ میرا محبوب ہے میں اس کی محبوبہ ہوں۔''

وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگا وہ جذبوں کی روانی میں کہہ رہی تھی۔''میں اس کے ساتھ جاگتی ہوں۔ اس کے ساتھ سوتی ہوں۔ آدھی نیند سوتی ہوں۔ اٹھ اٹھ کر اسے دیکھتی رہتی ہوں۔ یہ دودھ پیتے پیتے چھوڑ دیتا ہے تو میں کھاتے کھاتے لقمہ چھوڑ دیتی ہوں۔''

پھر وہ مشتاق کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔''عشق اور کسے کہتے ہیں؟ کسی کے ساتھ جاگنا، کسی کے ساتھ سونا، کسی کے ساتھ جینا، کسی کے ساتھ مرنا۔ میں تو اسی کے ساتھ جیوں گی۔ اور خدا نہ کرے اسے کچھ ہو، کچھ ہونے سے پہلے میرا دم نکل جائے گا۔''

وہ ناگواری سے بولا۔''تم باؤلی ہورہی ہو۔ عشق دو طرح کا ہوتا ہے ایک عشق حقیقی، دوسرا عشقِ مجازی۔ عشق حقیقی صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک سے ہوتا ہے اور عشق مجازی کسی ایک بندے سے ہوتا ہے کسی بچے سے نہیں ہوتا۔''

''کیوں نہیں ہوتا۔ کیا لیلیٰ مجنوں نے جب عشق کیا تو وہ بچے نہیں تھے؟''

وہ اس سوال سے ذرا الجھ گیا پھر بولا۔ ''بے شک وہ بچے تھے مگر ماں بیٹے نہیں تھے۔ ماں بیٹے کے درمیان ممتا اور تقدس ہوتا ہے عشق نہیں ہوتا۔''

''یہ تو اپنے مزاج اور نیت کی بات ہے مقدس رشتوں میں عشق ہو تو کیا اس عشق میں پاکیزگی نہیں ہوگی؟''

وہ اس سوال کا جواب سوچتا ہی رہ گیا۔ وہ اپنی ہتھیلی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''تمہاری پیش گوئی درست ہو رہی ہے، اس ہتھیلی پر دیوانہ وار محبت کرنے کی جو لکیر ہے وہ اپنی سچائی ثابت کر رہی ہے۔''

اس کی ہتھیلی نگاہوں کے سامنے پھیلی ہوئی تھی۔ لکیر بھی درست تھی۔ پیش گوئی بھی درست تھی لیکن وہ یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ ماں اور بیٹے کے درمیان جو محبت اور ممتا کی انتہا ہوتی ہے اسے عشق کہا جا سکتا ہے۔

وہ الجھی ہوئی نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک ماں کی آنکھوں میں دیوانی ممتا سچے موتیوں کی طرح چمک رہی تھی۔ وہ بیٹے کی پیدائش کے دن سے اب تک ایک ماں کی بے حد بے حساب ممتا دیکھتا آ رہا تھا۔ یہ مان رہا تھا کہ جس طرح یہ کائنات لامحدود ہے اسی طرح اس کی ممتا لامحدود ہے۔ کیا ایسی محبت کی انتہا کو عشق کہا جائے گا؟

وہ بولا۔ ''فاخر کے لیے محبت اپنی جگہ ہے لیکن ازدواجی زندگی میں ایک بچہ کافی نہیں ہوتا۔ مجھے ایک بیٹی اور ایک بیٹا اور چاہیے۔''

وہ فاخر پر جھک کر اسے چومتے ہوئے بولی۔ ''دوسرا اور کوئی نہیں آئے گا۔ میری ممتا صرف اس کے لیے ہے۔''

''کیا تم آنے والے کو روک سکو گی؟''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''کیا بچوں جیسی باتیں کر رہے ہو؟ آج کے دور میں آنے والے کو روکنا کون سی بڑی بات ہے؟ اور تم دیکھ ہی رہے ہو۔ تمہاری محدود آمدنی اور فاخر کی محبت دیکھتے ہوئے میں بڑی کامیابی سے ایسا کر رہی ہوں۔''

اس نے ایک دم سے چونک کر اسے دیکھا، ماں کی باتیں یکبارگی ہتھوڑے کی طرح دماغ پر برسنے لگیں۔ اس نے گرج کر پوچھا۔ ''یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟''

وہ بے پروائی سے بولی۔ ''یہ بکواس نہیں ہے جو ہونا چاہیے وہی کر رہی ہوں۔''

وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر بولا۔ ''تم کس کی اجازت سے یہ کر رہی ہو؟ میں اس بات

کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔''

''صرف میاں کی اجازت نہیں ہوتی بیوی کی رضامندی بھی لازمی ہوتی ہے اور میں یہ طے کر چکی ہوں کہ میری محبت صرف میرے بیٹے کے لیے وقف رہے گی۔ میں اپنی ممتا کا بٹوارا نہیں کروں گی۔''

''فضول باتیں کر رہی ہو۔ ممتا کبھی تقسیم نہیں ہوتی۔ ہر بچے کے لیے یکساں ہوتی ہے۔ مجھے ایک کے بعد دوسری اور پھر تیسری اولاد چاہیے۔ ایک بچے نے تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے۔ دوسرا آئے گا تبھی تم ذہنی طور پر نارمل رہو گی۔''

وہ تڑپ کر اُٹھ بیٹھی، بپھر کر بولی۔ ''دوسری کوئی اولاد نہیں ہوگی۔ تمہیں اتنا ہی چاؤ ہے تو جاؤ دوسری شادی کر لو پھر جتنی چاہے اولادیں پیدا کرتے رہنا میں نہیں روکوں گی۔''

وہ بھی اُٹھ کر بیٹھ گیا غصے سے بولا۔ ''تم کیا سمجھتی ہو میں کیا مجبور اور بے بس ہوں؟ کیا دوسری شادی نہیں کر سکوں گا؟ امی میری دوسری شادی کرانے کے لیے ایک ٹانگ پر کھڑی ہے۔ ادھر تمہیں طلاق دوں گا پھر دوسری نئی نویلی آ جائے گی۔''

وہ بستر سے اُتر کر پاؤں پٹختا ہوا کمرے سے باہر چلا گیا۔ وہ ہکا بکا سی رہ گئی۔ اسے یہ سن کر شاک پہنچا کہ اس کی ساس بیٹے کی دوسری شادی کرنا چاہتی ہے۔ اس طرح یہ بات سمجھ میں آئی کہ مشتاق اس کی لاعلمی میں ماں باپ سے ملتا ہے جس گھر کے دروازے بہو کے لیے بند ہیں، اس گھر میں بیٹا چھپ کر جاتا ہے، یہ اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ اندر ہی اندر اس کے خلاف سازش ہو رہی ہیں۔

اسے سب سے زیادہ یہ سن کر دلی صدمہ پہنچا کہ وہ اسے طلاق بھی دے سکتا ہے۔ اگرچہ وہ کبھی دل سے اس کی طرف مائل نہیں ہوئی۔ اسے محبوب نہیں سمجھا۔ تاہم وہ شوہر تھا اس کے ساتھ شرعی، مستحکم رشتہ تھا۔ عورت کے لیے اس سے بڑی کوئی گالی نہیں ہوتی کہ یہ شرعی رشتہ طلاق کے نام سے ٹوٹ جائے۔

شادی کے بعد پہلی بار اسے احساس ہوا کہ مشتاق محبوب نہ ہونے کے باوجود اس کے سر پر چھت ہے۔ ہر پہلو سے عزت کی چار دیواری ہے، شوہر کو یوں ہی مجازی خدا نہیں کہا جاتا وہ ہر سمت سے ڈھال بن کر رہتا ہے۔ تب ہی اسے خدا کے بعد مجازی خدا کا درجہ دیا جاتا ہے۔

وہ پہلی بار سنجیدگی سے سوچنے لگی کہ مشتاق صرف اس کے لیے ہی نہیں اس کے بیٹے

کے لیے بھی بہت اہم ہے۔ آئندہ اپنے بیٹے کی خاطر اسے اپنی ساس کے خلاف محاذ آرائی کرنی ہوگی۔

یہ اس کے لیے لمحہ فکریہ تھا۔ کئی پہلوؤں سے فکر اور پریشانیاں لاحق ہو رہی تھیں۔ یہ ایک نئی فکر لاحق ہو گئی تھی کہ مشتاق اپنے والدین اور اپنے خاندان والوں کی طرف جھکنے لگے گا تو یہ بالکل تنہا رہ جائے گی۔ پہلی بدنامی یہ ہوگی کہ خاوند نے بیزار ہو کر اسے چھوڑ دیا ہے اور ماں باپ کے پاس جا کر رہنے لگا ہے۔

وہ اپنے حالات پر غور کرنے لگی کہ ایسا ہوگا تو وہ کس کا سہارا ڈھونڈے گی؟ باپ اس قابل نہیں تھا کہ اس کی طرف منہ کر کے تھوکا بھی جاتا۔ ایک بہن نیلو تھی جس نے ایک ماں کی طرح اس کی دیکھ بھال کی تھی اور مشتاق کے ساتھ اس کا یہ گھر بسایا تھا۔ اب وہ راجا گل نواز کے ساتھ بھلی بری جیسی بھی زندگی ہو گزار رہی تھی۔

وہ ہفتے میں کبھی ایک آدھ گھنٹے کے لیے فاخرہ سے ملنے آتی تھی۔ جب وہ چار برس پہلے راجا گل نواز کی دلہن بن کر اس کی کوٹھی میں گئی تھی۔ تب فاخرہ نے ایک بار وہاں جا کر راجا گل نواز سے ملاقات کی تھی۔ اپنے بہنوئی کا شکریہ ادا کیا تھا کہ اس نے اس کی ماں جیسی بہن کو عزت دی ہے۔ اسے ایک گھر دیا ہے وہ دونوں بہنیں اس کا احسان زندگی بھر نہیں بھولیں گی۔

راجا گل نواز نے ایک بہنوئی کی حیثیت سے خوب کھل کر اس کے ساتھ مذاق کیا تھا اور اس کی تعریفیں کرتا رہا تھا۔ پھر کہا تھا کہ اسے ہر دوسرے تیسرے دن اپنی بہن اور بہنوئی کے پاس آنا چاہیے لیکن اس دن کے بعد وہ پھر کبھی اپنے بہنوئی سے ملنے نہیں گئی۔ نیلو نے اسے سمجھایا۔ ''ہمارے راجا صاحب دل کے بہت اچھے ہیں، بہت اچھے انسان ہیں، انہوں نے مجھے ایک دلدل سے نکالا ہے۔ میں آخری سانس تک ان کی عزت کرتی رہوں گی لیکن آخر کو ایک مرد ہیں۔ نیت کے کچے ہیں کوئی کھلتا ہوا گلاب ہاتھ آ جائے تو اسے سونگھتے ضرور ہیں۔''

فاخرہ نے چونک کر اپنی بڑی بہن کو دیکھا۔ بات سمجھ میں آ گئی کہ اسے بہنوئی سے دور ہی رہنا چاہیے۔ وہ دوسری تیسری بار جب بھی نیلو سے ملنے گئی تو مشتاق کو ساتھ لے کر گئی۔ نیلو نے راجا گل نواز کو یہ تاثر دیا کہ فاخرہ کا شوہر مشتاق بہت ہی شکی مزاج ہے۔ اسے تنہا نہیں چھوڑتا ہے اور کہیں آنے جانے پر پابندیاں عائد کرتا رہتا ہے۔

فاخرہ نے کہا۔ ''باجی! میں تو سمجھ رہی تھی۔ اللہ تعالیٰ آپ پر مہربان ہے اور اس نے

آپ کی زندگی میں ایک محبت کرنے والے کو بھیجا ہے لیکن ہمارے یہ بہنوئی صاحب تو تھالی کے بینگن ثابت ہو رہے ہیں۔''

وہ بولی۔ ''ایسی بات بھی نہیں ہے۔ انہیں اپنی عزت اور نیک نامی کا بڑا خیال رہتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں میں سے نہیں ہے جو ہر پھول پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ اگر عزت پر آنچ نہ آئے اور کوئی پھول یوں ہی ہاتھ لگ جائے تو وہ اسے ہوس کے گلدان میں ضرور سجا لیتے ہیں۔''

''یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ جب عورت ایک مرد کے ساتھ وفا کرتی ہے تو مرد کو بھی اس عورت کے ساتھ وفا کرنی چاہیے۔''

''ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ جو ہمیں چاہتا ہے، ہمیں عزت دے رہا ہے، مان مرتبہ دے رہا ہے، وہ کیسا ہے اگر اس میں کچھ خامیاں ہیں تو خوبیاں بھی بہت ہیں۔ مجھے راجا صاحب کی اس ایک خامی سے کبھی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں وہ مجھے دل و جان سے چاہتے ہیں۔ میرے دکھ درد کو سمجھتے ہیں انہوں نے مجھے ایک صاف ستھری زندگی دی ہے اور وہ ساری عمر میرا ساتھ نبھاتے رہیں گے۔''

یہ بات اپنی جگہ درست تھی کہ راجا گل نواز اس کی نیلو باجی کو آخری سانسوں تک تحفظ فراہم کرتا رہے گا لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ اٹل تھی کہ وہ اپنی باجی کے گھر میں جا کر کچھ روز رہنا چاہتی تو بہنوئی صاحب اس پر فریفتہ ہوتے رہتے۔ یہ ان کی دانشمندی تھی کہ وہ دونوں ندی کے دو کنارے بن گئی تھیں۔ نیلو ہفتے میں ایک آدھ گھنٹے کے لئے اس سے ملنے چلی آتی تھی۔

اب فاخرہ اپنے موجودہ حالات پر غور کر رہی تھی۔ یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ اگر کبھی مشتاق نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا تو وہ کہاں جائے گی؟ کس کے گھر میں پناہ لے گی؟ اتنی بڑی دنیا میں صرف ایک نیلو قابلِ اعتماد تھی اور اس کی سرپرست بن سکتی تھی لیکن وہ بھی اپنے حالات سے مجبور تھی۔

جو لوگ خود سمجھنا نہیں چاہتے۔ انہیں بدلتے ہوئے حالات سمجھا دیتے ہیں۔ فاخرہ کو اس کے حالات سمجھا رہے تھے کہ اتنی بڑی دنیا میں صرف ایک مشتاق ہی ایسا مستحکم سہارا ہے جسے اب مضبوطی سے تھام لینا چاہیے۔ وہ چوری چھپے اپنے گھر والوں کی طرف جھک رہا ہے۔ اسے اس گھر کے دروازے سے واپس لانا چاہیے۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ مشتاق اس سے ناراض ہو کر غصے سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے گیا تھا۔ اکثر یہی ہوتا تھا جب وہ غصہ دکھا کر جاتا تھا تو وہ اس کی پرواہ نہیں کرتی تھی۔ اپنے بچے سے لگی رہتی تھی۔ دوسرے تیسرے دن وہ خود ہی اس سے صلح کر لیتا تھا۔ آج وہ صلح کرنے پہنچ گئی۔

مشتاق دوسرے کمرے میں فرش پر چٹائی بچھائے لیٹا ہوا تھا۔ اِدھر سے اُدھر کروٹیں بدل رہا تھا۔ اسے دروازے پر دیکھتے ہی چونک گیا۔ فوراً ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پچھلے پانچ برسوں میں وہ ہمیشہ ناراض ہوتا رہا تھا۔ پھر خود ہی اسے مناتا رہا تھا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ اسے منانے آئی ہو۔

وہ شدید حیرانی سے اور سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس کے پاس آئی پھر چٹائی پر دوزانو ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا وہ چہرے سے شرمندگی ظاہر کر رہی تھی لیکن منہ سے کچھ نہیں بول رہی تھی۔

وہ انتظار کر رہا تھا کہ جب آئی ہے تو ضرور کچھ بولے گی۔ ویسے اس کا جھکا ہوا سر کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے رویے پر شرمندہ ہے۔

یہ بات بھی مشتاق کے لیے حیرت انگیز تھی کہ اسے اپنے غلط رویے کا احساس ہو گیا تھا اور شرمندہ سی دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے لئے یہ بہت بڑی بات تھی کہ پہلی بار وہ اپنی غلطی کا احساس کر کے ندامت سے اس کے پاس آئی تھی۔

وہ تھوڑی دیر تک انتظار کرتا رہا پھر بولا۔ ''کیا بات ہے؟ اپنے بیٹے کو تنہا چھوڑ کر آئی ہو۔ ویسے تمہارا اس طرح آنا مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ کچھ بولو تو سہی؟''

وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ''ہم دوسرا بیڈ خرید کر لائیں گے۔ فاخر اس پر سویا کرے گا۔''

اس مختصر سے فقرے نے سمجھا دیا کہ آئندہ ان کے درمیان کوئی دیوار نہیں رہے گی۔ وہ خوشی سے نہال ہو گیا۔ آگے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر بولا۔ ''فاخرہ! میری جان! آج تم نے مجھے بہت ہی خوش کیا ہے۔''

وہ اس کی آغوش میں چھپ کر بولی۔ ''میں تمہاری ہر بات مانوں گی۔ تم بھی میری بات مانو گے۔ میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچاؤ گے۔''

''میں نے کبھی تمہارے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی ہے۔''

''تم جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھ سے چھپ کر اپنے والدین سے ملنے جاتے ہو۔ میں تم

سے بحث نہیں کروں گی۔ بس یہ چاہتی ہوں کہ جس گھر کا دروازہ میرے لئے بند ہے تم اس دروازے پر آئندہ نہیں جاؤ گے۔''

وہ بولا۔ ''تم نے مجھے تنہا چھوڑ دیا تھا۔ مجھے سہارے کی ضرورت تھی اس لیے میں امی کی طرف چلا گیا۔ آج تم مجھے اتنی اپنائیت اتنی خوشیاں دے رہی ہو کہ آئندہ اس دروازے پر تمہارے ساتھ جاؤں گا ورنہ کبھی ادھر کا رخ نہیں کروں گا۔''

شادی کے پانچ برس بعد فاخرہ کو پہلی بار وہ اپنا اپنا سا لگ رہا تھا۔ اس کی آغوش میں ایسا اطمینان اور ایسی خوشیاں مل رہی تھیں جیسے وہ ساری دنیا کو فتح کر رہی ہو۔

☆======☆======☆

بھولے خان کو یقین تھا کہ جب راجا گل نواز کا دل بھر جائے گا تو وہ نیلو سے بیزار ہو جائے گا۔ اسے گھر کے کچرے کی طرح باہر نکال پھینکے گا۔ جب ایک مرد کا سہارا چھوٹ جائے گا، سر پر چھت نہیں رہے گی تو وہ پچھتا کر باپ کے پاس لوٹ آئے گی۔

وہ بوڑھا پرانا پاپی تھا۔ رئیسوں کے مزاج کو خوب سمجھتا تھا اس نے سوچا کہ نیلو کے مقابلے میں راجا گل نواز کے سامنے نوشاد کی بیٹی غزالہ کو پیش کرے گا لیکن ان دنوں وہ کھلتی ہوئی کلی تھی۔ نوشاد نے اعتراض کیا تھا اور بھولے خاں سے کہا تھا۔ ''جلد بازی نہ کرو۔ ابھی اسے کھلنے دو میں اسے سکھا پڑھا رہی ہوں۔ جب اس میں کچھ تیزی طراری آجائے گی۔ تب راجا گل نواز جیسے رئیسوں کو پھانسا جائے گا۔''

ایک تو بھولے خاں چھٹا ہوا تھا۔ اوپر سے نوشاد بھی کچھ کم نہیں تھی۔ ان دونوں کے سائے میں غزالہ نے ایسی تربیت حاصل کی تھی کہ کلی سے پھول اور پھول سے ایک دم بھری ہوئی بندوق بن گئی تھی۔ ہوس کے کاؤنٹر پر ہاتھوں ہاتھ کیش ہو سکتی تھی۔

لوگ غلط راستوں سے بھی خوشیاں حاصل کرتے ہیں اور خوش نصیب کہلاتے ہیں۔ بھولے خاں نے پہلی بیوی کے ذریعے خوش نصیبی حاصل کرنی چاہی۔ وہ مرگئی تو بیٹی کا سہارا لیا۔ پھر نوشاد کو اس کی جوان بیٹی سمیت اپنے گھر لے آیا۔ دولت اور خوشیاں حاصل کرنے کے لئے طرح طرح کے ہتھکنڈے آزمائے لیکن اچھا کھانا پینا اور اچھا پہننا اوڑھنا کبھی کبھی نصیب ہوتا رہا۔ اب غزالہ سے آس بندھی تھی کہ اس کے ذریعے اچھی خاصی دولت حاصل ہو سکے گی۔

بھولے خاں نے غزالہ کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''نوشاد! یہ ہماری

فرماں بردار بیٹی ہے نیلو کی طرح ہم سے دغا نہیں کرے گی۔ اس کم ظرف بیٹی نے میرا گھر برباد کردیا۔ اب میں اسے آباد نہیں رہنے دوں گا۔"

منصوبہ بن چکا تھا جو تدبیر سوچی گئی تھی۔ اس پر عمل کرنے کے لئے نوشاد اپنی بیٹی غزالہ کو لے کر اس کوٹھی میں پہنچی جہاں نیلو راجا گل نواز کے ساتھ ازدواجی زندگی گزار رہی تھی۔ اپنی خوش نصیبی پر خدا کا شکر ادا کر رہی تھی اور اس بات سے بے خبر تھی آگے اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔

وہ راجا گل نواز کے ساتھ لان میں بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ کاروبار کے سلسلے میں اور اپنی بیوی اور بچے سے ملنے کبھی لندن جایا کرتا تھا اور کبھی پاکستان آکر چند ہفتے یا چند مہینے گزارا کرتا تھا۔ وہ چھوٹی سی کوٹھی اس کی ملکیت تھی وہاں رہنے کے دوران میں کبھی کبھی گھر والی کی کمی پوری کرنے کے لیے کسی نہ کسی کو ایک رات کے لیے بلا لیا کرتا تھا۔ جب سے نیلو اس کی زندگی میں آئی تھی تب سے یہ سلسلہ بند ہو چکا تھا۔

اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کے راجا صاحب کسی اور رانی کی آرزو نہ کریں۔ وہ دن رات اس کی خدمت کرتی تھی۔ اس کے دن رات کا حساب رکھتی تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ کاروبار میں بھی دلچسپی لیتی تھی کہ وہ کس طرح کاروباری معاملات میں وقت گزار رہا ہے؟ وہ یہی چاہتی تھی کہ اسے فاضل تفریح اور عیش و عشرت کے لیے فرصت نہ ملے اور جو فرصت ملے تو وہ اس کی تمام مصروفیات کو اپنے لیے وقف کرلے۔ اب وہ یہی کرتی آرہی تھی۔

نوشاد اپنی بیٹی کے ساتھ اس کوٹھی کے لان میں گھس آئی۔ چوکیدار اسے روکتا ہی رہا۔ وہ یہ کہتی رہی کہ راجا گل نواز اس کا داماد ہے اور وہ اس کی ساس ہے۔

چوکیدار نے کہا۔ "میں نے آپ کو پہلے یہاں کبھی نہیں دیکھا۔"

نوشاد نے سو کا ایک نوٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ "اسے تو دیکھا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے وہ نوٹ اس کے ہاتھ پر رکھا تو وہ چپ رہ گیا۔ آگے کچھ کہنا بھول گیا۔

راجا گل نواز لان میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر چوکیدار سے پوچھا۔ "کون ہے دین محمد؟"

نوشاد اپنی بیٹی کے ساتھ تیزی سے چلتی ہوئی قریب آتے ہوئے بولی۔ "بیٹے! تم مجھے نہیں پہچانتے ہو لیکن میری بیٹی نیلو مجھے اچھی طرح پہچانتی ہے۔"

نیلو نے سر گھما کر دیکھا پھر نوشاد پر نظر پڑتے ہی ایک دم سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ وہ

کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اتنے برسوں بعد وہ اچانک ہی اس کے دروازے پر چلی آئے گی۔ جب کہ اس نے اپنے باپ کو بھی دروازے پر آنے سے منع کیا تھا۔

وہ پہلے تو کچھ بول نہ سکی۔ حیرانی اور پریشانی سے ان ماں بیٹی کو دیکھتی رہی۔ تقریباً پانچ برس پہلے اس نے غزالہ کو دیکھا تھا۔ اب تو وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ ایسی بھرپور جوان دوشیزہ ہو گئی تھی، ایسی بلا کی خوبصورتی اور شادابی پائی تھی کہ جو اسے ایک بار دیکھتا پھر دیکھتا ہی چلا جاتا۔

نیلو نے گھبرا کر اپنے میاں کو دیکھا تو میاں صاحب کی نظریں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح غزالہ پر پہنچ کر اٹک گئی تھیں۔

وہ پلٹ کر نوشاد سے بولی۔ "آپ یہاں کیوں آئی ہیں؟"

وہ ڈھٹائی سے مسکراتے ہوئے بولی۔ "اے بیٹی! خون کے رشتے کبھی نہیں ٹوٹتے۔ مانا کہ میں سوتیلی ماں ہوں لیکن تمہارے سگے باپ کی بیوی ہوں۔"

"میرا کوئی باپ نہیں ہے جو تھا وہ مر چکا ہے۔"

"تم نفرت اور غصے سے کوستی رہو گی تو وہ نہیں مرے گا۔ جتنی زندگی ہے اتنے دنوں تک تو ضرور جیئے گا۔ خدا بھی گناہ گاروں کو معاف کر دیتا ہے۔ کیا تم اپنے باپ کو معاف نہیں کرو گی؟"

ادھر غزالہ بڑی خاموشی سے اپنی ادائیں دکھا رہی تھی۔ راجا گل نواز سے نظریں ملا کر اس سے نظریں چرا رہی تھی اور چوری چوری شرما شرما کر اسے دیکھ رہی تھی۔ نیلو نے کہا۔ "میں نے سختی سے کہہ دیا تھا کہ اگر وہ یہاں قدم رکھے گا تو اسے بے عزت کر کے یہاں سے نکالا جائے گا۔ وہ بہت مکار ہے۔ خود تو نہیں آیا لیکن اس نے مٹھائی کی اس پلیٹ کے ساتھ تمہیں یہاں بھیج دیا ہے۔"

نوشاد نے کہا۔ "تم غصے میں ایسا کہہ رہی ہو۔ جب کہ حقیقت یہ نہیں ہے۔"

اس نے راجا گل نواز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "دروازے پر آنے والوں سے اخلاقاً مسکرا کر باتیں تو کرنی چاہئیں۔ کم از کم ایک گلاس پانی کے لیے پوچھنا تو چاہیے۔"

راجا گل نواز نے ایک نظر غزالہ پر ڈالی۔ غزالہ نے ایک گہری سانس لے کر اسے دیکھا۔ اس کی نظروں میں بھرپور شکایت تھی۔ وہ تڑپ کر بولا۔ "نیلو یہ کیا حرکت ہے؟ تمہیں اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دینا چاہیے اور تم ایسی کم ظرفی دکھا رہی ہو؟"

اس نے چونک کر اپنے میاں کو دیکھا پھر کہا۔ ''آپ مجھے کم ظرف کہہ رہے ہیں؟''

''تمہاری ان حرکتوں کے پیشِ نظر اور کیا کہنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے تمہیں ان سے اختلاف ہو لیکن یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ یہ صرف تمہارا نہیں میرا بھی گھر ہے۔ تم یہاں کسی کی بے عزتی کرو گی تو میری بھی بے عزتی ہو گی۔ تمہیں میری عزت کا تو کچھ خیال رکھنا چاہئے۔''

''آپ میرے باپ کی ذلالت کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ سمجھتے ہیں پھر بھی ان کی عزت کرنے کو کہہ رہے ہیں۔''

''مجھ سے بحث نہ کرو۔ میں جو چاہتا ہوں وہ کرو۔''

پھر اس نے نوشاد کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہاں آئیں تشریف رکھیں۔''

وہ خوش ہو کر بولی۔ ''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ یہ میری ایک ہی بیٹی غزالہ ہے۔ دسویں جماعت میں ہے بورڈ کا امتحان دینے والی ہے۔ ماشاء اللہ بہت ذہین ہے۔''

راجا گل نواز نے غزالہ پر بھرپور نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ ''بے شک دیکھنے سے ہی پتا چلتا ہے کہ آپ کی بیٹی صرف حسین ہی نہیں ذہین بھی ہے۔''

نیلو ان ماں بیٹی کو دیکھ رہی تھی۔ غصے سے تلملا رہی تھی۔ راجا گل نواز عام حالات میں اس سے بڑی محبت سے پیش آیا کرتا تھا لیکن جب اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوتی تھی۔ تو وہ اسے گالیاں بھی دیتا تھا اور اس کی پٹائی بھی کرتا تھا۔ جانور ہو یا انسان اپنے مالک کے لاکھ جوتے کھاتا ہے۔ برا نہیں مانتا۔ وہ بھی برا نہیں مانتی تھی۔ اسے اپنا اَن داتا، اپنا آقا سمجھ کر اس کے ظالمانہ انداز سے بھی پیار کرتی تھی۔ اس نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ''جاؤ اور کسی ملازمہ سے کہو کہ دو گلاس ٹھنڈا جوس لے آئے۔''

نیلو نے ایک نظر غزالہ پر ڈالی پھر اس سے کہا۔ ''میں ان کی خاطر مدارت نہیں کروں گی۔''

اس نے اپنے پرس میں سے سو کا ایک نوٹ نکال کر غزالہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں سے جاؤ اور گھر جاتے ہوئے راستے سے جوس پی لینا۔''

غزالہ ایک دم سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ پھر راجا گل نواز سے بولی۔ ''میں یہاں محبت سے آئی ہوں کسی لالچ سے نہیں آئی ہوں۔ آپ کے سو روپے کا بہت بہت شکریہ۔ امی یہاں سے چلیں۔''

راجا گل نواز نے فوراً ہی اٹھ کر کہا۔ ''پلیز جسٹ اے منٹ، ذرا رک جاؤ۔''

یہ کہہ کر اس نے دانت پیستے ہوئے نیلو کو دیکھا پھر کہا۔ ''اگر تم چاہتی ہو کہ تمہاری انسلٹ نہ ہو تو اسی وقت یہاں سے چلی جاؤ۔''

اور انسلٹ کیسے ہوتی ہے؟ میاں کا رویہ ہی توہین آمیز تھا۔ وہ جواباً کچھ کہنا چاہتی تھی۔ وہ غصے سے دھاڑتے ہوئے بولا۔ ''گیٹ لاسٹ۔''

وہ ذلت کے احساس سے زمین میں گڑنے لگی۔ جھنجلا کر وہاں سے جانے لگی وہ اپنے آقا کے تیور کو خوب سمجھتی تھی وہ اسے سونے کے نوالے کھلایا کرتا تھا لیکن کبھی غصے کی حالت میں کبھی نشے کی حالت میں رات کو اس کا کچومر بنا دیا کرتا تھا۔ وہ جیسا بھی تھا اس کے بہترین مستقبل کی اور نیک نامی کی ضمانت تھا۔

وہ اسے دل و جان سے چاہتی تھی لیکن اس وقت اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ کوٹھی کے اندر پہنچتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ان ماں بیٹی کو دیکھتے ہی دل میں جو اندیشہ پیدا ہوا تھا اب وہ مستحکم ہوتا جا رہا تھا۔ دل میں تجسس بھڑک رہا تھا کہ پتا نہیں وہ ماں بیٹی راجا گل نواز سے کیا باتیں کر رہی ہیں اور کس طرح اسے پھانس رہی ہیں؟

وہ آنسو پونچھتی ہوئی کچن میں آئی پھر ملازمہ سے بولی۔ ''مہمان آئے ہوئے ہیں دو گلاس جوس لے کر لان میں جاؤ۔''

وہاں سے وہ اپنے بیڈ روم میں آئی۔ بیڈ روم کی کھڑکی سے لان کا وہ منظر دکھائی دے رہا تھا۔ جہاں وہ تینوں کرسیوں پر ایک دوسرے کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ راجا صاحب جیسے دولت مند لوہے کے چنے ہوتے ہیں لیکن ان چنوں کو ہوس کی ہانڈی میں ڈالا جائے تو وہ ایک ہی آنچ میں گل جاتے ہیں چبانے کے قابل ہو جاتے ہیں۔

نیلو اپنے میاں کی ہوس پرستی کو خوب سمجھتی تھی۔ جب کبھی میاں صاحب لندن سے آتے تھے تو اکثر نئے پھول نئی خوشبو کی باتیں کرتے رہتے تھے۔

وہ دونوں جوس پینے کے بعد اٹھ کر کھڑی ہو گئیں۔ نیلو نے اطمینان کی سانس لی کہ وہ جا رہی ہیں لیکن راجا گل نواز انہیں کوٹھی کے اندر لے آیا تھا۔ نیلو بھی ڈرائنگ روم میں آ گئی۔ راجا صاحب نے اس سے کہا۔ ''غزالہ کوٹھی کو اندر سے دیکھنا چاہتی ہے۔ اسے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ شعر و شاعری سے بہت دلچسپی ہے۔''

پھر وہ غزالہ سے بولا۔ ''آؤ میں تمہیں اپنی لائبریری دکھاتا ہوں۔ وہاں تمہیں نئے اور

پرانے تمام شعراء کی کتابیں ملیں گی۔"

نوشاد نے مسکراتے ہوئے نیلو کو دیکھا پھر کہا۔"نیلو ہم یہاں ڈرائینگ روم میں بیٹھتے ہیں انہیں جانے دو۔"

نیلو نے طنزیہ انداز میں غزالہ کو دیکھا پھر کہا۔"مجھے بھی شعروشاعری سے بہت دلچسپی ہے میں بھی ان کے ساتھ جاؤں گی۔"

راجا گل نواز نے کہا۔"تم پھر بے تکی باتیں کر رہی ہو۔تمہیں یہاں ڈرائنگ روم میں رہ کر انہیں کمپنی دینی چاہیے۔یہاں بیٹھ کر ان سے باتیں کرو ہم ابھی آتے ہیں۔"

وہ غزالہ کے ساتھ چلتا ہوا ڈرائنگ روم سے باہر کوٹھی کے دوسرے حصے کی طرف چلا گیا۔وہ ایک بات صرف ایک بار کہتا تھا۔اس کے بعد بحث وتکرار پسند نہیں کرتا تھا۔وہ اپنے میاں کے مزاج کو خوب سمجھتی تھی اس لیے چپ کھڑی رہی۔جب وہ چلا گیا تو نوشاد نے مسکرا کر کہا۔"آؤ بیٹھو!میں تمہیں کچھ سمجھانا چاہتی ہوں۔"

وہ حقارت سے بولی۔"جتنا میرے باپ نے سمجھایا وہی بہت تھا۔اس کے بعد اب کچھ سمجھنے کی ضرورت نہیں رہی ہے۔"

وہ آرام سے صوفے کی پشت پر ٹیک لگا کر بولی۔"بہت کچھ سمجھنے کے بعد بھی سب کچھ سمجھنے کے لیے رہ جاتا ہے۔زندگی کے کڑوے گھونٹ پینے کے بعد یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس کے بعد اور کڑوے گھونٹ نہیں ملیں گے۔"

وہ ایک صوفے پر بیٹھتے ہوئے بولی۔"یہ تو میں تمہیں دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ میری زندگی میں زہر گھولنے آئی ہو مگر تم بہت پچھتاؤ گی۔"

وہ ہنستے ہنستے کہنے لگی۔"کھسیانی بلی کو کھمبا نوچتے دیکھ رہی ہوں۔یہ بتاؤ کیا آج کل تم آئینہ دیکھتی ہو؟"

نیلو نے اسے سوالیہ نظروں سے گھور کر دیکھا وہ بولی۔"آئینہ دھوکا دیتا ہے۔بدصورت کو خوبصورت اور بوڑھی کو جوان بتاتا ہے لیکن جس میں عقل ہوتی ہے وہ آئینے کے سامنے اپنی خوبیاں ہی نہیں خامیاں بھی دیکھتی ہے۔تمہیں دیکھنا اور سمجھنا چاہیے کہ تمہاری عمر ڈھل رہی ہے۔ملازمت کرنے والوں کو بڑھاپا آتے ہی ریٹائر کر دیا جاتا ہے۔کھلتے ہوئے پھولوں کو صبح گلدان میں سجایا جاتا ہے۔شام ہوتے ہوتے وہ مرجھانے لگتے ہیں۔انہیں گلدان سے نکلنا پڑتا ہے۔بازار کی عورتیں جوانی کی ایک ایک بوند خرچ کر دینے کے بعد نئی آنے والیوں

کے لیے جگہ چھوڑ دیتی ہیں۔یہ کوٹھی حقیقتاً ایک کوٹھا ہے۔اسے لکھ لو کہ میری بیٹی اس کوٹھے میں آنے والی ہے اور تم یہاں سے جانے والی ہو۔"

وہ بڑے دکھ سے بولی۔"تمہیں میرا گھر میری خوشیاں چھین کر کتنی خوشی ہوگی؟انسان اتنا کمینہ کیوں ہے۔وہ دوسروں سے چھینتا کیوں ہے؟"

"اپنے گریبان میں جھانک کر یہی سوال کرو۔تم نے بھی راجا صاحب کی پہلی بیوی سے اس کا شوہر چھین لیا۔اس کا یہ گھر چھین لیا۔اس دنیا میں بہت کم خوش نصیب ایسے ہیں جنہیں مانگنے سے محبت مل جاتی ہے ورنہ جہاں سر اٹھا کر دیکھو!وہاں چھینا جھپٹی کا عمل جاری ہے اور جاری رہے گا۔"

نیلو بہت کم بول رہی تھی۔اس کی باتیں سن رہی تھی اور سننے کے دوران میں بار بار دروازے کی طرف دیکھ رہی تھی۔آدھا گھنٹا گزر گیا تھا۔راجا صاحب غزالہ کو لے کر لائبریری میں گئے تھے۔اچھے خاصے پڑھے لکھے انسان تھے لیکن کم سن لڑکیاں جب بڑی عمر والوں کو پڑھاتی ہیں تو وہ اپنی پچھلی تمام پڑھائی بھول جاتے ہیں۔

نیلو کا دل ڈوب رہا تھا۔اس وقت وہ ان ماں بیٹی کے سامنے اپنی بے عزتی کرانا نہیں چاہتی تھی۔اس لیے دل پر جبر کیے بیٹھی تھی اور خون کے گھونٹ پی رہی تھی۔

وہ تقریباً پون گھنٹے بعد واپس آئے۔غزالہ کے ہاتھوں میں کچھ کتابیں تھیں۔وہ چہک کر بولی۔"امی!راجا صاحب بہت ہی باذوق انسان ہیں۔شعر بھی کہتے ہیں انہوں نے اپنے کئی اشعار سنائے ہیں۔میں یہ کتابیں گھر لے جا رہی ہوں۔"

پھر وہ نیلو کو دیکھتے ہوئے بولی۔"یہ تو کہہ رہے تھے کہ میں پوری لائبریری اور پورا گھر لے جا سکتی ہوں لیکن میں نے مناسب نہیں سمجھا آخر یہ میری نیلو باجی کا گھر ہے ان کے پاس بھی تو کچھ رہنا چاہیے۔آئیں اب ہم چلیں۔"

نوشاد فاتحانہ انداز میں مسکرا کر نیلو کو دیکھ رہی تھی۔غزالہ ماں سے بولی۔"باہر دھوپ اور گرمی ہے۔پہلے کسی ملازم سے ٹیکسی منگوالی جائے۔"

راجا گل نواز نے کہا۔"میری گاڑی آپ کو گھر تک پہنچا دے گی۔میں ابھی ڈرائیور سے کہتا ہوں،میرے ساتھ چلیں۔"

وہ ان ماں بیٹی کے ساتھ کوٹھی سے باہر چلا گیا۔ان کے جاتے ہی نیلو کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔وہ اپنے آنچل سے منہ چھپا کر روتے ہوئے صوفے پر بیٹھ گئی۔راجا گل نواز

انہیں رخصت کرنے کے بعد واپس آیا تو ڈرائنگ روم میں اسے روتے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس کے قریب آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا حماقت ہے؟ کیوں خواہ مخواہ رو رہی ہو؟''

وہ اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے ان کے سامنے میری بے عزتی کی اور پھر پوچھ رہے ہیں کہ میں کیوں رو رہی ہوں؟''

وہ ذرا دھیمے لہجے میں بولا ''میں تمہیں مارتا پیٹتا ہوں۔ تمہاری توہین کرتا ہوں مگر تمہیں محبتیں بھی دیتا ہوں۔ یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم مجھے دل و جان سے چاہتی ہو اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اس وقت تم توہین کے احساس سے نہیں رو رہی ہو۔ دنیا کی ہر عورت کو آنے والی سوکن رلاتی ہے۔''

وہ سسکتے ہوئے بولی۔ ''آپ نے مجھ سے شادی کی اور کتنی شادیاں کریں گے؟''

''میں نے یہ تو نہیں کہا کہ شادی کر رہا ہوں۔ تم خیال ہی خیال میں میری شادی کرا رہی ہو اور اپنی سوکن لا رہی ہو۔''

''سچ بولیں۔'' کیا آپ کا دل غزالہ پر نہیں آیا ہے؟

''ہم تو من موجی ہیں۔ کسی پر دل آتا ہے تو ذرا دل پشوری کر لیتے ہیں۔ اس کے بعد کون آتی ہے کون جاتی ہے ہم نے کبھی یہ حساب نہیں رکھا۔ میری پہلی بیوی کو اعتماد ہے کہ مجھے پاکستان میں کسی ساتھی کی ضرورت تھی۔ تم میری ضرورت تھیں اور اب بھی ہو۔ اس لیے میں نے تم سے شادی کی ہے۔ میری پہلی بیوی کو یقین ہے کہ دوسری کے بعد تیسری نہیں کروں گا۔ اس طرح تمہیں بھی مجھ پر بھروسا کرنا چاہئے۔''

''کیسے بھروسا کروں؟ آپ کی پہلی وائف کے پاس دولت ہے، جائیداد ہے۔ میرے پاس کیا ہے؟ میں مانتی ہوں پہلے کبھی پانچ دس ہزار روپے ایک ساتھ نہیں دیکھے تھے۔ آج میرے اکاؤنٹ میں تین لاکھ روپے ہیں لیکن بینک بیلنس تو کسی بھی وقت ختم ہو سکتا ہے۔ یہ چھت میری نہیں ہے کوئی بھی دوسری آنے والی مجھے اس گھر سے بے گھر کر سکتی ہے۔ آپ نے کہا تھا کہ یہ کوٹھی میرے نام کریں گے لیکن اب تک اپنا وعدہ پورا نہیں کیا ہے۔''

''میں نے کہا نا، کوئی میری منکوحہ بن کر یہاں نہیں آئے گی اور غزالہ تو کبھی نہیں آئے گی۔''

اس نے چونک کر بے یقینی سے راجا گل نواز کو دیکھا پھر کہا۔ ''آپ تو اس کے آگے

بچھے جا رہے تھے۔ ایک تو وہ حسین ہے میرے مقابلے میں بہت کم سن ہے پھر یہ کہ میرے باپ نے اور اس سوتیلی ماں نے اسے بڑی زبردست ٹریننگ دی ہے میں اس کے ناز و انداز دیکھ رہی تھی آپ تو اسے ہاتھوں ہاتھ لے رہے تھے۔''

''بے شک میرا دل اس پر آ گیا ہے لیکن وہ لمبا ہاتھ مارنا چاہتی ہے۔''

نیلو نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا وہ بولا۔ ''میں نے جب اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ فوراً ہی ہاتھ چھڑا کر بولی کہ میری زندگی میں کوئی ایک جیون ساتھی آئے گا میں اپنے ماں باپ سے کہہ چکی ہوں۔ کوئی غلط دھندا نہیں کروں گی۔''

نیلو نے حقارت سے کہا۔ ''بڑی پارسا بنتی ہے میرا باپ کیسا قصائی ہے ابھی نہیں جانتی وہ اسے کبھی کسی ایک مرد کی ہو کر نہیں رہنے دے گا۔''

''میں نے اسے کہا تھا کہ میں تمہارے باپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تمہیں کیش کرتا رہے گا۔ لہٰذا لین دین کی باتیں کرو۔ نہیں کرو گی تو تمہارے ماں باپ خود ہی آ کر مجھ سے معاملات طے کریں گے۔''

وہ ذرا چپ ہوا پھر بولا۔ ''وہ کہنے لگی آپ شریف آدمی ہیں میرے جذبات کو سمجھیں۔ میں شریفانہ زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ جس طرح آپ نے نیلو باجی کو نیک نامی دی ہے اسی طرح مجھے بھی دے سکتے ہیں۔ آپ مجھے ایک گھر دیں گے۔ میرا مستقبل محفوظ کریں گے تو میں ماں باپ کو راضی کر لوں گی۔ میں نے کہا۔ ''میں نے پہلی وائف کی رضامندی سے دوسری شادی کی ہے۔ اب تیسری نہیں کروں گا۔ اپنی دونوں بیویوں کو دل و جان سے چاہتا ہوں۔ ان پر سوکن نہیں لاؤں گا۔ جب دل بہلانے کے لیے ایک نہ سہی دوسری مل جاتی ہے تو پھر شادی کی ضرورت ہی کیا ہے؟''

نیلو نے کہا۔ ''وہ تو یہاں سے ایسے خوش ہو کر گئی ہے جیسے میدان مار کر جا رہی ہو۔''

''وہ ایک آفر دے کر گئی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ شاید میں اس کی آفر قبول کر لوں گا۔''

نیلو نے پوچھا۔ ''وہ آفر کیا ہے؟''

''وہ کہہ رہی تھی کہ میں اس سے شادی نہ کروں نکاح نہ پڑھاؤں اگر میں اسے ایک اچھا سا فلیٹ خرید کر دوں گا اور ہر ماہ پچیس ہزار روپے ادا کرتا رہوں گا تو وہ صرف میری داشتہ بن کر رہے گی۔ پھر کسی دوسرے کا منہ نہیں دیکھے گی۔''

نیلو نے ناگواری سے کہا۔ ''اونہہ، باتیں بنا رہی ہے۔ میرے باپ کے ہاتھوں میں رہ

کر اس ہاتھ سے اس ہاتھ نہ جائے۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔"

وہ تائید میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ "مجھے بے وقوف سمجھ رہی ہے لیکن میں نے بھی بات صاف کر دی ہے، اس سے کہہ دیا ہے کہ اتنا مہنگا سودا نہیں کروں گا۔ تم پہلی بار آؤ گی تو دس ہزار روپے دوں گا۔ پھر جب بھی آیا کرو گی تو پانچ ہزار روپے لے کر جایا کرو گی۔ گھر جا کر اپنے ماں باپ سے یہ بات کہہ دو میں اس سے زیادہ افورڈ نہیں کر سکوں گا۔ میں نے اسے اپنا موبائل نمبر دیا ہے وہ ڈینگیں مار رہی تھی کہ اور دو تین رئیسوں نے اس کے باپ کو بڑی بڑی آفر دی ہیں لیکن وہ میری ہی داشتہ بن کر رہنا چاہتی ہے۔ آج رات نو بجے تک مجھے فون کرے گی اور اپنا فیصلہ سنائے گی۔"

وہ نیلو کے ہاتھ کو اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔ "تمہیں مجھ پر بھروسا کرنا چاہیے۔ میں نے اس سے کہہ دیا کہ میں اپنا فیصلہ سنا چکا ہوں لیکن اسے پتا نہیں کیوں اتنا یقین ہے کہ میں اس کی آفر قبول کر لوں گا۔ اس کے لیے ایک فلیٹ خریدوں گا اور ہر ماہ پچیس ہزار روپے اس پر لٹایا کروں گا۔ اگر وہ یہاں سے فاتحانہ انداز میں خوش ہو کر گئی ہے تو یہ اس کی خوش فہمی ہے۔"

"میں آپ کے مزاج کو سمجھتی ہوں۔ آپ خواہ مخواہ دولت نہیں لٹائیں گے اور شادی کر کے اپنی لڑکی کو گلے کا پھندا نہیں بنائیں گے۔ آپ نے ساری باتیں سچ سچ بتا دیں اب میں مطمئن ہو گئی ہوں۔"

وہ بولا۔ "میری پہلی وائف ہمیشہ سے میری ہم راز رہی ہے۔ وہ جانتی تھی کہ میں پاکستان جا کر ہمیشہ پاک صاف نہیں رہتا ہوں لیکن وہ اس سلسلے میں لڑتی جھگڑتی نہیں تھی۔ وہ یہ بھی سمجھتی تھی کہ پاکستان میں کسی سے شادی کر لوں گا اور میں نے تم سے شادی کر لی۔"

"میں یہ ساری باتیں جانتی ہوں اور آپ بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ میں کس طرح آپ کے مزاج کو سمجھتی ہوں اور آپ کی پسند اور ناپسند کے مطابق زندگی گزار رہی ہوں۔"

"تو پھر تم مجھ سے تعاون کرو گی۔ جب وہ میری آفر مان لے گی۔ پہلی بار دس ہزار اور پھر پانچ ہزار پر راضی ہو جائے گی تو تم کبھی کبھی اسے ایک رات کے لیے یہاں آنے دیا کرو گی۔"

یہ بڑی تکلیف دہ بات تھی وہ پریشان ہو کر بولی۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں آپ میرے ہی گھر میں، میری ہی چھت کے نیچے اس دشمن لڑکی کے ساتھ رات گزاریں گے؟"

"تم اچھی طرح جانتی ہو میں عزت دار ہوں اور اپنی بدنامی سے بہت ڈرتا ہوں۔ میں نے کبھی تمہیں کسی ہوٹل میں یا کسی دوست کی کوٹھی میں نہیں بلایا تھا۔ میں کبھی اس معاملے میں کسی دوست کو راز دار نہیں بناتا۔ میری عزت کو اور نیک نامی کو سمجھو اور گھر کی چار دیواری میں بات چھپی رہے گی۔"

"آپ ان کی مکاریوں کو نہیں سمجھ رہے ہیں۔ اگر وہ مجھے یہاں سے نہ نکال سکے تو اپنی لڑکی کو یہاں بھیج کر کسی بھی طرح آپ کو بدنام کرنا چاہیں گے۔"

"میں بھولے خاں جیسے دلالوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ ذلت کی زندگی گزارنے والے ایسے چھوٹے لوگ ہم پر کیچڑ اچھالنے کی جرأت نہیں کرتے ہیں۔ فرض کرو اگر اس نے یہاں پولیس والوں کو بھیج بھی دیا تو یہ ثابت ہو جائے گا کہ غزالہ تمہاری چھوٹی بہن ہے۔ تمہارے باپ کی دوسری بیوی کی بیٹی ہے۔ ایک رشتہ دار کی حیثیت سے یہاں آئی ہوئی ہے۔ ہم پر کوئی غلط الزام نہیں ہو سکے گا۔"

نیلو نے ہچکچاتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ اس کی خواہشات کو لگام نہیں دے سکتی تھی اور یہ جانتی تھی کہ ایسی خواہشات کے نتیجے میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ وہ اس کے ہاتھ کو تھپکتے ہوئے بولا۔ "میری بات مان لو۔ میں زبردستی بھی منوا سکتا ہوں لیکن جھگڑا نہیں کروں گا۔ نہیں مانو گی تو لندن چلا جاؤں گا۔"

وہ بڑی بے بسی سے بولی۔ "میں تو آپ کی ہر بات مانتی ہوں لیکن آپ ہی میری بات نہیں مانتے ہیں۔"

"ایسی کون سی بات ہے جو نہیں مانتا؟"

"پہلے آپ یہ کوٹھی میرے نام کریں پھر میں غزالہ کو یہاں آنے دوں گی۔ ورنہ مجھے اندیشہ رہے گا کہ وہ مکار لوگ مجھے یہاں سے نکال دیں گے۔"

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ "بس اتنی سی بات ہے۔ یہ تو میں تمہارے نام کرنے ہی والا ہوں۔ میں ابھی فون پر وکیل سے کہتا ہوں کہ وہ تمہارے نام سے کاغذات تیار کرے ان شاء اللہ ایک آدھ ہفتے میں یہ کوٹھی تمہارے نام ہو جائے گی۔ میں کبھی کبھی عیاشی کرتا ہوں یہ الگ بات ہے لیکن تمہارے جائز حقوق سے کبھی نہیں محروم کروں گا۔"

نیلو کو ایک حد تک اطمینان حاصل ہو رہا تھا کہ وہ اپنے قدم اس گھر میں مضبوطی سے جما رہی ہے۔ غزالہ وہاں آ کر بھی اس کے قدم نہیں اکھاڑ سکے گی۔ راجا گل نواز اسے مستقبل کی

جوضمانت دے رہا تھا وہ تسلی بخش تھی۔

ماں بیٹی نے گھر پہنچ کر بھولے خاں کو وہاں کے حالات سنائے وہ سننے کے بعد مایوس ہو کر بولا۔"ہم نے کامیابی کی جو امید باندھی تھی وہ پوری نہیں ہو رہی ہے۔"

نوشاد نے کہا۔"پہلے ہی قدم پر منزل نہیں مل جاتی۔غزالہ کی سب سے بڑی کامیابی یہ ہے کہ وہ اس پر مرمٹا ہے اب ہم کسی رئیس کو زبردستی تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہماری بیٹی سے شادی کر لے۔تم دیکھتے رہو وہ شادی نہ کرے لیکن اسے داشتہ بنا کر ضرور رکھے گا۔"

بھولے خاں نے کہا۔"تم نیلو کو مجھ سے زیادہ نہیں جانتی ہو وہ کتے کی بچی ہے۔کمینی ہے۔غزالہ کے نام سے اسے فلیٹ خریدنے نہیں دے گی اور میں راجا گل نواز کو اچھی طرح جانتا ہوں اسے اپنی عزت اور نیک نامی کا بہت خیال رہتا ہے۔وہ ہماری بیٹی کو داشتہ بنا کر اپنی سوسائٹی میں بدنام نہیں ہونا چاہے گا۔"

نوشاد نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔"میں اس کی یہ آفر تو کبھی نہیں مانوں گی۔اتنا دولت مند ہو کر صرف دس ہزار اور پانچ ہزار کی باتیں کرتا ہے۔"

وہ سب موجودہ حالات پر غور کرنے لگے۔اپنے اپنے طور پر سوچنے لگے۔ان کی سوچ کا مرکز یہی تھا کہ غزالہ کو تو وہ کہیں بھی کیش کرتے رہیں گے لیکن نیلو نے اپنے گھر میں داخلہ بند کیا تھا۔اس گھر کے دروازے اپنے لیے ہمیشہ کھلے رکھنے تھے۔آخر کئی گھنٹے کی سوچ بچار کے بعد انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ راجا گل نواز نے جو دس ہزار اور پانچ ہزار کی آفر دی تھی اسے قبول کر لیا جائے۔اس طرح وہ غزالہ کے ذریعے نیلو کی زندگی میں بارودی سرنگ بچھاتے چلے جائیں گے۔

☆======☆======☆

دونوں بہنیں کسی حد تک کامیابی سے ازدواجی زندگیاں گزار رہی تھیں۔اس دنیا میں سبھی کو اچھے اور برے حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔وہ بھی اپنے برے حالات سے کسی نہ کسی طرح نمٹ رہی تھیں۔فاخرہ نے اپنے میاں کے آگے جھک کر اس کا دل جیت لیا تھا وہ اپنی ماں کے گھر کا راستہ بھول گیا تھا۔دو دن بعد بی بانو اس کی فیکٹری کے دروازے پر آئی۔بیٹے کو دیکھتے ہی بولی۔"تم دو دنوں سے کہاں ہو۔گھر کیوں نہیں آرہے ہو؟"

اس نے کہا۔"امی! میں انصاف کے تقاضے پورے کرنا چاہتا ہوں۔آپ صرف پوتے کو گھر لانے کے لیے کہتی ہیں میں آپ کی بہو کو بھی لانا چاہتا ہوں۔"

وہ بڑی ناگواری سے بولی۔"اس کا ذکر نہ کرو اس کم بخت کا دم نکلتا رہے گا تب بھی میں اسے اپنے گھر میں گھسنے نہیں دوں گی۔"

"تو پھر میں بھی اس گھر میں قدم نہیں رکھوں گا۔"

ماں نے چونک کر بیٹے کو دیکھا پھر کہا۔"معلوم ہوتا ہے وہ کسی عامل کے پاس جاتی ہے اور تم پر عمل کراتی رہتی ہے۔میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم اچانک اس طرح بدل جاؤ گے۔"

"امی! آپ خود ہی ٹھنڈے دماغ سے غور کریں۔میں اس کا شوہر ہوں، مجازی خدا ہوں۔اسے عزت بنا کر اپنی زندگی میں لایا ہوں۔اسے عزت سے اور نیک نامی سے رکھنا میرا فرض ہے اگر یہ نیک نامی ہم اور آپ نہیں دیں گے تو پھر کون دے گا؟"

"یہ لکھ لو پورے محلے میں پورے علاقے میں کوئی اسے عزت نہیں دے گا۔"

"خدا کا شکر ہے ہم جہاں رہتے ہیں وہاں اسے بہت عزت مل رہی ہے۔اس علاقے میں جو بہت بڑا اسکول ہے وہاں اسے ملازمت بھی مل رہی تھی۔ماہانہ ڈھائی ہزار روپے ملنے والے تھے لیکن اس نے انکار کر دیا۔"

بی بانو نے حیرانی سے پوچھا۔"اتنی اچھی تنخواہ مل رہی تھی اور اس نے انکار کر دیا۔تم نے انکار کر دیا ہوگا کہ بیگم صاحبہ دھوپ میں جایا کرے گی آیا کرے گی تو رنگ جل جائے گا۔کالی پڑ جائے گی۔"

"ایسی بات نہیں ہے امی! وہ اپنے بچے کو چھوڑ کر کہیں جانا نہیں چاہتی۔اب ہمارا بیٹا پہلی جماعت میں داخل ہو گیا ہے اور وہ کہہ رہی تھی کہ اس کی خاطر وہ اسکول میں ملازمت کرے گی تا کہ بیٹا گھر کے علاوہ اسکول میں بھی اس کے قریب ہی رہا کرے۔"

"بیٹا نہ ہوا ناک کا بال ہو گیا۔ہمیشہ کلیجے میں گھسائے رکھتی ہے۔تم نے تو صاف کہہ دیا کہ اب ہمارے گھر نہیں آؤ گے اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم میرے پوتے سے بھی مجھے نہیں ملاؤ گے۔"

"میں بھی آپ کا ہوں، وہ پوتا بھی آپ کا ہے لیکن آپ بہو کو پیار سے گلے لگائیں گی تو پیار کے رشتوں کے سارے حقوق آپ کو ملیں گے۔آپ یہ کیوں چاہتی ہیں کہ اپنی بہو کو کچھ نہ دیں اور بہو آپ کو اپنا شوہر اور اپنا بیٹا سب کچھ دے دے؟"

اس نے گھور کر غصے سے بیٹے کو دیکھا پھر بڑبڑاتی ہوئی وہاں سے جانے لگی۔"مجھے کیا

معلوم تھا کہ یہ جورو کا غلام نکلے گا؟ معلوم ہوتا تو پیدا ہوتے ہی اس کا گلا دبا دیتی۔''

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی ایسے جا رہی تھی جیسے دشمن کو قدموں تلے روندتی جا رہی ہو۔ بیٹے پر تھوڑی دیر کے لیے غصہ آیا تھا۔ پھر ماں کی ممتا نے سمجھایا کہ اس بے چارے کا کوئی قصور نہیں ہے جو بیویاں چالاک ہوتی ہیں وہ اسی طرح اپنے شوہروں کو غلام بنا لیتی ہیں۔

''میں نے بھی تو اس کے باپ کو سہاگ کی پہلی رات سے ایسی لگام دی ہے کہ وہ بڑھاپے میں بھی میرا تابعدار بنا ہوا ہے۔''

وہ چلتے چلتے ہانپنے لگی۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ غصے کے مارے تیزی سے چل رہی ہے۔ اسے اپنی عمر کے مطابق ٹھہر ٹھہر کر دھیرے دھیرے چلنا چاہیے۔ وہ دوپٹے کے آنچل سے چہرے اور گردن کا پسینہ پونچھنے لگی۔ دھوپ بہت تیز تھی۔ گرمی سے برا حال ہو رہا تھا۔ قریب ہی اس کے بھائی کا مکان تھا۔ وہ دھیرے دھیرے چلتی ہوئی اس مکان کے دروازے پر آئی وہاں دستک دی۔ بھاوج نے دروازہ کھول کر اسے دیکھا پھر حیرانی سے پوچھا۔ ''ہائے آپا جان! آپ اتنی دھوپ میں کہاں سے آ رہی ہیں۔ اندر آئیں پنکھے کے نیچے بیٹھیں۔''

اس کا بھائی گلزار احمد کھانا کھا رہا تھا۔ بہن کو دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''آؤ آپا روٹی کھاؤ۔''

وہ ایک چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔ ''ٹھنڈا پانی پلاؤ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ رہے ہیں۔''

بھاوج کولر سے ٹھنڈا پانی گلاس میں نکالنے لگی۔ گلزار نے کہا۔ ''اتنی دھوپ میں آنے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھ سے کوئی کام تھا تو بلا لیا ہوتا میں دوڑا چلا آتا۔''

''بیٹے سے ملنے گئی تھی۔ وہیں سے واپس آ رہی ہوں۔ تمہارا گھر قریب ہے اس لیے دم لینے آئی ہوں۔ بیٹے نے تو بے دم کر دیا ہے۔ زندگی نے اتنا نہیں دوڑایا، جتنا بیٹا دوڑا رہا ہے۔''

''آپ تو کہہ رہی تھیں کہ وہ ہماری طرف جھک رہا ہے اور اس عورت کو چھوڑنے والا ہے؟''

بھاوج نے پانی سے بھرا ہوا گلاس تھمایا۔ وہ غٹا غٹ پینے کے بعد بولی۔ ''وہ کمینی سفلی عمل کرنے والوں کے پاس جاتی ہے۔ پتا نہیں کیا جادو ٹونے کرا رہی ہے اس کا تو دل بالکل ہی پھر گیا ہے۔ ہمارے گھر آنے سے صاف انکار کر رہا ہے۔''

گلزار نے کہا۔ ''آپا! میں نے تو آپ سے کہا تھا۔ سیدھی انگلی سے گھی نہ نکلے تو مجھے بتائیں میں اس عورت کی ایسی کی تیسی کر دوں گا وہ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گی۔''

گلزار احمد اپنے علاقے میں سیاسی غنڈا کہلاتا تھا۔ تھانے والوں سے بھی اس کی علیک سلیک تھی۔ بی بانو اسے اپنے حالات بتانے کے بعد رونے لگی۔ وہ کھانا چھوڑ کر اٹھ گیا اس کے پاس آ کر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''آپا! آنسو پونچھو اور مجھے بتاؤ کیا چاہتی ہو؟''

وہ آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔ ''میں اس عورت کو کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتی یہ اچھی طرح جانتی ہوں میرا بیٹا اس کا دیوانہ ہے۔ اگر اسے کچھ ہوا تو یہ ذہنی توازن کھو بیٹھے گا، پاگل ہو جائے گا۔''

وہ سوچتی ہوئی نظروں سے بہن کو دیکھنے لگا۔ پھر بولا۔ ''اگر اس عورت کو بدنام کیا جائے گا۔ محلے والے بھی اس پر تھوکیں گے تو پھر مشتاق کو بھی عقل آئے گی۔ اس طرح اس کا دل اس عورت سے پھر جائے گا۔''

''میں چاہتی ہوں وہ عورت زندہ رہے مگر ذلت کی زندگی گزارتی رہے۔ میرا بیٹا اس پر تھوک کر چلا آئے۔''

پھر وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر ایک گہری سانس لینے کے بعد بولی۔ ''میرا دکھ کوئی نہیں سمجھے گا۔ میرا بیٹا بھی نہیں سمجھتا ہے۔''

بھاوج نے پوچھا۔ ''آپ ہمیں بتائیں اور کیا بات ہے آپ اور کیا چاہتی ہیں؟''

''میں اپنے پوتے کے لیے تڑپ رہی ہوں۔ جب سے وہ پیدا ہوا ہے میں نے اسے ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔ میں اسے سینے سے لگا کر خوب پیار کرنا چاہتی ہوں۔ ہمیشہ خیالوں اور خوابوں میں اسے دیکھتی رہتی ہوں۔''

گلزار نے کہا۔ ''بڑے افسوس کی بات ہے یہ میرا بھانجا بالکل ہی اس عورت کا غلام بن گیا ہے۔ پوتے کو ہم سے دور کر کے بہت بڑی غلطی کر رہا ہے۔ مجھے غصہ آئے گا تو میں اس کے بیٹے کو وہاں سے اٹھوا لوں گا۔''

بی بانو نے چونک کر اپنے بھائی کو دیکھا۔ اچانک ہی اس کے اندر آندھی سی چلنے لگی۔ وہ بیٹھے بیٹھے اِدھر سے اُدھر پہلو بدلنے لگی۔ بھائی نے پوچھا۔ ''کیا ہوا آپا؟''

وہ بولی۔ ''میرے دماغ میں پہلے یہ بات کیوں نہیں آئی؟''

''کون سی بات؟''

"یہی کہ اس ذلیل عورت نے میرے بیٹے کو مجھ سے چھینا ہے میں بھی اس کے بیٹے کو اس سے چھین سکتی ہوں۔"

بھاوج نے کہا۔"ہونا تو یہی چاہیے۔اسے معلوم تو ہو کہ اولاد ایک دم سے بچھڑ جائے تو ماں کے دل پر کیا گزرتی ہے۔کس طرح وہ جیتے جی مر جاتی ہے اسے یہ سبق ملنا چاہیے۔"

گلزار نے کہا۔"آپا! قدرتی طور پر میرے منہ سے یہ بات نکل گئی۔اس کا مطلب ہے کہ قدرت کو یہ منظور ہے۔جیسا آپ کے ساتھ کیا جا رہا ہے ویسا ہی اس عورت کے ساتھ کیا جائے۔"

بی بانو اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر بڑے جذبے سے بولی۔"یا اللہ! اس طرح میرا پوتا مجھے مل جائے گا۔میں اسے اتنی محبتیں دوں گی کہ وہ ماں کے پاس واپس نہیں جائے گا۔اسے بھول جائے گا۔"

بھائی نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔"وہ بچہ چلتا پھرتا ہے۔گھر سے باہر تو نکلتا ہوگا؟"

"ہوں وہ اسکول بھی جاتا ہے۔پہلی جماعت میں پڑھ رہا ہے۔ہائے اتنا سا بچہ اسکول یونیفارم میں کتنا پیارا لگتا ہوگا۔"

"میں اسے یونیفارم کے ساتھ اٹھا کر تمہارے گھر پہنچا دوں گا۔"

وہ گھبرا کر بولی۔"نہیں اسے میرے گھر لاؤ گے تو وہ ہمارے لیے مصیبت بن جائے گا۔وہ عورت بہت ہی تیز طرار ہے تھانے جا کر ہمارے خلاف رپورٹ لکھائے گی۔پولیس والوں کو ہمارے پیچھے لگا دے گی۔"

"پولیس والوں سے میری بھی یاری ہے۔کوئی مجھ پر شبہ نہیں کرے گا۔میں اسے یہاں لے آؤں گا۔ان کے ہاتھوں میں ہزار دو ہزار دوں گا تو وہ صاف کہہ دیں گے کہ بچہ ہمارے پاس نہیں ہے۔"

بی بانو خوش ہو رہی تھی اور کچھ گھبرا بھی رہی تھی۔اپنے دل کو سمجھا رہی تھی کہ کچھ نہیں ہوگا۔پوتا آئے گا اسے اتنی محبتیں دے گی کہ وہ ہمیشہ کے لیے اس کا ہو جائے گا اور وہ کم بخت ساری زندگی اپنے بیٹے سے محروم رہے گی۔

وہ اپنی گھبراہٹ پر قابو پانے کے لیے سوچنے لگی۔"اس کی طرف سے اندیشے بڑھیں گے تو میں اپنے پوتے کو لاہور لے جاؤں گی۔وہاں بہن کے گھر رہا کروں گی۔انتقام اسی طرح لینا چاہیے وہ میرے خلاف کچھ نہیں کر سکے گی اور مجھے پوتا بھی مل جائے گا۔اسے کہتے ہیں

سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔"

دوسرے دن فاخرہ کی زندگی میں سورج طلوع تو ہوا لیکن دوپہر ہوتے ہوتے ڈوب گیا۔آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ایک بجے اسکول کی چھٹی ہوئی وہ بیٹے کو لینے کے لیے گئی تو پتا چلا کہ فاخر اسکول میں نہیں ہے۔وہ چیخ پڑی۔"کہاں ہے میرا بچہ؟"

وہ پاگلوں کی طرح اسکول کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑتے ہوئے اسے پکارنے لگی۔"فاخر، فاخر! کہاں ہو تم میری جان! تمہاری امی تمہیں لینے آئی ہے۔کہاں چھپے ہوئے ہو؟"

وہ چھپا ہوا ہوتا تو ماں کی ایک آواز پر نکل آتا۔اس نے پرنسپل کے آفس میں آ کر ہنگامہ برپا کر دیا۔چیزیں اٹھا اٹھا کر پھینکنے لگی۔"میرا بچہ کہاں ہے اسے میرے پاس لاؤ ورنہ میں اس اسکول کو آگ لگا دوں گی۔"

کتنی ہی خواتین ٹیچرز نے اسے پکڑ کر قابو میں کیا اسے سمجھانے منانے لگیں۔تسلیاں دینے لگیں کہ فاخر کو تلاش کیا جا رہا ہے۔ایک پولیس افسر سپاہیوں کے ساتھ آ گیا تھا وہ بھی اسے سمجھا رہا تھا۔"چیخنے چلانے سے، رونے سے یا ہنگامہ کرنے سے بیٹا واپس نہیں آئے گا۔ہم نے تمام تھانوں میں اطلاع کر دی ہے۔اسے تلاش کیا جا رہا ہے۔"

اس نے مشتاق کی مل میں فون کیا اسے اطلاع دی۔"ہمارا بیٹا لاپتا ہو گیا ہے۔فوراً آؤ اسے کسی طرح تلاش کرو۔"

وہ مل سے چھٹی لے کر دوڑا دوڑا اسکول پہنچا۔اس وقت تک کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔اسکول کے تمام بچے اور ٹیچرز جا چکے تھے، چند ٹیچرز پرنسپل کے ساتھ رہ گئے تھے اور انسپکٹر بھی وہاں بیٹھا ہوا تھا۔وہ مشتاق کو دیکھتے ہی اس سے لپٹ کر رونے لگی۔پھر اسے دونوں ہاتھوں سے مارتے ہوئے کہنے لگی۔"مجھے میرا بیٹا چاہیے۔یہ لوگ کہتے ہیں کہ اسے اغوا کیا گیا ہے میں کچھ نہیں جانتی۔تم اس کے باپ ہو، اسے کہیں سے بھی ڈھونڈ کر لاؤ۔"

پولیس انسپکٹر نے مشتاق سے کہا۔"تمہاری وائف میں صبر اور حوصلہ نہیں ہے۔ہم بڑی دیر سے سمجھا رہے ہیں لیکن یہ کسی کی نہیں سن رہی ہیں۔بس روئے چلی جا رہی ہیں۔اسکول والوں کو الزام دے رہی ہیں۔پولیس والوں کو ناکارہ کہہ رہی ہیں۔تم انہیں سمجھاؤ اور گھر لے جاؤ۔"

وہ چیخ کر بولی۔"میں نہیں جاؤں گی۔اپنے بچے کو لیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤں

گی۔“

مشتاق نے اسے تھپک کر کہا۔ ”کچھ تو عقل سے کام لو ذرا سوچو اگر ہمارا بیٹا خود ہی اسکول کے احاطے سے نکل کر کہیں گیا ہے تو بھٹکتا ہوا ہمارے گھر آئے گا وہ صرف ہمارے گھر کا راستہ جانتا ہے۔ لہٰذا تمہیں فوراً گھر چلنا چاہئے اور وہیں اس کا انتظار کرنا چاہئے۔ باقی یہاں یہ پولیس افسر ہیں، یہ اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں امید ہے ہمارا بیٹا جلد ہی مل جائے گا۔“

وہ اسے سمجھا منا کر گھر لے آیا۔ گھر آ کر بھی اس کے آنسو نہیں رک رہے تھے۔ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”یہاں میرے پاس کیا کر رہے ہو۔ باہر جاؤ پورے محلے میں دیکھو، گلی کوچوں میں بچے کھیلتے رہتے ہیں انہوں نے شاید فاخر کو دیکھا ہو۔“

وہ باہر جانے لگا وہ دروازے تک آتے ہوئے بولی۔ ”تمہارے جتنے بھی جان پہچان والے ہیں سب سے مل کر آؤ سب سے بولتے رہو کہ ہمارا بیٹا کہیں گم ہو گیا ہے جو اسے ڈھونڈ کر لائے گا میں اپنی تمام سونے کی چوڑیاں، گلے کی چین اور کانوں کی بالیاں اسے دے دوں گی۔“

وہ باہر چلا گیا۔ اس نے دروازے کو بند کر دیا۔ پھر اسے کھول دیا مشتاق نے پلٹ کر پوچھا۔ ”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں میں یہ دروازہ بند نہیں کروں گی کھلا رکھوں گی وہ کسی بھی وقت آ سکتا ہے۔“

مشتاق نے بڑے دکھ سے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اسے دیکھا پھر کہا۔ ”خدا کرے وہ جہاں بھی ہو صحیح سلامت ہو اور ہمارے گھر ابھی پہنچ جائے میں اسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔“

وہ پلٹ کر چلا گیا وہ بڑی دیر تک دروازے پر کھڑی رہی پھر وہیں چوکھٹ پر بیٹھ گئی۔ محلے پڑوس کی عورتیں آنے لگیں۔ وہ رو رو کر انہیں اپنا دکھڑا سنا رہی تھی۔ وہ عورتیں اس سے ہمدردی ظاہر کرنے لگیں۔ کچھ نے اپنے بیٹوں کو اور بھائیوں کو فاخر کی تلاش میں روانہ کیا۔

کچھ عورتوں نے کہا۔ ”اغوا کرنے والے بچوں کو نقصان نہیں پہنچاتے تم اطمینان رکھو ان میں سے کوئی تمہارے میاں سے رابطہ کرے گا اور منہ مانگی رقم مانگے گا اگر اسے رقم ادا کی جائے گی تو وہ تمہارے بچے کو صحیح سلامت واپس کر دیں گے۔“

ایک عورت نے کہا۔ ”امیر کبیر لوگوں کے بچوں کو اغوا کیا جاتا ہے اور ان سے لاکھوں

روپے وصول کیے جاتے ہیں۔ فاخرہ کے گھر میں کیا رکھا ہے۔ مشتاق بھائی کی بندھی بندھائی تنخواہ ہے۔ میں تو کہتی ہوں اغوا کرنے والوں نے رقم کے لالچ میں ایسا نہیں کیا ہے۔“

ایک عورت نے کہا۔ ”اگر انہوں نے لالچ میں ایسا نہیں کیا ہے تو بچے کو لے جا کر کیا کریں گے؟“

”میں تو کہتی ہوں، بچے کو دشمنی سے اغوا کیا گیا ہے، فاخرہ تم سوچو تمہارا یا مشتاق بھائی کا کوئی ایسا دشمن ہے جو ایسی حرکتیں کر سکتا ہے۔“

وہ انکار میں سر ہلا کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔ اس لمحے میں اسے کسی دشمن کا خیال نہیں آیا پھر دوسرے ہی لمحے میں وہ ایک دم سے چونک گئی۔ سر اٹھا کر آس پاس بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھنے لگی پھر بولی۔ ”میری ساس کو مجھ سے خدا واسطے کا بیر ہے اس نے کبھی مجھے بہو تسلیم نہیں کیا اپنے گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہیں دی۔“

ایک عورت نے کہا۔ ”یہ تو ہمیں معلوم ہے تم پہلے بھی اپنی ساس کا ذکر کر چکی ہو۔“

دوسری عورت نے کہا۔ ”تم نے بھی ساس سے بدلہ لیا ہے۔ اسے کبھی اپنے بیٹے کی صورت نہیں دکھائی کبھی اس کی گود میں جانے نہیں دیا۔“

وہ ان سب کی باتیں سن رہی تھی۔ اس کے اندر آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اس کی ساس نے ہی اس کے فاخر کو اغوا کرایا ہے۔ وہ ضرور اسے اپنے گھر لے گئی ہے۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ مشتاق اسے تلاش کرنے کے بعد ناکام ہو کر تھکا ہارا واپس آ رہا تھا وہ مکان سے باہر آ کر بولی۔ ”ہمارے بیٹے کو تمہاری ماں لے گئی ہے میں یقین سے کہتی ہوں۔ ہمارا فاخر وہاں ضرور ہو گا تم ابھی میرے ساتھ وہاں چلو۔“

اس نے پریشان ہو کر فاخرہ کو اور وہاں کھڑی ہوئی عورتوں کو دیکھا پھر کہا۔ ”تم خواہ مخواہ میری ماں پر الزام لگا رہی ہو وہ بھلا ہمارے بیٹے کو ہم سے پوچھے بغیر اپنے گھر کیوں لے جائیں گی؟“

وہ چیخ کر بولی۔ ”یہاں بحث نہ کرو۔ میں ابھی تمہاری ماں کے گھر جاؤں گی میرا بیٹا وہیں ہے۔“

وہ گھر کا دروازہ باہر سے بند کرنے لگی۔ مشتاق نے کہا۔ ”ذرا رک جاؤ تم یہاں بیٹھو میں ابھی وہاں جاتا ہوں فاخر وہاں ہو گا تو اسے فوراً لے کر آؤں گا۔“

''صرف تم نہیں جاؤ گے میں بھی جاؤں گی۔ میں اسے کلیجے سے لگا کر لاؤں گی۔''

''فاخرہ! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ ہم وہاں جائیں گے اور اگر فاخر کہیں سے بھٹکتا ہوا یہاں آئے گا تو ہمیں یہاں نہ پا کر رونے لگے گا۔''

وہ ماں کے جذبات سے کھیل کر اسے وہاں روکنا چاہتا تھا۔ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے والدین کے دروازے پر ساس بہو کا جھگڑا شروع ہو جائے لیکن فاخرہ نے ایک بوڑھی خاتون سے کہا۔''خالہ! میں اپنے بیٹے کو لینے جا رہی ہوں میرے آنے تک آپ یہاں میرے گھر میں رہیں اور اس دروازے کو کھلا رکھیں۔''

محلے کی کئی عورتوں نے کہا۔''گھر کی فکر نہ کرو ہم نگرانی کریں گے۔ تم فوراً اپنے میاں کے ساتھ جاؤ اللہ نے چاہا تو بیٹا ضرور ملے گا۔''

مشتاق نے بے بسی سے فاخرہ کو اور محلے کی عورتوں کو دیکھا پھر سر جھکا کر اس کے ساتھ وہاں سے جانے لگا۔

☆======☆======☆

گلزار احمد فاخر کو گود میں اٹھا کر گھر کے اندر آیا تو بی بانو پوتے کو دیکھتے ہی خوش ہو گئی دوڑ کر اس کے پاس آئی۔ وہ آنکھیں بند کئے جیسے گہری نیند سو رہا تھا۔ وہ اس سے لپٹ کر اس کے چہرے کو چومنے لگی۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی پھر بولی۔''یہ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہا ہے؟''

''آپا! آپ ایک طرف ہٹ جائیں۔ اسے بستر پر ڈالنے دیں۔ ابھی اسے ہوش آ جائے گا۔''

وہ ایک طرف ہٹ گئی پریشان ہو کر بولی۔''یہ بے ہوش کیسے ہو گیا ہے؟''

''میں نے بہت کم مقدار میں دوا استعمال کی ہے اسے جلدی ہوش آ جائے گا۔ اگر اسے بے ہوش نہ کرتا تو یہ کبھی اپنی مرضی سے یہاں اپنی دادی کے پاس نہ آتا۔''

اسے فل اسپیڈ پنکھے کے نیچے بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ بی بانو نے بے چینی سے کہا۔''گلزار! اسے کسی طرح جلدی ہوش میں لاؤ۔''

''تم ذرا صبر کرو آرام سے بیٹھو۔ دوا کا اثر زائل ہو رہا ہے یہ ابھی ہوش میں آ جائے گا۔''

وہ پوتے کے پیروں کے پاس بیٹھ گئی بے چینی سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کے پاؤں کے تلوؤں کو سہلانے لگی تھوڑی دیر بعد ہی وہ ذرا کسمسانے لگا۔ گلزار نے اپنی بیوی سے کہا۔

''فریج سے ٹھنڈا جوس نکال کر لے آؤ۔''

فاخر نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر دیکھا۔ پہلے اسے چھت سے لٹکا ہوا گردش کرتا ہوا پنکھا دکھائی دیا پھر اس نے نظریں اِدھر اُدھر گھمائیں تو اسے کچھ اجنبی صورتیں دکھائی دیں۔ اس کے پائینتی بیٹھی ہوئی ایک عمر رسیدہ خاتون خوش ہو کر اسے دیکھ رہی تھی پھر اس کے بالکل قریب ہو کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔''بیٹے تم اچھے تو ہو پتا نہیں کیسی بے ہوشی تھی کہ چہرہ بالکل سوکھ گیا ہے، میرا بچہ برسوں کا بیمار دکھائی دے رہا ہے۔''

پھر وہ بھاوج سے بولی۔''مجھے جوس کا گلاس دو یہ کمزوری محسوس کر رہا ہوگا۔ آؤ بیٹے! میرے پاس بیٹھو میں تمہیں ٹھنڈا میٹھا جوس پلاتی ہوں ابھی تمہاری طبیعت بحال ہو جائے گی۔''

وہ اسے اٹھانا چاہتی تھی وہ خود ہی آہستہ آہستہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ پھر سب کو پریشان ہو کر دیکھتے ہوئے بولا۔''میں کہاں ہوں آپ لوگ کون ہیں؟''

گلزار نے کہا۔''تم آئس کریم خریدنے اسکول کی باؤنڈری سے باہر آئے تھے وہاں بے ہوش ہو کر گر پڑے تھے۔ میں تمہیں اٹھا کر لایا ہوں۔''

''میں اسکول جاؤں گا میرا بیگ کہاں ہے؟''

''تمہارا بیگ یہاں رکھا ہوا ہے۔ یہاں آرام سے رہو تم بہت کمزور ہو گئے ہو۔''

بی بانو نے جوس کا گلاس اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔''اسے پی لو۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔''میں نہیں پیوں گا۔ اپنی امی کے پاس جاؤں گا۔''

''بیٹے! میں تمہاری دادی ہوں تمہاری اپنی سگی دادی ہوں۔ تمہارے ابو کی امی ہوں۔ یہ لو پہلے جوس پیو، پھر باتیں کرو۔''

''میں بات بھی نہیں کروں گا۔ جوس بھی نہیں پیوں گا۔ اپنی امی کے پاس جاؤں گا۔''

وہ بیڈ سے اُترنا چاہتا تھا۔ گلزار نے اسے پکڑ کر کہا۔''پہلے جوس پیو...... پھر تمہیں تمہاری ماں کے پاس پہنچایا جائے گا۔''

اس نے گلزار کو دیکھا پھر جوس کے گلاس کو دیکھ کر اسے ہاتھوں میں لے کر پینے لگا۔ بی بانو نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔''تم اتنے دنوں تک اپنی ماں کے پاس رہے اب کچھ عرصے تک میرے پاس رہو گے اپنی دادی جان کے پاس۔''

یہ بات سنتے ہی اسے پیتے پیتے ٹھسکا لگا۔ اس نے گلاس کو دور پھینک دیا۔ ٹھسکا لگنے کے باعث کھانسنے لگا۔ بی بانو اسے تھپکنے لگی اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہنے لگی۔ ''بیٹے! ایسی ضد نہیں کرتے دیکھو تم نے جوس بھی نہیں پیا۔ گلاس بھی توڑ دیا یہ تو اچھی بات نہیں ہے۔ اچھے بچے اپنی دادی جان کی بات مانتے ہیں۔''

وہ ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ کو دور کرتے ہوئے بولا۔ ''تم میری دادی جان نہیں ہو میں تمہارے پاس نہیں رہوں گا۔ اپنی امی کے پاس جاؤں گا۔''

وہ پھر بیڈ سے اُترنا چاہتا تھا گلزار نے اس کے ایک شانے کو مضبوطی سے جکڑ کر ذرا غصے سے کہا۔ ''اے چپ کر کے بیٹھ جا۔ ہم تیرے دشمن نہیں ہیں۔ یہ تیرے باپ کی امی جان ہیں، تیری دادی جان ہیں۔ اب تجھے انہی کے پاس رہنا ہوگا۔''

وہ چپ ہو کر گلزار کا منہ تکنے لگا۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ وہ اسکول کے احاطے سے باہر نکل کر آئس کریم خریدنے جا رہا تھا۔ ایسے ہی وقت گلزار سے سامنا ہوا تھا پھر اس نے کچھ کہے سنے بغیر اس کے منہ پر ایک رومال رکھا تھا اس کے بعد اسے ہوش نہیں رہا تھا اور اب ہوش میں آ کر گلزار کو ان عورتوں کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔

وہ پانچ برس کا تھا۔ فاخرہ اسے اسکول لے جاتے وقت سمجھایا کرتی تھی کہ اسکول کے احاطے کے اندر رہا کرو کسی اجنبی سے نہ باتیں کرو اور نہ ہی اس کے قریب جاؤ اسکولوں کے آس پاس غنڈے بدمعاش پھرتے رہتے ہیں۔ معصوم بچوں کو اغوا کر کے لے جاتے ہیں پھر ان کا گلا کاٹ کر پھینک دیتے ہیں۔

فاخر کو ماں کی باتیں یاد آ رہی تھی اور یہ بات سمجھ میں آ رہی تھی کہ اسے اغوا کرنے والا دشمن ہے اور اس دشمن کے گھر میں جو عورت خود کو اس کی دادی جان کہہ رہی ہے وہ دادی نہیں ہے۔ جھوٹی اور فریبی ہے۔

بی بانو نے اسے چپ دیکھ کر دونوں بانہوں میں سمیٹ لیا پھر کہا۔ ''بیٹے میرے پاس آؤ میرے کلیجے سے لگے رہو۔ میں تمہیں اتنا پیار دوں گی کہ تم اپنی امی کو بھول جاؤ گے۔''

وہ اس کی بانہوں میں کسمسانے اور تلملانے لگا۔ ''تم میری دادی نہیں ہو میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ میری امی نے کہا تھا کہ بچوں کو اغوا کرنے والے ان کا گلا کاٹ کر پھینک دیتے ہیں میں یہاں نہیں رہوں گا۔ یہ آدمی میرا گلا کاٹ دے گا۔''

''نہیں بیٹے! تمہاری امی جھوٹ بول رہی تھی۔ میں تمہاری دادی ہوں یہ تمہارے

ماموں جان ہیں تمہیں بہت پیار کریں گے۔''

گلزار نے اپنی آپا کو آنکھ کا اشارہ کیا پھر کہا۔ ''یہ بچہ تمہاری بات مان لے گا تمہیں دادی جان اور مجھے ماموں جان مان لے گا۔ ہم سے پیار کرے گا ہمارے ساتھ رہے گا تو میں اس کا گلا نہیں کاٹوں گا اور اگر یہ شور مچائے گا ہمارے ساتھ نہیں رہنا چاہے گا تو میں......''

اس نے اپنی بات ادھوری چھوڑی پھر لباس کے اندر سے ایک چاقو نکال کر ایک جھٹکے سے اسے کھولا تو فاخر ایک دم سے سہم کر اپنی دادی جان سے لپٹ گیا۔ خوف سے کانپنے لگا۔

بی بانو نے کہا۔ ''گلزار! اسے جیب میں رکھ لو میرے بچے کو دہشت زدہ نہ کرو۔ یہ میرا پوتا ہے۔ میری جان ہے کوئی اس کا گلا نہیں کاٹے گا میں ہمیشہ اسے گلے لگا کر پیار کرتی رہوں گی۔ کیوں بیٹے میں تمہاری دادی ہوں نا......؟''

اس نے سہم کر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ بی بانو کے سوال پر سر ہلا کر بولا۔ ''ہاں تم میری دادی ہو۔ میں شور نہیں مچاؤں گا۔ میں تمہارے پاس رہوں گا۔ مجھے چاقو سے بہت ڈر لگتا ہے۔''

''بیٹے! تمہیں کوئی ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔ وہ دیکھو تمہارے ماموں جان نے چاقو پھینک دیا ہے۔ تم میرے ساتھ رہو گے نا......؟''

وہ ہاں کے انداز میں تیزی سے سر ہلانے لگا۔ بی بانو نے ہاتھ اٹھا کر اپنے بھائی سے کہا۔ ''گلزار اب اسے دہشت زدہ نہ کرو یہ میرا پوتا ہے۔ بہت اچھا بچہ ہے۔ اب میرے پاس رہا کرے گا۔''

گلزار نے کہا۔ ''اسے کہو یہ اپنی ماں کے پاس جانے کی ضد نہیں کرے گا۔''

وہ اپنے پوتے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ ''بیٹے! اپنے ماموں جان سے کہہ دو کہ تم اپنی ماں کے پاس واپس نہیں جاؤ گے۔''

اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ گلزار کی طرف دیکھتے ہوئے ڈر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میں نہیں جاؤں گا میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ تمہارے پاس رہوں گا۔''

بی بانو نے کہا۔ ''بس میرے پوتے نے اپنا فیصلہ سنا دیا ہے۔ تم سب یہاں سے جاؤ۔ اس کے لیے کچھ کھانے کو لاؤ میں اپنے ہاتھوں سے اپنے پوتے کو کھلاؤں گی۔''

اس کا بھائی اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ اس کمرے سے چلا گیا۔ بی بانو اپنے پوتے کو تسلیاں دینے لگی۔ ''بیٹے تمہیں ڈرنا نہیں چاہیے میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہیں کوئی نقصان

نہیں پہنچائے گا۔ آنکھیں کھولو مجھ سے باتیں کرو۔"

اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا پھر کسی کو نہ پا کر اطمینان کی سانس لی۔ بی بانو سے الگ ہو کر بیٹھ گیا۔ وہ چاقو سے گلا کاٹنے والا دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن دل کو دھڑکا لگا ہوا تھا کہ وہ کسی وقت بھی آ سکتا ہے اور اس کا گلا کاٹ سکتا ہے۔

اس کے ننھے سے دماغ نے یہ سمجھایا تھا کہ ان کی بات مانتا رہے گا اور اس عمر رسیدہ خاتون کو اپنی دادی جان کہتا رہے گا تو اسے زندگی ملتی رہے گی۔

وہ کچھ ناسمجھ تھا اور کچھ کچھ سمجھتا بھی تھا۔ کچھ بزدل تھا کچھ دلیر بھی تھا۔ وہ دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ ان کی باتیں مانتا رہے گا پھر موقع دیکھ کر وہاں سے بھاگ جائے گا۔

بی بانو اسے خوب پیار دے رہی تھی۔ ہر ممکن طریقے سے اس کا دل جیت لینا چاہتی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے اسے روٹیاں کھلائیں۔ وہ کھانے کے بعد غنودگی محسوس کرنے لگا۔ تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ بی بانو اس کے پاس بیٹھی رہی۔ اس کا سر سہلاتی رہی۔ اسے تھپکتی رہی۔ دھیرے دھیرے لوریاں سناتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد ہی وہ گہری نیند سو گیا۔

اس نے دوسرے کمرے میں آ کر گلزار سے کہا۔ "وہ سو رہا ہے اس کمرے میں کوئی نہ جائے۔ کوئی آواز نہ کرے۔ اسے چپ چاپ سونے دو میں گھر جا رہی ہوں۔ وہاں جانا بھی ضروری ہے پتا نہیں اس کی ماں وہاں آ کر کیا آفت ڈھائے گی۔ مجھے اس سے بھی نمٹنا ہوگا۔"

وہ چادر لپیٹتی ہوئی بھائی کے ساتھ مکان سے باہر آئی پھر بولی۔ "اس کا خاص خیال رکھنا گھر سے باہر نکلنے نہ دینا۔ اسے کھڑکی سے بھی جھانکنے کی اجازت نہ دینا میں اس کے جاگنے سے پہلے ہی واپس آنے کی کوشش کروں گی۔"

"آپا! تم فکر نہ کرو ہم تو بڑے بڑے سیاسی مخالفین کو قیدی بنا کر رکھتے ہیں انہیں باہر کی ہوا لگنے نہیں دیتے۔ یہ بچہ کیا چیز ہے۔ ویسے ہے بہت تیز یہ میرے بھانجے مشتاق پر نہیں گیا ہے۔"

بی بانو نے کہا۔ "میرا بیٹا تو اللہ میاں کی گائے ہے۔ وہی چڑیل اسے اُلو بناتی رہتی ہے وہ حرافہ بڑی تیز طرار ہے۔ تم ٹھیک کہتے ہو یہ اپنی ماں پر گیا ہے مگر میں اسے اپنے سانچے میں ڈھال لوں گی۔"

اس نے یہ طے کیا تھا کہ جس طرح فاخرہ نے اس کے بیٹے کو اپنا اسیر بنا لیا ہے اسی

طرح وہ پہلے اپنے پوتے کو پیار و محبت سے اپنی طرف مائل کرے گی۔ اگر وہ مائل نہ ہوا تو پھر کسی بہت بڑے عامل سے رجوع کرے گی۔ وہ وہاں سے ایک بس میں بیٹھ کر اپنے محلے کے بس اسٹاپ پر پہنچی۔ گھر کی طرف جاتے وقت دور ہی سے دیکھا تو دروازے کے سامنے لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ ماتھا ٹھنکا کہ وہ چڑیل بہو ہنگامہ برپا کر رہی ہوگی۔

جب وہ قریب پہنچی تو یہی بات تھی۔ ایک عورت نے دور ہی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔ "بی بانو آ رہی ہے۔ ابھی معلوم ہو جائے گا۔ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟"

اس بھیڑ میں فاخرہ مشتاق کے ساتھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہاں بی بانو کا شوہر انصار احمد بھی تھا۔ محلے کی عورتیں اپنے دروازوں پر کھڑی تھیں۔ کچھ کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں۔

انصار احمد نے آگے بڑھ کر پوچھا۔ "بی بانو! یہ دیکھو اپنے لاڈلے بیٹے کو بیوی کے ساتھ آ کر ہم پر جھوٹا الزام لگا رہا ہے۔ کہتا ہے ہم نے اس کے بیٹے فاخر کو اغوا کرایا ہے اور اپنے گھر میں چھپا کر رکھا ہے۔"

بی بانو نے بیٹے کو دیکھ کر ناگواری سے کہا۔ "اس کا خون تو سفید ہو گیا ہے۔ پیدا کرنے والے ماں باپ کو چھوڑ کر اس عورت کے پیچھے گدھے کی طرح ڈھینچوں ڈھینچوں کرتا رہتا ہے۔"

پھر اس نے فاخرہ کو دیکھ کر ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔ "سانچ کو آنچ کیا؟ انہیں گھر کے اندر دیکھنے دو۔ ان کا جھوٹا الزام سارے محلے والوں کے سامنے آ جائے گا۔"

انصار احمد نے کہا۔ "ہم نے اس عورت کا داخلہ اپنے گھر میں بند کیا ہوا ہے۔ اس لیے میں نے اسے گھر میں گھسنے نہیں دیا لیکن محلے کی عورتوں نے ہمارے گھر میں آ کر ایک ایک کونا دیکھ لیا ہے۔ اس کا بیٹا یہاں نہیں ہے پھر بھی یہ خواہ مخواہ الزام دیئے جا رہی ہے۔ کہتی ہے تھانے میں جا کر رپورٹ درج کرائے گی۔"

فاخرہ نے ایک دم سے تڑخ کر کہا۔ "ہاں......! ابھی جاؤں گی اور رپورٹ درج کراؤں گی۔ اس عورت نے میرے بیٹے کو اغوا کرایا ہے اور اسے کہیں دوسری جگہ چھپا کر یہاں آئی ہے۔ اس سے پوچھا جائے کہ یہ ابھی کہاں سے آ رہی ہے؟"

بی بانو نے کہا۔ "صرف تُو یہ سوال کرتی تو میں کبھی جواب نہ دیتی لیکن مجھ پر بہت بڑا الزام آ رہا ہے۔ اس لیے محلے والوں کو مطمئن کرنے کے لیے بول رہی ہوں۔ میں صبح سے اپنی بہن کے گھر گئی تھی۔ میرے بہنوئی نے تین ماہ پہلے پانچ ہزار روپے قرض لیے تھے۔ اب

تک وہ ادا نہیں کیے آج رقم دینے کا وعدہ کیا تھا مگر ابھی تک گھر میں بٹھائے رکھا اور مجھے ٹرخاتا رہا۔"

وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر بولی۔ "وہاں سے خالی ہاتھ آئی ہوں۔ اس نے پھر قسم کھا کر وعدہ کیا ہے کہ آج رات ہماری رقم پہنچانے خود ہی یہاں آئے گا۔"

وہ محلے کی عورتوں اور مردوں کو باری باری دیکھتے ہوئے بولی۔ "آپ لوگوں نے ہمارے گھر کی تلاشی لی بچہ نہیں ملا۔ میں جہاں سے آرہی ہوں وہاں ابھی آپ لوگوں کو لے جاسکتی ہوں۔ پتا نہیں یہ کم بخت اپنے بچے کو کہاں پھینک آئی ہے؟ یہاں آکر ہم پر الزام لگا رہی ہے۔ جاؤ، اپنے تھانے والے کسی باپ کے پاس جا کر رپورٹ درج کراؤ۔ نہ ہم نے کوئی جرم کیا ہے نہ ہم کسی سے ڈرتے ہیں۔"

پھر وہ مشتاق کی طرف ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "اور تُو بے غیرت! ہمارا بیٹا بنتا ہے، ہم پر جھوٹا الزام لگانے یہاں آیا ہے اور اب اپنی جورو کے ساتھ تھانے جا کر ہمارے خلاف رپورٹ لکھائے گا۔ وہاں جا کر ہمیں بدنام کرنے سے تو بہتر ہے یہاں تمام محلے والوں کے سامنے اپنی ماں کے منہ پر اور اپنے باپ کے منہ پر جوتے مار اور اپنی اس چہیتی کا کلیجہ ٹھنڈا کرلے۔"

فاخر اس گھر سے برآمد نہیں ہوا تھا۔ وہ تمام محلے والوں کے سامنے شرمندگی محسوس کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "فاخرہ! میں نے تمہیں پہلے ہی منع کیا تھا کہ گھر میں رہو میں یہاں آکر اپنے والدین سے اپنے رشتے داروں سے باتیں کروں گا۔ یہاں بیٹا ہوگا تو فوراً ہی تمہارے پاس لے آؤں گا لیکن تم نے خواہ مخواہ یہاں آکر اتنا بڑا ہنگامہ برپا کیا ہے۔"

فاخرہ نے کہا۔ "تم اپنی ماں کو بہت سیدھی سادی سمجھ رہے ہو لیکن میں تو تھانے ضرور جاؤں گی۔ پولیس والے اس عورت سے اگلوائیں گے کہ میرا بچہ اس نے کہاں چھپا کر رکھا ہے؟"

مشتاق نے ڈانٹ کر کہا۔ "بکواس مت کرو۔ میں نے تمہاری خاطر ماں باپ کو چھوڑا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں ان کی بے عزتی برداشت کروں گا۔ تم نے اور اسکول کی پرنسپل نے اغوا کی رپورٹ درج کرائی ہے۔ وہاں کا پولیس انسپکٹر ہمارے بیٹے کو تلاش کر رہا ہے اس کے بعد اب میں تمہیں یہاں کے تھانے میں نہیں جانے دوں گا اپنے گھر والوں کو تماشا نہیں بننے دوں گا، گھر واپس چلو۔"

محلے کی کتنی ہی عورتوں اور مردوں نے اسے سمجھایا کہ خواہ مخواہ اپنی ساس کے خلاف محاذ

آرائی نہ کرے پہلے بیٹے کو تلاش کرے۔ جب پہلے ہی پولیس والے اس بچے کو تلاش کر رہے ہیں تو اسے اب تھانے جا کر خواہ مخواہ ساس بہو کی دشمنی والا تماشا نہیں کرنا چاہیے۔

وہ مشتاق کے ساتھ روتے ہوئے بڑبڑاتے ہوئے جانے لگی۔ "تم اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر میرے ساتھ رہتے ہو وہ اس بات کا انتقام لے رہی ہے۔ میں نے اپنی بیٹے کی صورت بھی اسے دیکھنے نہیں دی وہ اس بات کا بھی انتقام لے رہی ہے۔ ذرا عقل سے سوچو اور مجھ سے کون دشمنی کر سکتا ہے۔ کون میرے بیٹے کو کہیں لے جا سکتا ہے؟"

"تم خواہ مخواہ میری ماں پر شبہ کر رہی ہو۔ اغوا کرنے والے مجرموں نے فاخر کو کوئی رئیس زادہ سمجھا ہوگا وہاں امیر کبیر گھرانے کے بچے پڑھنے آتے ہیں۔ وہ مجرم رقم وصول کرنے کے لیے ہم سے رابطہ ضرور کریں گے۔ ہمیں انتظار کرنا چاہیے۔"

دوپہر سے شام ہوگئی۔ شام سے رات ہونے لگی۔ روتے روتے فاخرہ کے آنسو ختم ہو گئے تھے۔ آنکھیں خشک ہوگئی تھیں۔ سینے سے صرف آہیں نکل رہی تھیں۔

"ہائے میرے بچے! میری جان! تم کہاں ہو؟ ایک بار کہیں سے آواز دو پھر دیکھو میں ساری رکاوٹیں توڑتے ہوئے موت سے لڑتے ہوئے تمہارے پاس پہنچ جاؤں گی۔"

بیٹا دادی جان کی قید میں سہا ہوا تھا۔ قصائی جیسے ماموں جان کے پاس چاقو دیکھ کر یہ بات دل میں بیٹھ گئی تھی کہ اسے ماں کے پاس جانے کی ضد نہیں کرنی چاہیے جبکہ دل ماں کے لیے تڑپ رہا تھا۔

بی بانو اپنے شوہر انصار احمد کے ساتھ وہاں آگئی تھی۔ وہ پوتے کو دیکھ کر اس کا ہاتھ تھام کر بولا۔ "اپنے دادا جان سے مصافحہ کرو۔ بیٹے! تم ہمارے پوتے ہو یہ تمہاری دادی جان ہیں اور میں تمہارا دادا جان ہوں۔ ہم سے تمہارا خون کا رشتہ ہے۔ تمہاری ماں اچھی عورت نہیں ہے۔ اس نے خون کے رشتوں کو جدا کر دیا تھا۔ آئندہ اسے نہ تو یاد کیا کرو اور نہ ہی اسے ماں کہا کرو۔ تم ہمارے ہو ہمیشہ ہمارے ساتھ رہا کرو گے۔"

وہ مجبوراً اپنی ماں کے خلاف باتیں سن رہا تھا۔ اگر اس وقت تنہا نہ ہوتا اور گلزار احمد نے اس کا گلا کاٹ دینے کی دھمکی نہ دی ہوتی تو وہ ان کے پاس ایک لمحے کے لیے بھی نہ رہتا۔ وہ ماں کے خلاف ایک بات بولتے تو وہ دس باتیں سناتا اور وہاں سے بھاگ جاتا۔

اس وقت وہ بہت مجبور تھا دل ہی دل میں ان سے نفرت کر رہا تھا۔ ادھر وہ خود کو دادی اور دادا کہنے والے اتنا پیار جتا رہے تھے جیسے اس پر قربان ہو رہے ہوں۔

بے شک ان کے پیار میں تصنع نہیں تھا۔ وہ دل و جان سے اپنے پوتے کو چاہتے تھے اور ہمیشہ اسے اپنے ہی پاس رکھنا چاہتے تھے لیکن اس کے لیے انہوں نے نہایت ہی غلط راستہ اختیار کیا تھا۔

گلزار نے شام سات بجے کسی کام سے جاتے ہوئے اپنی بیوی سے کہا۔ ''فاخر کا خیال رکھنا۔ باہر کھلنے والی کھڑکیوں اور دروازے کو اچھی طرح بند رکھنا۔ میں دو چار گھنٹوں میں واپس آجاؤں گا۔''

وہ بیوی اور اپنی آپا بی بانو کو تاکید کر کے چلا گیا۔ رات کے آٹھ بجے دادی اور دادا نے اپنے ساتھ اسے بٹھا کر کھانا کھلایا۔ انصار احمد نے کہا۔ ''آج رات میرا پوتا میرے ساتھ سوئے گا۔''

بی بانو نے کہا۔ ''نہیں یہ آج رات میرے پاس سوئے گا۔ میں اپنے برسوں کے ارمان پورے کروں گی۔ آپ کھانے کے بعد گھر جائیں اور وہاں کی خبر رکھیں۔ وہ کم بخت پھر کوئی ہنگامہ برپا کرنے کے لیے آسکتی ہے۔''

وہ اس کے لیے مٹھائی لے کر آئے تھے۔ کھانے کے بعد انہوں نے اسے مٹھائی کھلائی وہ چپ چاپ کھاتا پیتا رہا ان کی باتیں خاموشی سے سنتا رہا۔ کبھی کبھی ان کی باتوں کا جواب بھی دیتا رہا۔ اس نے سونے سے پہلے کہا۔ ''میں شوشو کرنے جاؤں گا۔''

بی بانو نے ٹائلٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''آؤ میں یہاں کھڑی رہوں گی۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولا۔ ''نہیں مجھے شرم آتی ہے۔''

وہ ہنستے ہوئے بولی۔ ''شریر کہیں کا! اتنا سا تو ہے اور اپنی دادی جان سے شرماتا ہے۔ اچھی بات ہے یہ دروازہ بند کر لو مگر پہلے دوسری طرف کا دروازہ بند کرو۔''

اس نے ٹائلٹ کے دوسرے دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ دو کمروں کے درمیان مشترکہ ٹائلٹ تھا۔ جو بھی وہاں ضرورت سے جاتا تھا۔ دونوں طرف کے دروازے اندر سے بند کر لیتا تھا۔

فاخر نے اپنی طرف کا دروازہ بند کیا تو بی بانو کمرے میں رہ گئی۔ اس کی نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ وہ وہاں سے چلتا ہوا دوسرے دروازے کی طرف آیا اسے بند کرنے سے پہلے اس نے دوسرے کمرے کی طرف دیکھا وہ بھی کسی کا بیڈروم تھا لیکن خالی پڑا ہوا تھا۔ اس کے دروازے کے دونوں پٹ باہر کی طرف کھلے ہوئے تھے۔

اس نے چونک کر اس دروازے کو دیکھا۔ اسے ایک دم سے یوں لگا جیسے اس کی امی کی بانہیں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ اسے بلا رہی ہیں۔ ''میرے بچے! فوراً دوڑتے ہوئے چلے آؤ کسی کی پرواہ نہ کرو۔''

وہ دوپہر سے اب تک دیکھتا آیا تھا کہ اس کے کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے بند رکھے جاتے تھے اس کی سختی سے نگرانی کی جا رہی تھی۔ کہیں اِدھر اُدھر جانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی۔ اس وقت اس کھلے ہوئے دروازے نے سمجھایا کہ موقع غنیمت ہے وہ وہاں سے فرار ہو سکتا ہے۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے گزرتا ہوا مین دروازے کے پاس آیا۔ باہر نیم تاریکی تھی۔ اس نے باہر آ کر دائیں بائیں سر گھما کر دیکھا پھر وہاں سے دوڑتا چلا گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کس علاقے میں ہے اور اپنے گھر تک پہنچنے کے لیے کس طرف جانا ہے؟ اس کے دماغ میں ایک ہی بات سمائی ہوئی تھی کہ اسے اس گلا کاٹنے والے سے دور بھاگ جانا چاہیے۔

اس کے ننھے سے دماغ میں یہ بات تھی کہ کراچی شہر بہت چھوٹا ہے۔ وہ ایک جگہ سے دوڑتا ہوا نکلے گا تو دوسری طرف سے ماں اسے ڈھونڈتی ہوئی پہنچ جائے گی۔ اسے اپنی آغوش میں چھپا لے گی پھر کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ وہ نیم تاریکی اور نیم روشنی میں بھاگتا چلا جا رہا تھا۔

بی بانو کی بھاوج کچن سے نکل کر اس کمرے میں آئی جس کا دروازہ باہر کی طرف کھلا ہوا تھا۔ وہ کھلے ہوئے دروازے کو دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اسے یاد آیا کہ اس نے کچرا پھینکنے کے لیے دروازے کو کھولا تھا پھر چولہے پر سے سالن جلنے کی بو محسوس ہوئی وہ تیزی سے چلتی ہوئی کچن میں آگئی تھی۔ دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔

اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازے کو اندر سے بند کر لیا پھر دوسرے اندرونی دروازے کو کھول کر ڈرائنگ روم میں آئی۔ وہاں سے گزرتی ہوئی اس بیڈروم میں پہنچی جہاں فاخر کو قیدی بنا کر رکھا گیا تھا۔ اس کی دادی اور دادا وہاں اسی کی نگرانی کر رہے تھے۔ اس وقت دادی ٹائلٹ کے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ بھاوج نے کمرے میں آ کر دیکھا پھر پوچھا۔ ''فاخر کہاں ہے؟''

بی بانو نے کہا۔ ''وہ ٹائلٹ میں ہے۔ ابھی آجائے گا۔''

انصار احمد نے کہا۔ ''یہ ہمارا پوتا کتنی دیر تک ٹائلٹ میں بیٹھتا ہے اسے آواز تو دو۔''

بی بانو نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے اسے آواز دی۔ ''بیٹے! اتنی دیر تک کیا کر رہے ہو؟ اب آ بھی جاؤ۔''

اندر خاموشی رہی۔ بی بانو نے مسکرا کر اپنی بھاوج سے کہا۔ ''بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔ بچپن سے میرے مشتاق کی بھی یہی عادت ہے ٹائلٹ میں جاتا ہے تو وہیں چپک کر رہ جاتا ہے۔''

بھاوج کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئی تھیں۔ اسے یاد آ رہا تھا کہ دوسری طرف کا جو کمرا ہے وہاں سے ٹائلٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور شاید اندر کوئی نہیں تھا۔ اس نے کہا۔ ''آپا......! اسے پھر آوازیں دیں۔ اسے جواب میں کچھ بولنا چاہیے۔''

بی بانو نے پھر دروازے پر دستک دیتے ہوئے اسے آواز دی۔ ایک بار پھر دوسری بار پھر تیسری آوازیں دیتے ہوئے وہ پریشان ہو گئی۔ اپنے میاں کو اور بھاوج کو دیکھتے ہوئے بولی۔ ''یہ جواب کیوں نہیں دے رہا ہے؟ خاموش کیوں ہے؟''

وہ دروازے کو دونوں ہاتھوں سے دھکا دیتے ہوئے پھر اسے پکارنے لگی۔ بھاوج نے کہا۔ ''ہمیں دوسرے کمرے میں جا کر دیکھنا چاہیے۔''

وہ تینوں تیزی سے چلتے ہوئے ڈرائنگ روم سے گزرتے ہوئے اس دوسرے کمرے میں پہنچے تو ادھر ٹائلٹ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ انہوں نے اندر آ کر دیکھا تو وہ ٹائلٹ ان کے پوتے کے وجود سے خالی تھا۔

بی بانو نے گھبرا کر تقریباً چیختے ہوئے پوچھا۔ ''یہ کہاں ہے؟ ابھی تو یہاں تھا یہاں سے کہاں جا سکتا ہے؟''

سب نے اس کمرے کے دوسرے دروازے کی طرف دیکھا جو باہر کی طرف کھلتا تھا لیکن وہ اندر سے بند تھا۔ اتنی دیر میں بھاوج کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس نے سوچا اگر بی بانو کو اور گلزار کو یہ معلوم ہو گا کہ اس کی غلطی سے ان کا پوتا فرار ہو گیا ہے تو سب ہی اس پر چڑھ دوڑیں گے۔ گلزار تو اسے گالیاں بھی دے گا اور اس کی پٹائی بھی کرے گا۔

اس کی دادی اور دادا پورے گھر میں دوڑتے پھر رہے تھے۔ اسے تلاش کر رہے تھے۔ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے۔ ''دروازے سب اندر سے بند ہیں وہ باہر کیسے چلا گیا؟''

وہ صحن میں آ گئے۔ بھاوج نے دیوار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا وہ بچہ آنگن کی دیوار پھلانگ کر گیا ہے؟''

بی بانو نے ناگواری سے کہا۔ ''کیسی باتیں کرتی ہو۔ وہ چھوٹا سا بچہ اس دیوار پر کیسے چڑھے گا؟''

بھاوج نے بات بنائی۔ ''دیکھئے آپا! اس دیوار کے ساتھ کتنا کاٹھ کباڑ رکھا ہوا ہے۔ وہ اس پر چڑھ کر دیوار پر پہنچا ہو گا۔ دوسری طرف یہ درخت ہے۔ اس کی شاخیں ہمارے آنگن میں آ رہی ہیں وہ اسی درخت سے اُتر کر گیا ہو گا۔''

وُہ تینوں مکان سے باہر آ گئے پھر تین سمتوں میں تیزی سے جانے لگے۔ اسے آوازیں دینے لگے۔ جو بھی انہیں دکھائی دیتا تھا اس سے پوچھتے تھے۔ کیا انہوں نے کسی پانچ برس کے بچے کو دیکھا ہے؟

کسی نے نہیں دیکھا تھا۔ وہ تینوں مختلف سمتوں میں دور دور تک اسے تلاش کرتے رہے۔ ہانپتے رہے۔ تھکتے رہے۔ وہ ننھا سا پوتا کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح گیا تھا اب واپس آنے والا نہیں تھا۔

آدھی رات گزر گئی۔ وہ اسے تلاش کرتے رہے لیکن اس کے سائے تک بھی نہ پہنچ سکے۔ دوسری طرف فاخرہ اپنے مکان کا دروازہ کھولے چوکھٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ محلے کی عورتیں بڑی دیر تک اسے دلاسے دیتی رہی تھیں۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا۔ ویسے ویسے وہ سب اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ مشتاق نے پوچھا۔ ''تم کب تک یہاں بیٹھی رہو گی؟ صبح سے نہ کچھ کھایا ہے نہ ایک گھونٹ پانی پیا ہے اور یہ جانتا ہوں کہ تمہیں نیند بھی نہیں آئے گی لیکن ذرا کمر تو سیدھی کر لو۔ صحن میں چارپائی بچھا کر آرام سے لیٹ جاؤ۔''

اس نے خشک آنکھوں سے مشتاق کو دیکھا اب اس کی آنکھوں سے آنسو نہیں بہہ رہے تھے لیکن دل رو رہا تھا۔ وہ بولی۔ ''میرا بچہ پتا نہیں کس حال میں ہے؟ کس مصیبت میں ہے؟ اور تم مجھے آرام سے لیٹنے کو کہہ رہے ہو۔ میں یہاں بیٹھی رہوں گی۔ جاؤ تم آرام کرو۔''

وہ اپنی بات ختم کرتے ہی ایک دم سے چونک گئی۔ اسے اپنے فاخر کی آواز سنائی دی۔ وہ چیختی ہوئی آواز میں۔ ''امی......امی'' پکار رہا تھا۔

وہ دونوں اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے ایک طرف دیکھا، نیم تاریک گلی میں فاخر دوڑتا ہوا آ رہا تھا۔ فاخرہ ایک دم سے تڑپ گئی۔ چیخیں مارتے ہوئے اسے آوازیں دیتے ہوئے اس کی طرف دوڑنے لگی۔ خوشی کے مارے توازن برقرار نہ رکھ سکی۔ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑی۔ فاخر دوڑتا ہوا آ کر ماں سے لپٹ گیا۔ وہ اسے دونوں بانہوں میں بھینچ کر سینے سے

لگا کر اِدھر اُدھر چومنے لگی۔ ''میرے بچے! تم کہاں چلے گئے تھے؟ میری جان تم؟ تم میرے پاس آ گئے ہونا۔ مجھے یقین کر لینے دو۔''

وہ دیوانہ وار اسے بازوؤں میں بھینچ رہی تھی اور بار بار چومتی جا رہی تھی۔ فاخرہ کے ساتھ ایک مولوی صاحب آئے تھے۔ وہ مشتاق سے کہہ رہے تھے۔ ''میں اجمیر نگری کی ایک مسجد کا پیش امام ہوں۔ آپ کا یہ بچہ پتا نہیں کہاں سے بھٹکتا ہوا آیا مجھ سے کہنے لگا کہ میں اسے اس کی ماں کے پاس پہنچا دوں۔ اس نے اس محلے کا نام بتایا تو میں اسے لے آیا۔ یہاں آتے ہی اس نے اپنی گلیوں کو پہچان لیا۔ آپ کا بچہ بہت سمجھ دار ہے۔''

مشتاق نے احسان مندی سے کہا۔ ''میں آپ کا کس زبان سے شکریہ ادا کروں آپ نے اتنا بڑا احسان کیا ہے کہ ہم اسے زندگی بھر نہیں بھلا پائیں گے۔ آپ فرمائیں میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟''

انہوں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''میں نے کسی لالچ سے یہ نیکی نہیں کی ہے۔ میں مسجد کا پیش امام ہوں اپنے پیچھے بے شمار عبادت گزار بندوں کو نمازیں پڑھاتا ہوں۔ انہیں راہِ مستقیم پر چلاتا ہوں۔ آپ کا بچہ بھی بھٹکا ہوا تھا میں اسے سیدھے راستے سے آپ کے گھر تک لے آیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو نیکیاں کرنے کی توفیق عطا فرمائے...... آمین!''

وہ ایک قدم آگے بڑھ کر ذرا قریب آئے پھر بولا۔ ''اگر تم چاہتے ہو کہ میری اچھائی کے بدلے کوئی اچھائی کرو تو میرا مشورہ ہے سجدہ شکر ادا کرو اور نمازیں پڑھا کرو۔''

یہ کہہ کر وہ کوئی جواب سنے بغیر وہاں سے جانے لگے مشتاق انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ فاخرہ بیٹے کو سینے سے لگائے کچے راستے کی مٹی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ ان لمحات میں ساری دنیا کو بھول گئی تھی۔ بس وہ تھی اور اس کا بیٹا تھا۔ مشتاق نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''یہاں سے اٹھو گھر چلو۔''

فاخرہ نے چونک کر آس پاس دیکھا پھر پوچھا۔ ''وہ فرشتہ کہاں ہے؟ میں اس کے قدموں سے لپٹ جاؤں گی۔ اپنی سونے کی چوڑیاں، گلے کی چین اور کانوں کی بالیاں اسے دوں گی۔''

''فرشتے نیکیاں کرتے ہیں۔ ان کا معاوضہ طلب نہیں کرتے۔ وہ ایک مسجد کے پیش امام تھے انہوں نے اپنا ایک فرض ادا کیا اور چپ چاپ چلے گئے۔ اب اٹھو یہاں سے۔''

ایسے وقت ایک پڑوسن نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو اس نے دوسری پڑوسن کو آواز دی۔ ''اے کلثوم باجی! معلوم ہوتا ہے فاخرہ کا بیٹا مل گیا ہے۔ وہ کسی بچے سے لپٹی ہوئی گلی میں بیٹھی ہے۔''

دوسری پڑوسن نے تیسری کو تیسری نے چوتھی کو یہ اطلاع دی پھر ایک ایک کر کے کتنے ہی گھروں کے دروازے کھلنے لگے۔ عورتوں اور مردوں کی بھیڑ لگنے لگی۔ فاخرہ اور مشتاق بیٹے کو لے کر اپنے صحن میں آ گئے تھے۔ کتنی ہی عورتیں وہاں پہنچ گئی تھیں اور ان کے مرد باہر کھڑے ہوئے مشتاق سے طرح طرح کے سوالات کر رہے تھے، بچے کی واپسی پر مبارک باد دے رہے تھے۔ ایک عورت نے کہا۔ ''فاخرہ! اپنے بیٹے سے یہ تو پوچھو کہ کہاں گیا تھا اور کہاں سے آ رہا ہے؟''

فاخر سے پوچھا گیا۔ اس نے کہا۔ ''میں نہیں جانتا وہ لوگ مجھے کس گھر میں لے گئے تھے؟ اس آدمی کی بڑی بڑی مونچھیں تھیں۔ اس کے پاس ایک چاقو تھا اس نے کہا کہ اگر میں شور مچاؤں گا اور اپنی امی کے پاس جانے کی ضد کروں گا تو وہ میرا گلا کاٹ دے گا۔''

یہ سنتے ہی فاخرہ نے پھر اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس بڑی بڑی مونچھوں والے کو گالیاں دینے لگی۔ ایک عورت نے کہا۔ ''فاخرہ چپ ہو جاؤ اسے بعد میں گالیاں دینا۔ پہلے اپنے بیٹے کی باتیں سن لو۔''

فاخر کہہ رہا تھا۔ ''ان لوگوں نے کھڑکیاں اور دروازے بند کر دیئے تھے۔ مجھے باہر نکلنے نہیں دیتے تھے۔ ایک عورت مجھ سے بہت پیار کر رہی تھی اور یہ کہتی تھی کہ میں آپ کو بھول جاؤں وہ کہہ رہی تھی کہ وہ میری دادی جان ہے اور میں اس کا پوتا ہوں اور اب اسی کے ساتھ رہوں گا۔''

یہ سنتے ہی فاخرہ تو کیا سبھی چونک گئے۔ ایک عورت نے فاخر سے پوچھا۔ ''کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔ وہ عورت تمہیں یونہی دادی جان کہہ رہی تھی یا سچ مچ وہ تمہاری دادی تھی؟''

''میں نہیں جانتا کہ میری سچ مچ کوئی دادی ہے یا نہیں لیکن وہ کہہ رہی تھی کہ اس سے میرا خون کا رشتہ ہے۔ اس کے بعد ایک اور بوڑھا آدمی آیا تھا وہ کہہ رہا تھا کہ میرا دادا ہے اور میرے ابو کا باپ ہے۔''

چند عورتوں نے باہر سے مشتاق کو اور محلے کے چند افراد کو اندر بلایا پھر انہیں فاخر کا بیان سنوایا۔ مشتاق اپنے بیٹے کی باتیں سن کر پریشان ہو گیا۔ فاخرہ نے تقریباً چیختے ہوئے کہا۔

''میں پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ تمہاری ماں کے کرتوت ہیں۔ وہ ذلیل عورت میرے بچے کو اغوا کرانے کے بعد اس کا گلا کاٹنے کی دھمکیاں دیتی رہی تھی۔''

مائیں جیسی بھی ہوں، اولاد ان کے خلاف کچھ سننا گوارا نہیں کرتی۔ مشتاق بھی اپنی ماں کے خلاف سن رہا تھا۔ اسے صدمہ پہنچ رہا تھا پھر بھی اس نے کہا۔''فاخرہ بکواس نہ کرو۔ تمہیں میری امی کے خلاف بولنے کی عادت ہے۔ ٹھیک ہے۔ ضرور بولو لیکن ان کی توہین تو نہ کرو۔''

ایک بوڑھی عورت نے کہا۔''تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ تمہارا بیٹا جھوٹ کہہ رہا ہے اور تمہاری ماں نے اسے اغوا نہیں کرایا ہے؟''

مشتاق نے کہا۔''خالہ جان! پتا نہیں وہ کون عورت تھی خود کو دادی جان کہہ رہی تھی۔ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہوا کہ وہ میری امی تھیں اور انہوں نے اپنے پوتے کو اغوا کرایا تھا۔''

فاخرہ نے کہا۔''سانچ کو آنچ کیا ہے۔ اب ہم فاخر کو لے کر وہاں چلتے ہیں۔ میرا بیٹا تمہاری ماں کی صورت دیکھتے ہی اسے پہچان لے گا اور جب یہ اسے شناخت کر لے گا تو پھر میں اسے نہیں چھوڑوں گی۔ اسے حوالات میں پہنچاؤں گی۔''

مشتاق نے کہا۔''دیکھو بات بڑھاؤ گی تو پھر اس محلے سے ذلیل ہو کر واپس آؤ گی۔ میری امی کے خلاف کچھ ثابت نہیں کر سکو گی۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ انہوں نے ایسی حرکت نہیں کی ہے۔''

محلے کے ایک بزرگ نے کہا۔''جب تمہیں یقین ہے تو ابھی بیٹے کو ہمارے ساتھ وہاں لے چلو۔''

ایک عورت نے کہا۔''فاخر کہتا ہے کہ اس نے صرف دادی کو نہیں وہاں دادا جان کو بھی دیکھا ہے۔ آپ لوگ اس بچے کو وہاں لے جائیں۔ سچ کیا ہے ابھی معلوم ہو جائے گا۔''

مشتاق اندر ہی اندر پریشان ہو رہا تھا۔ ان سب کی باتیں سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ س معاملے کو کیسے ٹھنڈا کیا جائے۔ وہ بولا۔''دیکھئے رات کے دو بجنے والے ہیں۔ اس وقت وہاں جانا مناسب نہیں ہے۔ ہمیں ٹھنڈے دماغ سے غور کرنا چاہیے۔ کل صبح میں آپ میں سے پانچ بزرگوں کے ساتھ فاخر کو لے کر وہاں جاؤں گا عورتیں نہیں جائیں گی۔ فاخرہ بھی نہیں جائے گی۔ ورنہ خواہ مخواہ تُو تُو مَیں مَیں ہو گی اور جھگڑے بڑھیں گے۔''

فاخرہ نے کہا۔''میں تو ضرور جاؤں گی۔ اگر تمہاری ماں کا جرم ثابت ہو گیا تو وہیں کھڑے کھڑے اسے حوالات میں بھجواؤں گی۔''

وہ سخت لہجے میں بولا۔''جب جرم ثابت ہو گا تو ہمارے محلے کے پانچ آدمی خود ہی کوئی کارروائی کریں گے۔''

فاخرہ نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر محلے کے ان بزرگوں سے کہا۔''آپ ذرا ٹھہریں میں ابھی آتی ہوں۔''

وہ وہاں سے پلٹ کر تیزی سے چلتی ہوئی ایک کمرے میں گئی۔ ایک بزرگ نے فاخر سے پوچھا۔''بیٹے! جہاں تمہیں قید کیا گیا تھا تم وہاں سے کیسے نکل آئے؟''

فاخر انہیں بتانے لگا کہ کس طرح اسے کمرے کا دروازہ کھلا ملا تھا اور وہ وہاں سے نکل کر بھاگتا ہوا اِدھر اُدھر بھٹکتا ہوا ایک مسجد کے پیش امام کے پاس پہنچ گیا تھا۔

فاخرہ کمرے سے باہر آئی اس کے ہاتھوں میں ایک بڑی سی البم تھی۔ وہ بولی۔''میں یہ بھول ہی گئی تھی کہ میرے میاں کے پاس ایک البم رکھی ہوئی ہے۔ اس میں ان کے پورے خاندان والوں کی تصویریں ہیں۔''

وہ چارپائی پر بیٹھ گئی۔ بیٹے کو اپنے قریب بلا کر البم کھولتے ہوئے بولی۔''بیٹے! یہ تصویر دیکھو۔ کیا یہی عورت تمہارے پاس تھی اور خود کو دادی کہہ رہی تھی؟''

بی بانو اور اس کے میاں انصار احمد کی ایک بڑی سی تصویر البم میں لگی ہوئی تھی انہیں دیکھتے ہی اس نے ہاں ہاں کے انداز میں سر ہلا کر کہا۔''امی! یہی عورت ہے۔ یہ دونوں مجھے اپنا پوتا کہہ رہے تھے اور مجھے بہت پیار کر رہے تھے۔''فاخرہ ایک جھٹکے سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ان سب کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔''دیکھ لیا آپ نے؟ سن لیا آپ نے میرے بیٹے نے تصویروں سے انہیں پہچان لیا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے البم کو اٹھا کر مشتاق کے منہ پر دے مارا پھر ایک طرف تھوکتے ہوئے کہا۔''لعنت ہے تم پر، تمہارے ماں باپ پر اور تمہارے سارے خاندان پر۔ میرا بیٹا سچ بول رہا تھا اور تم اپنے ماں باپ کے جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے اسے جھوٹا کہہ رہے تھے۔ اب کیا کہو گے؟ یہاں سارا محلہ جمع ہے ان سب کے سامنے اپنے ماں باپ کو گالیاں دو ان پر تھوکو اور ابھی ان سب کے ساتھ تھانے جا کر ان کے خلاف رپورٹ درج کراؤ اور انہیں ابھی گرفتار کراؤ۔''

ایک خاتون نے کہا۔''لعنت ہے۔ ایسی دادی اور دادا پر۔ ایک تو فاخرہ کو کبھی بہو تسلیم نہیں کیا۔ اسے اپنے گھر نہیں آنے دیا۔ اب اس کے بیٹے کو چھین لینا چاہتے تھے۔''

ایک بزرگ نے کہا۔ ''مشتاق میاں! تمہارے ماں باپ نے یہ اچھا نہیں کیا اور جو برا کیا ہے اس کے خلاف تو کارروائی کرنی ہی چاہیے۔''

ایک جوان نے جوش میں آ کر کہا۔ ''کارروائی تو یہی ہوگی جو فاخرہ باجی کہہ رہی ہیں۔''

مشتاق نے کہا۔ ''پلیز آپ لوگ جوش میں نہ آئیں۔ پہلے میری بات سن لیں۔''

ایک اور جوان نے کہا۔ ''تمہاری بات کیا سنیں؟ اس محلے سے آج تمہارے بچے کو اغوا کیا گیا۔ کل ہمارے بچوں کو اغوا کیا جائے گا۔ تھانے میں رپورٹ تو لکھوانی ہی ہوگی۔''

مشتاق نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ''نہیں یہ بات تھانے کچہری تک نہیں جائے گی۔ یہ میرے گھر کا معاملہ ہے گھر ہی کے اندر طے ہوگا۔''

فاخرہ نے تڑخ کر کہا۔ ''یہ تمہارے گھر کا معاملہ ہوگا لیکن میرے گھر کا یہ معاملہ تھانے کچہری تک ضرور جائے گا۔ اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو محلے والے میرا ساتھ دیں گے۔ اسکول کی پرنسپل اور وہاں کے تمام ٹیچرز میرا ساتھ دیں گے۔ میں ان کے بل پر قانونی کارروائی کر سکوں گی۔ یہ مت بھولو کہ میرے بیٹے کے اغوا کی رپورٹ پرنسپل نے درج کرائی ہے۔ اب یہ بات بہت آگے بڑھے گی۔ میں تمہارے ماں باپ کو آسانی سے نہیں چھوڑوں گی۔''

وہ پریشان ہو کر اپنی بیوی کو دیکھ رہا تھا پھر محلے والوں کو باری باری دیکھتے ہوئے بولا۔ ''ماں باپ جیسے بھی ہوں اولاد کبھی ان کی بے عزتی برداشت نہیں کرتی۔ میرے ماں باپ نے بے شک بہت بڑی غلطی کی ہے۔ میں آپ بزرگوں کے ساتھ وہاں جا کر ان کا محاسبہ کروں گا۔ آپ جو کہیں گے وہ کروں گا لیکن میری التجا ہے کہ ایک بیٹے کے جذبات کو سمجھیں۔''

وہ ایک ایک کی طرف دیکھ رہا تھا اور بڑی عاجزی سے کہہ رہا تھا۔ ''مجھے ہر حال میں ماں باپ کے مان مرتبے کا خیال رکھنا ہے۔ میں کبھی یہ برداشت نہیں کر سکوں گا کہ میری ماں کو تھانے بلایا جائے۔ میرے ابو اور امی دونوں کو حوالات میں بند کیا جائے۔ خدا کے لیے میں آپ سب کے سامنے ہاتھ جوڑ کر گڑگڑا رہا ہوں۔ میرے ماں باپ کے خلاف آپ جو بھی فیصلہ کریں اس میں ذرا نرمی رکھیں۔ اس بات کو گھر کی چار دیواری تک رہنے دیں۔''

وہ ہاتھ جوڑ کر ایک ایک بزرگ اور ایک ایک خاتون کی طرف جا رہا تھا اور کہہ رہا تھا۔ ''آپ کہیں گے تو میں اپنے ماں باپ سے یہ تحریری بیان لکھوا لوں گا کہ آئندہ وہ مجھ سے

میری بیوی سے اور میرے بیٹے سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے اور نہ ہی ہمیں کوئی نقصان پہنچائیں گے۔''

فاخرہ نے نفرت سے کہا۔ ''شیطانوں کو معافی نہیں ملتی سزائیں ملتی ہیں۔ تم اس طرح ہاتھ جوڑ کر سب سے التجائیں کر رہے ہو تو اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ تم بھی اپنے ماں باپ سے ملے ہوئے تھے۔ انہوں نے تمہاری مدد سے میرے بیٹے کو اغوا کیا تھا۔''

''فضول باتیں نہ کرو۔ میں اپنے بیٹے کا دشمن نہیں ہوں۔''

''تم دشمن ہو۔ تم مجرم ہو۔ اگر نہیں ہو تو مجرموں کا ساتھ نہ دو۔ ابھی ہم سب کے ساتھ تھانے چل کر ان کے خلاف رپورٹ درج کراؤ اور انہیں وہاں بلواؤ۔''

ایک بزرگ نے کہا۔ ''فاخرہ بیٹی! تم درست کہتی ہو ان کے خلاف ایسی ہی کارروائی ہونی چاہیے لیکن اپنے شوہر کے لیے اگر ایک ذرا لچک پیدا کر سکتی ہو۔ اس کے ماں باپ سے معافی نامہ لکھوا سکتی ہو تو......''

فاخرہ نے بات کاٹ کر کہا۔ ''نہیں خیر الدین چاچا! میرے بیٹے کو ہمیشہ کے لیے مجھ سے چھین لینے کی کوشش کی گئی اور اس کا گلا کاٹنے کی بھی دھمکی دی گئی تھی میں ایسے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کروں گی۔ یہ شخص جو میرا شوہر ہے آپ اس سے پوچھیں کہ یہ میرا ساتھ دے گا یا اپنے ماں باپ کا؟''

مشتاق نے کہا۔ ''میں تمہارا ساتھ دوں گا لیکن اپنے بوڑھے والدین کی توہین برداشت نہیں کروں گا۔''

''اور تم سے یہ برداشت ہو جاتا کہ وہ میرے بیٹے کو ہمیشہ کے لیے چھین لیتے۔ میرا کلیجا نوچ لیتے اگر میرا بیٹا جبراً یہاں آنے کے لیے شور مچاتا تو اس کا گلا کاٹ دیتے؟''

''کوئی کسی کا گلا نہیں کاٹتا اسے محض دھمکی دی گئی ہوگی۔''

''کیوں دھمکی دی گئی؟ کیوں اسے اغوا کیا گیا؟ کیا اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی کہ مجھ سے دشمنی تھی۔ میرے بیٹے سے دشمنی تھی اس لیے ایسا کیا گیا۔''

اس نے عورتوں اور مردوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں آپ سب کے سامنے اپنا فیصلہ سناتی ہوں۔ اگر یہ شخص ایک شوہر کی حیثیت سے اور ایک باپ کی حیثیت سے ہمارا ساتھ نہیں دے گا تو میں اس سے طلاق لے لوں گی۔ اس کا منہ نہیں دیکھوں گی۔ جو میرے بیٹے کا دشمن ہے وہ میرا بھی دشمن ہے میں ایسے شخص کے ساتھ زندگی نہیں

گزاروں گی۔"

ایک بوڑھی خاتون نے کہا۔"ہائے ہائے بیٹی! طلاق لینے کی باتیں نہ کرو۔ شریف زادیاں ایسی بات زبان پر نہیں لاتیں۔ یہ تمہارا خاوند ہے تمہارا ساتھ دے گا تم جو چاہو گی یہ وہی کرے گا۔"

مشتاق نے کہا۔"نہیں خالہ! جو غلط ہے وہ میں نہیں کروں گا۔ میرے باپ نے غلطی کی، میں یہاں سے اپنے بزرگوں کو ساتھ لے کر جاؤں گا اور ان کا محاسبہ کروں گا لیکن ان کی غلطی کے جواب میں کوئی ایسی غلطی نہیں کروں گا جس سے میرا ضمیر شرمندہ کرے۔ جب ہم سب گھر کی چاردیواری میں ان کا سر شرم سے جھکا سکتے ہیں انہیں ان کی غلطی کا احساس دلا سکتے ہیں۔ ان سے معافی نامہ لکھوا سکتے ہیں تو پھر اس معاملے کو تھانے کچہری تک نہیں لے جانا چاہیے۔"

فاخرہ نے کہا۔"تم کچھ بھی کہہ لو جتنی بھی دلیلیں دیتے رہو مجھے تو جو کرنا ہے وہ میں کروں گی۔"

مشتاق نے اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھا پھر کہا۔"میں آپ بزرگوں سے درخواست کرتا ہوں کہ مجھے فاخرہ کے ساتھ ایک کمرے میں جا کر تنہائی میں صلح صفائی کی باتیں کرنے دیں۔ اگر بات نہیں بنے گی تو اس کے بعد میں وہی کروں گا جو آپ حضرات کہیں گے۔"

ایک بزرگ نے کہا۔"بے شک۔ ایسے وقت میاں بیوی کو تنہائی میں صلح صفائی کا موقع دینا چاہیے۔ تم اس کے ساتھ کمرے میں چلے جاؤ ہم یہاں انتظار کریں گے۔"

وہ فاخرہ کے ساتھ وہاں سے چلتا ہوا ایک کمرے میں آیا پھر دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد بولا۔"میں جانتا ہوں تم میری امی اور ابو کے خلاف انتقامی کارروائی ضرور کرو گی۔ میری بات بھی نہیں مانو گی اور میں یہ بھی اچھی طرح جانتا ہوں کہ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے۔ تم شادی کی پہلی رات سے آج تک اوپری دل سے بیوی کے فرائض ادا کرتی آئی ہو۔ آج یہ بات تمہاری زبان پر آ گئی کہ طلاق لینا چاہتی ہو۔ تمہارے لاشعور میں یہ بات ہے کہ تم مجھ سے نجات حاصل کرنا چاہتی ہو۔"

وہ غصے سے منہ پھیر کر بولی۔"ہاں۔ یہی بات ہے پہلے میں بیوی کی حیثیت سے تم سے بیزار تھی۔ اب ماں کی حیثیت سے تمہیں اپنے بچے کا دشمن سمجھتی ہوں۔ تمہارے ساتھ زندگی نہیں گزاروں گی۔"

"اگر میں طلاق نہ دینا چاہوں تو تم جبراً نہیں لے سکو گی اور اگر طلاق دوں گا تو پھر اپنے بیٹے کو ساتھ لے جاؤں گا تم بیٹے سے محروم ہو جاؤ گی۔"

اس نے گھبرا کر پریشان ہو کر اسے دیکھا وہ بولا۔"میں تم سے تمہارا بیٹا چھیننا نہیں چاہتا۔ تم کہو گی تو میں پکے کاغذ پر یہ لکھ کر دے دوں گا کہ تم سے علیحدگی اختیار کرنے کے بعد بھی بیٹے پر اپنا دعویٰ نہیں کروں گا اور یہ ہمیشہ تمہارے پاس رہا کرے گا۔"

وہ ذرا نرم پڑ کر بولی۔"اگر تم ایسا کرو گے تو میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"

"تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔ تم مجھ پر احسان کرو گی تو میں بھی تم پر احسان کروں گا۔ تمہارا یہ بہت بڑا احسان ہوگا اگر تم میرے ماں باپ کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرو۔"

وہ اس کی باتیں سن رہی تھی۔ اسے سوچتی ہوئی نظروں سے دیکھ رہی تھی پھر بولی۔"کیا تم سچ کہہ رہے ہو۔ محلے والوں کے سامنے اقرار کرو گے اور پکے کاغذ پر یہ لکھ کر دو گے کہ فاخر میرا بیٹا ہے صرف میرے پاس رہے گا اور تم کبھی باپ ہونے کا دعویٰ کر کے اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاؤ گے؟"

وہ ہاں کے انداز میں سر ہلا کر بولا۔"بے شک میں ابھی محلے والوں کے سامنے یہ کہوں گا اور کل صبح کورٹ پیپر لے کر آؤں گا اس پر بھی یہی لکھ کر دوں گا۔"

وہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر سوچنے کے انداز میں آہستہ آہستہ چلتی ہوئی کمرے کے ایک گوشے کی طرف گئی پھر وہاں سے پلٹ کر بولی۔"مجھے منظور ہے۔ کورٹ پیپر پر یہ بھی لکھ کر دو گے کہ آئندہ تمہاری طرف سے تمہارے ماں باپ کی طرف سے اور تمہارے خاندان والوں کی طرف سے کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔"

"محلے والوں کے سامنے تم جو کہو گی میں وہ لکھوں گا۔ میں بھی اس زندگی سے بیزار ہو گیا ہوں۔ بیوی کی محبت کے لیے ترستا رہتا ہوں یہ اچھی طرح سمجھ گیا ہوں کہ تم سے کبھی بھرپور محبت نہیں ملے گی۔ بیٹے کو صرف یہ سوچ کر تمہارے حوالے کروں گا کہ تم مجھ سے زیادہ اسے چاہتی ہو اور یہ تمہارے پاس زیادہ محفوظ رہے گا اور ایک اچھا انسان بن سکے گا۔"

صحن میں محلے کے مرد اور عورتیں ان کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے ان کے پاس آ کر اپنا فیصلہ سنایا تو سب حیران رہ گئے۔ ایک بزرگ نے کہا۔"تم دونوں نے ایک دوسرے کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دینے کا فیصلہ اتنی جلدی کیا ہے۔ یہ نادانی ہے۔ حتمی فیصلہ کرنے سے

پہلے اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔"

مشتاق نے کہا۔"نہیں چاچا! ہم نے یہ فیصلہ چند منٹوں میں نہیں کیا ہے۔ پچھلے برسوں کی ازدواجی زندگی میں ہم یہ سمجھتے آرہے ہیں کہ ایک دوسرے کا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔ مجبوراً دنیا والوں کو دکھانے کے لیے میاں بیوی بن کر نہیں رہ سکیں گے۔ ہم نے خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے۔ کل میں صبح کورٹ پیپر لے کر آؤں گا اور آپ لوگوں کے سامنے بیٹھ کر وہ سب کچھ لکھ دوں گا جو فاخرہ کہے گی۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ میں اپنے بیٹے فاخر کو ہمیشہ کے لیے اس کے حوالے کر دوں گا تو یہ میرے ماں باپ کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں کرے گی۔ میں آپ سب سے درخواست کرتا ہوں کہ اس فیصلے پر عمل کرنے کے لیے آپ ہم سے تعاون کریں۔"

وہ سب آپس میں کچھ نہ کچھ بولنے لگے۔ کچھ دیر بیٹھے رہے پھر ایک ایک کر کے وہاں سے جانے لگے۔ خیرالدین چاچا نے جاتے ہوئے کہا۔"جب طلاق ہوتی ہے تو ایک سہاگن کی موت ہوتی ہے۔ خاوند کا کچھ بگڑے یا نہ بگڑے بچہ لاوارث بن جاتا ہے۔

☆======☆======☆

شیشے کی طرح نازک اور کمزور سی زندگیاں گزارنے والی لڑکیوں کو پتھروں سے بچ کر رہنا چاہیے۔ نیلو نے بدنامیوں کے پتھروں سے بچانے کے لیے مشتاق سے اس کی شادی کرائی تھی۔ شادی پسند کی ہو یا نہ ہو۔ لڑکیاں کسی طرح گزارہ کر لیتی ہیں۔ فاخرہ بھی مشتاق کے ساتھ کسی طرح زندگی گزار دیتی لیکن وہ اپنے بیٹے کو نقصان پہنچانے والے ماں باپ کی حمایت کر رہا تھا اور وہ کبھی یہ برداشت نہیں کر سکتی تھی۔

وہ بیٹے کی خاطر ساری دنیا کو چھوڑ سکتی تھی اس لیے شوہر کو چھوڑ دیا۔ یہ نہیں سوچا کہ وہ اس کے سر کا آنچل ہے۔ عورت سہاگن رہے اور اسے شوہر کی محبت اور حمایت حاصل ہوتی رہے تو کوئی اسے بدنام کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔

اب اس کا سر ننگا ہو گیا تھا۔ اب وہ اپنے سابقہ شوہر مشتاق کے حوالے سے نہیں اپنے بے غیرت بدنام باپ کے حوالے سے پہچانی جانے والی تھی کہ یہ اسی بے غیرت کی بیٹیوں میں سے ایک بیٹی ہے، جو شادی سے پہلے مشکوک شریفانہ زندگی گزار رہی تھی اور شادی کے بعد شوہر سے نباہ نہ کر سکی۔ ایسی لڑکیاں کسی ایک مرد کے ساتھ گزارا نہیں کرتیں لہٰذا وہ بھی نہ کر سکی۔

فاخرہ کو اس اسکول میں ملازمت کی پیشکش کی گئی تھی جہاں اس کا بیٹا پڑھتا تھا اب اسے روٹی کپڑے اور مکان کے لیے اپنا بوجھ خود اٹھانا تھا اس لیے اس نے اسکول کی ملازمت کر لی۔ ماہانہ ڈھائی ہزار روپے کا آسرا ہو گیا۔ وہ جس مکان میں مشتاق کے ساتھ رہتی تھی اس کا کرایہ زیادہ تھا۔ اسی محلے میں اسے آٹھ سو روپے ماہانہ پر کرائے کا ایک مکان مل گیا۔ وہ اسکول سے آنے کے بعد کپڑے سلائی کیا کرتی تھی۔ محلے کی عورتوں نے اس سے تعاون کیا۔ اپنے لباس اُس سے سلوانے لگیں۔

نیلو کو معلوم ہوا تو وہ دوڑی دوڑی اس کے پاس آئی پھر بولی۔"تم نے اتنا بڑا قدم اٹھایا، مشتاق سے طلاق لی اور مجھے خبر تک نہ ہونے دی۔"

وہ بولی۔"یہ میری زندگی کا بہت بڑا حادثہ تھا اور حادثہ اچانک ہی ہوتا ہے۔ میں پہلے سے تمہیں کیسے اطلاع دیتی؟ خود نہیں جانتی تھی کہ ایسا ہونے والا ہے بس جو ہونا تھا وہ ہو گیا۔"

نیلو نے بڑے دکھ سے اسے دیکھا پھر کہا۔"تم شروع سے ہی مردوں سے نفرت کرتی آئی ہو۔ ہمیشہ اکیلی رہ کر زندگی گزارنا چاہتی تھیں۔ تم نے اپنی یہ خواہش پوری کر لی مگر دیکھ لینا، یہ خواہش تمہیں بہت مہنگی پڑے گی۔"

"اب نہ تو میں کسی کے لینے میں ہوں نہ کسی کے دینے میں۔ صبح اپنے بیٹے کے ساتھ اسکول جاتی ہوں دوپہر کو واپس آتی ہوں گھر کا کام کرتی ہوں۔ کپڑے سلائی کرتی ہوں۔ سودا سلف کے لیے کبھی کبھی باہر جاتی ہوں۔ محلے والے میری عزت کرتے ہیں۔"

"محلے پڑوس کی عورتیں بہت حاسد ہوتی ہیں۔ یہ یونہی کسی کی عزت نہیں کرتیں۔ درزی ایک شلوار سوٹ کے نوے یا سو روپے لیتا ہے اور یہ عورتیں تجھ سے ساٹھ روپے میں ایک سوٹ سلواتی ہیں۔ تیس یا چالیس روپے کی بچت کرتی ہیں۔ تب تیری واہ واہ کرتی ہیں۔"

"باجی! تصویر کا ایک ہی رخ نہ دیکھو۔ میں ان کی بچت کرتی ہوں تو وہ بھی میرے کام آتی رہتی ہیں۔ ابھی تو میں نے یہ نئی زندگی شروع کی ہے اور آپ مجھے ایسے ڈرا رہی ہیں جیسے تنہا عورت کو مرد حضرات کچا چبا کر کھا جاتے ہیں۔"

"میری دعا ہے کہ تم تنہا کامیابی سے زندگی گزارتی رہو مگر تم ایک سہاگن کی زندگی ہار چکی ہو۔ تمہاری ساس اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئی۔ اس نے تمہارا گھر توڑ دیا وہ اپنا بیٹا واپس حاصل کرنا چاہتی تھی۔ وہ اسے واپس مل گیا۔ یہ نہ سمجھنا کہ وہ خاموش بیٹھی رہے گی۔ دور

ہی دور سے بدنامی کے پتھر تمہاری طرف پھینکتی رہے گی۔''

''جب ایسا ہوگا تب دیکھا جائے گا۔تم خواہ مخواہ پیش گوئی نہ کرو۔کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔راجا صاحب کے ساتھ کیسی گزر رہی ہے؟''

''خدا کا شکر ہے۔انہوں نے جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا ہے۔میں بہت خوش ہوں۔ ہمارے باپ نے کمینگی دکھائی تھی۔نوشاد کی بیٹی غزالہ کو خوب ٹریننگ دے کر راجا صاحب کے پاس بھیجا تھا۔وہ چاہتے تھے کہ مجھے اس کوٹھی سے نکال دیا جائے اور میری جگہ غزالہ آجائے لیکن راجا صاحب نے غزالہ کو صرف ایک رات کے لیے ایک بار بلایا پھر دوسری بار اسے پوچھا تک نہیں۔''

فاخرہ نے ناگواری سے کہا۔''یہ مردوں کی کیسی فطرت ہے؟ کیا تمہارے ہوتے ہوئے غزالہ کے ساتھ منہ کالا کرنا ضروری تھا؟''

''بس یونہی۔یہ بڑے آدمیوں کے شغل ہوتے ہیں۔کبھی کبھی خرمستیاں کر لیتے ہیں پھر بیویوں کے پاس چلے آتے ہیں۔''

دروازے پر دستک سنائی دی۔فاخرہ نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو باہر دو مرد اور تین عورتیں کھڑی ہوئی تھیں۔ایک شخص نے فاخر کو گردن سے پکڑ رکھا تھا۔فاخرہ تڑپ کر آگے بڑھ کر اس شخص کو دھکا دیتے ہوئے بولی۔''چھوڑو میرے بیٹے کو۔تم نے کیوں اس طرح پکڑ رکھا ہے؟''

ایک عورت نے کہا۔''اے خبردار! میرے خاوند پر ہاتھ نہ اٹھانا۔ورنہ ہاتھ توڑ دوں گی۔پہلے اپنے بیٹے سے پوچھ کہ اس نے کیا کیا ہے؟ میرے بیٹے کو پتھر مارا ہے دیکھ لے ہم نے ابھی اس کی مرہم پٹی کرائی ہے۔''

اس خاتون کے پاس کھڑے ہوئے بچے کے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔فاخر نے ماں کے پاس آکر اس سے لپٹتے ہوئے کہا۔''یہ مجھے گالیاں دے رہا تھا۔کہہ رہا تھا میرا کوئی باپ نہیں ہے۔''

اس خاتون نے کہا۔''میرے بیٹے نے کیا غلط کہا تھا؟ کیا تو نہیں جانتا کہ تیرا باپ تیری ماں کو چھوڑ کر چلا گیا ہے؟''

فاخرہ نے کہا۔''بات کو گھما پھرا کر نہ بولو۔وہ مجھے چھوڑ کر نہیں گیا ہے۔باقاعدہ محلے والوں کے سامنے طلاق ہوئی ہے۔''

''ارے تو طلاق اور کسے کہتے ہیں؟ چھوڑنے کو تو کہتے ہیں۔دنیا والوں کے سامنے اپنی بات صحیح جتانے کو کہتی ہو کہ بیٹے کی خاطر باپ کو چھوڑ دیا ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔''

فاخرہ نے غصے سے پوچھا۔''کیا حقیقت ہے؟ کیوں بات کا بتنگڑ بنا رہی ہو؟ بچوں نے آپس میں لڑائی کی ہے تو بڑوں پر کیچڑ اچھالنے چلی آئی ہو۔''

بچے کے باپ کے ساتھ آنے والے شخص نے کہا۔''کیچڑ ہے تب ہی اچھالی جا رہی ہے۔ہماری عورتوں پر کوئی کیچڑ کیوں نہیں اچھالتا۔اس لیے کہ یہ خاوند کو چھوڑ کر تمہاری طرح بے لگام زندگی نہیں گزار رہی ہیں۔''

وہ ایک دم سے تڑخ کر بولی۔''میں کیا بے لگام زندگی گزار رہی ہوں؟ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟''

زخمی بچے کے باپ نے کہا۔''ہمارا منہ نہ کھلواؤ تو اچھا ہے۔اپنے بیٹے کو قابو میں رکھو۔ ہم نے تو اس کی اچھی پٹائی کی ہے۔آئندہ یہ ہیرو بننا چاہے گا تو ہم اس کے ہاتھ پاؤں توڑ کر رکھ دیں گے۔''

اس نے اپنے زخمی بچے کو اٹھایا پھر وہ سب وہاں سے چلے گئے۔فاخرہ منہ کھولے گم صم سی کھڑی انہیں دیکھتی رہی۔آس پاس کے مکانوں سے کئی عورتیں اپنے دروازوں اور کھڑکیوں سے جھانک رہی تھیں۔انہوں نے اس کی حمایت میں کچھ نہیں کہا۔چپ چاپ تماشا دیکھتی رہیں۔

نیلو نے کہا۔''اندر آؤ اور دروازہ بند کرو۔میں نے پہلے ہی کہا تھا اس طرح تنہا زندگی گزارنا بہت مہنگا پڑے گا۔رفتہ رفتہ تمہیں اور بہت سے تجربات ہوتے رہیں گے۔آج تو تم نے طعنہ سن ہی لیا کہ خاوند کو چھوڑ کر تنہا رہنے والی عورت بے لگام کہلاتی ہے۔''

فاخرہ نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔اپنے بیٹے کو اِدھر اُدھر سے چھو کر دیکھنے لگی۔

''کیا انہوں نے تمہیں بہت مارا تھا؟''

نیلو نے کہا۔''اگر آج اس کا باپ ہوتا تو کوئی اس پر ہاتھ اٹھانے کی جرأت نہ کرتا۔ میں بہت پہلے سے سمجھاتی آرہی ہوں کہ ہم عورتیں کسی مرد کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتیں۔کسی نہ کسی کو اپنے لیے ایک مضبوط ڈھال بنا کر رکھنا ہی پڑتا ہے۔''

وہ بڑی بہن تھی۔فاخرہ کو ماں کی طرح پیار کرتی تھی۔وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے

ہوئے بولی۔ ''میں تمہاری بہتری کے لیے کہتی ہوں، عدت کے ایام گزار چکی ہو۔ کسی شریف آدمی سے نکاح پڑھوالو۔ اسے اپنے لیے ڈھال بنالو۔ اسی میں تمہاری اور فاخر کی بھلائی ہے۔''

وہ انکار میں سر ہلا کر بولی۔ ''میں کبھی کسی مرد پر بھروسا نہیں کروں گی۔ یہ میرا بیٹا میری محبتوں کا مرکز ہے۔''

وہ اسے بازوؤں میں لے کر سینے سے لگاتے ہوئے بولی۔ ''یہ دیکھتے ہی دیکھتے گبرو جوان ہو جائے گا۔ میرے لیے ڈھال بن جائے گا پھر میں کسی مرد کی محتاج نہیں رہوں گی۔''

نیلو نے اسے دکھ بھری نظروں سے دیکھا۔ وہ سمجھانے سے سمجھنے والی نہیں تھی۔ وہ کبھی کسی پر بھروسا کرنے اور کسی سے شادی کرنے کے لیے راضی ہونے والی نہیں تھی۔ اتنی بڑی دنیا میں اس کا وہی ایک بیٹا ایسا مرد بچہ تھا جس پر وہ دن رات قربان ہوتی رہتی تھی۔

وہ اسکول ٹیچر تھی۔ اسے زیادہ سے زیادہ تعلیم دلا کر ایک قابل انسان بنانا چاہتی تھی لیکن وہ ماں کی طرح تیز طرار تھا۔ اسے بات بات پر غصہ آجاتا تھا۔ جیسے جیسے بچپن کے دور سے گزر رہا تھا۔ اس کے مزاج میں تیزی اور تندی آتی جارہی تھی۔ کبھی وہ بچوں سے جھگڑا کرتا تھا، کبھی بڑوں کے طعنے سنتا تھا۔ کبھی کسی گلی سے گزرتے وقت کسی کی آواز سنائی دیتی تھی۔ کوئی کہتا تھا۔ ''بڑی چھیل چھبیلی ماسٹرنی ہے۔ کیا حسن ہے کیا جوانی ہے؟ پتا ہی نہیں چلتا کہ دس برس کے بیٹے کی ماں ہے۔''

وہ کہیں سے گزرتے ہوئے سنتا تھا۔ ''خواہ مخواہ اسکول جاتی ہے۔ ہمارے پاس آجایا کرے کچھ ہمیں پڑھایا کرے۔ کچھ ہم اسے پڑھایا کریں گے۔''

وہ چپ چاپ سنتا تھا۔ اندر ہی اندر غصے سے کھولتا تھا لیکن کسی کو یہ الزام نہیں دے سکتا تھا کہ یہ باتیں اس کی ماں کے بارے میں کہی جارہی ہیں۔ کوئی نام لے کر پتھر نہیں مارتا تھا پھر بھی اسے چوٹیں لگتی رہتی تھیں۔ وہ کتابوں سے دور ہوتا جارہا تھا اور ان پتھروں سے قریب ہو کر سوچتا رہتا تھا کہ جواباً کس طرح پتھر مارنا چاہیے؟

وہ ہیلتھ کلب جایا کرتا تھا۔ باڈی بلڈنگ کرتا تھا اپنے علاقے میں کہیں دنگا فساد ہوتو وہاں پیش پیش رہتا تھا۔ پندرہ برس کی عمر میں اچھا خاصا قد آور ہو گیا تھا۔ ایک سیاسی پارٹی

نے اسے اپنا کارندہ بنالیا تھا۔

فاخرہ اس کے بدلتے ہوئے تیور دیکھتی رہتی تھی۔ پریشان ہوتی رہتی تھی اسے تعلیم کی طرف لانا چاہتی تھی لیکن وہ ماں کو جھڑک دیا کرتا تھا۔ اس کا یوں جھڑکنا بہت اچھا لگتا تھا۔ بیٹا چٹان جیسا لگنے لگا تھا۔ پہلے سے زیادہ اس کے حواس پر چھانے لگا تھا۔ ایک گھر والے کی طرح اسے محبتیں بھی دیتا تھا اور غصہ بھی دکھاتا رہتا تھا۔

فاخرہ ایک شام گھر سے باہر جانا چاہتی تھی۔ اس نے کہا۔ ''اندھیرا ہو رہا ہے۔ کیا اس وقت جانا ضروری ہے؟''

''ہاں چینی اور چائے کی پتی ختم ہو گئی ہے۔ ابھی پرچون کی دکان سے لے آتی ہوں۔''

وہ ذرا سخت لہجے میں بولا۔ ''یہ چیزیں دن کو بھی لائی جاسکتی تھیں۔''

''اسکول سے تھک کر آئی تھی پھر کپڑے سینے کے لیے بیٹھ گئی۔ مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ بس ابھی جاتی ہوں اور ابھی آتی ہوں۔''

وہ غصے سے بولا۔ ''پتا ہے لوگ کیسی کیسی باتیں بناتے ہیں؟ وہ کتے کے بچے کھل کر بولتے نہیں ہیں لیکن ان کے بھونکنے سے پتا چل جاتا ہے کہ وہ تیرے بارے میں بول رہے ہیں۔ آج سے تُو اندھیرا ہونے کے بعد گھر سے باہر نہیں نکلے گی۔''

ماں نے چونک کر بیٹے کو دیکھا اس نے پہلی بار ''تُو'' کہا تھا۔ بچپن سے ادب آداب سکھائے گئے تھے۔ وہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ اس کا دماغ غصے سے اتنا گرم ہو جاتا تھا کہ وہ آگے پیچھے کچھ بھی نہیں سوچتا تھا بے تکان بولتا چلا جاتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے آپ نہیں کہا تُو کہا۔ تو یکبارگی فاخرہ کو یوں لگا جیسے اس کے سامنے ایک قد آور حکمران کھڑا ہوا ہے جو اپنی پیدائش کے پہلے لمحے سے اس کے دل و دماغ پر حکومت کرتا آرہا ہے اور اب ایک جابر حکمران بن گیا ہے۔

پھر بھی وہ ذرا سخت لہجے میں بولی۔ ''تم ہوش میں تو ہو۔ ادب آداب بھول گئے ہو۔ مجھے تُو کہہ رہے ہو؟''

وہ پھر تند لہجے میں بولا۔ ''ہاں کہوں گا۔ تُو نے اپنی محبت سے اپنی ممتا سے مجھے پاگل بنا دیا ہے۔ تجھ سے دور جاتا ہوں تو خود کو ادھورا ادھورا سا سمجھنے لگتا ہوں۔''

بیٹے نے پہلی بار اس طرح کھل کر اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ وہ خوشی سے جھوم گئی دوڑتی

ہوئی آ کر اس سے لپٹ گئی۔ وہ اسے چومتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ نہیں کہوں گا۔ غیروں کو آپ کہاں جاتا ہے۔ تُو میری ہے، صرف میری۔ میں تجھے ہمیشہ سینے سے لگا کر رکھوں گا۔ دنیا والوں نے جن خوشیوں سے تجھے محروم رکھا ہے میں وہ ساری خوشیاں تجھے دوں گا مگر تُو میرا حکم مانتی رہے گی۔ اندھیرا ہونے کے بعد کبھی گھر سے باہر قدم نہیں نکالے گی۔''

وہ بیٹے کی آغوش میں خوشی سے نہال ہو رہی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے زندگی میں پہلی بار ایک سچا مرد مل رہا ہے۔ جو اسے سچی خوشیاں دے رہا ہے اور وہ اپنے ہاتھ کی لکیر کے مطابق اس کے عشق میں کچھ زیادہ ہی جنونی ہوتی جا رہی ہے۔

وہ ماں اور بیٹے اپنی چھوٹی سی پیار بھری دنیا میں بڑے خوش تھے لیکن جیسے جیسے وقت گزرنے لگا ان کی محبت دوسروں کو کھٹکنے لگی۔ فاخر بیس برس کی عمر میں ایسا قد آور کڑیل جوان نکلا کہ کسی پہلو سے اپنی ماں کا بیٹا نہیں لگتا تھا۔ فاخرہ شروع ہی سے دھان پان جیسی تھی۔ ایسا چور بدن تھا کہ اسے دیکھ کر گزرتی ہوئی عمر کا حساب نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ وہ بمشکل چوبیس یا پچیس برس کی جوان لڑکی دکھائی دیتی تھی۔ جبکہ چالیس برس کی ہو چکی تھی۔ جب وہ دونوں گھر سے باہر نکلتے تھے۔ راستوں سے اور بازاروں سے گزرتے تھے تو دیکھنے والے انہیں بھائی بہن یا میاں بیوی سمجھتے تھے۔ وہ اسکول ٹیچر تھی۔ خوش لباس رہنے کی عادی تھی۔ ایسا پہنتی اوڑھتی اور کنگھی چوٹی کرتی تھی، جیسے کوئی لڑکی اپنے عاشق کے ساتھ گھومنے پھرنے نکلی ہو۔

اگر اس کا لباس شکن آلود ہو جاتا تو فاخر اسے پریس کر کے دیتا تھا۔ ضد کرتا تھا۔ امی وہ فلاں پرنٹ والا اورنج کلر کا لباس پہنو۔ کبھی چوٹی گوندھنے کو کہتا تھا۔ کبھی بالوں کو کھلا رکھنے کی فرمائش کرتا تھا۔ کسی بات پر بھی بیٹے کی ضد ہو یا فرمائش ہو وہ نہال ہوتی رہتی تھی۔

اس نے بارہ برس کی عمر سے ایسی باڈی بلڈنگ کی تھی کہ فری اسٹائل ریسلر دکھائی دیتا تھا۔ پچھلے چھ برسوں میں ایک سیاسی پارٹی کا بہت ہی اہم غنڈا بن گیا تھا۔ اس علاقے کے کئی شہہ زور اس سے پنجہ آزمائی کرنے کے بعد اب جھک جھک کر سلام کرنے لگے تھے۔ اس کی جی داری اور مقبولیت دیکھ کر پارٹی کے زونل لیڈر نے اسے اپنا باڈی گارڈ بنا لیا تھا۔ اس طرح تھانے والوں سے بھی اس کی اچھی جان پہچان ہو گئی تھی۔

محلے کے کیا جوان، کیا بوڑھے، کیا عورتیں اور کیا مرد۔ سب ہی فاخرہ کو بھی سلام کرتے تھے اور اپنے گھر بھی بلایا کرتے تھے۔ کسی کے گھر میں قورما، بریانی، حلیم یا کھیر وغیرہ پکتی تھی تو

وہ اس کے گھر ضرور بھیجتے تھے۔ کوئی اس کے بیٹے کو علاقے کا بہت بڑا غنڈہ کہنے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔

کوئی یہ پوچھنے کی جرأت نہیں کرتا تھا کہ ماں اس طرح بن سنور کر اپنے بیٹے کے ساتھ باہر گھومنے پھرنے کیوں جاتی ہے؟ وہاں کی عورتیں اس بات کو دوسرے انداز میں کہتی تھیں۔ ''فاخرہ! تم تو اپنے بیٹے کی ماں لگتی ہی نہیں ہو۔ ماشاء اللہ دور سے دیکھو تو ایسا لگتا ہے جوان لڑکی چلی آ رہی ہے۔''

وہ بظاہر فاخرہ کو کم عمر کہہ کر خوش کرتی تھیں پھر ہنس ہنس کر کہتی تھیں۔ ''بھئی فاخر کے ساتھ اس طرح نہ نکلا کرو۔ دنیا والے تمہارا رشتہ نہیں جانتے ہیں۔ وہ تو تم دونوں کو عاشق معشوق سمجھتے ہوں گے۔''

یہ کہہ کر وہ سب قہقہے لگاتی تھیں۔ فاخرہ بھی ان کے ساتھ ہنسنے لگتی تھی۔ گرمیوں کی شام کو محلے کی کئی عورتیں ایک گھر کے سامنے جمع ہو جاتی تھیں پھر کھلی تازہ ہوا میں بیٹھ کر باتیں کرتی تھیں۔ ان میں جوان لڑکیاں بھی ہوتی تھیں۔ اس محلے کی کتنی ہی لڑکیاں ایسی تھیں جو فاخر کے قد، جسامت اور ڈیل ڈول پر مرمٹی تھیں۔ دل ہی دل میں اسے چاہتی تھیں۔ اشارے بھی کرتی تھیں لیکن وہ انہیں نظر انداز کرتا رہتا تھا۔

ایک شام فاخرہ محلے میں عورتوں کے درمیان بیٹھی باتیں کر رہی تھی۔ فاخر وہاں سے گزرتے ہوئے ماں کو دیکھ کر رک گیا۔ وہاں تین جوان لڑکیاں تھیں۔ انہیں ایسا لگا جیسے وہ ان کے لیے رک گیا ہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں گفٹ پیکٹ تھا اور دوسرا ہاتھ پیچھے کی طرف تھا۔ وہ کچھ چھپا رہا تھا۔ ایک خاتون نے پوچھا۔ ''فاخر! کہاں سے آ رہے ہو؟''

وہ ماں کو دیکھ کر بولا۔ ''میں اپنی امی کے لیے ایک گفٹ خریدنے گیا تھا۔''

ایک عورت نے ذرا چبھتی ہوئی نظروں سے فاخرہ کو دیکھا پھر فاخر سے کہا۔ ''بیٹے......! اس عمر میں کسی جوان لڑکی کے لیے تحفے خریدے جاتے ہیں اور تم ماں کے لیے خرید کر لائے ہو؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میری امی ہی میری دنیا ہیں، میری کل کائنات ہیں۔''

پھر اس نے تمام عورتوں کی طرف دیکھ کر پوچھا۔ ''پتا ہے۔ آج کیا تاریخ ہے۔''

ایک نے کہا۔ ''آج فروری کی چودہ تاریخ ہے۔''

وہ بولا۔ ''ہاں یہ کیلنڈر کی سب سے خوبصورت تاریخ ہے۔ یہ ہماری دنیا کا سب سے

خوب صورت دن ہوتا ہے آج کے دن جو جسے چاہتا ہے۔ اسے گلاب کی سرخ کلی پیش کرتا ہے۔''

یہ کہہ کر اس نے پیچھے کا ہاتھ آگے کیا تو اس کے ہاتھ میں سرخ گلاب کی ایک کلی تھی۔ جوان لڑکیوں کے دلوں سے ہائے نکلی۔ ایک نے کہا۔''ہائے آج ویلنٹائن ڈے ہے۔''

ایک بوڑھی خاتون نے پوچھا۔''یہ کیا ہوتا ہے۔''

دوسری جوان لڑکی نے کہا۔''دادی جان! آپ نہیں سمجھیں گی۔ آج کے دن محبت کرنے والے اپنی محبوباؤں کو پھول پیش کرتے ہیں۔''

فاخر نے اپنی ماں کے سامنے پھول پیش کرتے ہوئے کہا۔''مائی ڈیئر امی! ہیپی ویلنٹائن ڈے......''

ایک لڑکی کی پیشانی پر شکنیں پڑ گئیں۔ وہ بولی۔''یہ کیا؟ آج کے دن جوان لڑکے جوان لڑکیوں کو پھول پیش کرتے ہیں اور تم اپنی ماں کو پھول پیش کر رہے ہو؟''

وہ بولا۔''یہ کس کتاب میں لکھا ہوا ہے کہ جوان لڑکے صرف جوان لڑکیوں کو ہی پھول پیش کرتے ہیں۔ اپنی پیدا کرنے والی ماں کو گلاب کی ایک کلی نہیں دے سکتے؟''

فاخرہ نے بڑے فخر سے اس پھول کو سونگھا پھر اس کے ہاتھ سے گفٹ لے کر اٹھتے ہوئے بولی۔''پھولوں میں حسن ہوتا ہے۔ پاکیزگی ہوتی ہے۔ اگر نیت میں پاکیزگی ہو تو بھائی اپنی بہن کو اور بیٹا اپنی ماں کو پھول پیش کر سکتا ہے۔''

وہ مسکراتی ہوئی اپنے بیٹے کے ساتھ گھر کی طرف جانے لگی۔ تمام عورتیں چپ چاپ ان ماں بیٹے کو جاتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ ایک لڑکی نے حقارت سے کہا۔
''اونہہ......''

دوسری لڑکی نے کہا۔''اماں جان بڑھاپے میں جوان چھوکریوں کی طرح بن سنور کر گھومتی ہے۔ کوئی پوچھے یا نہ پوچھے بیٹا تو پوچھ ہی رہا ہے۔''

ایک عمر رسیدہ خاتون نے کہا۔''یوں کہو۔ کالا ہی کالا دکھائی دیتا ہے۔ نہ دال رہی نہ شرم وحیا رہی۔ کیا ان پر کوئی انگلی اٹھانے والا نہیں ہے؟''

اس سوال پر سب چپ ہو گئیں۔ فاخر کا رعب اور دبدبہ ایسا تھا کہ حسد کرنے والے اور جلنے کڑھنے والے پیٹھ پیچھے انہیں گالیاں دیتے تھے اور سامنا ہوتے ہی خوشامدانہ انداز میں

بولنے لگتے تھے۔

وہ ماں بیٹے گھر پہنچے تو تھوڑی دیر بعد نیلو آگئی فاخر اسے دیکھتے ہی خالہ جان کہہ کر اس سے لپٹ گیا۔ اسے بھینچ کر پیار کرنے لگا وہ خود کو چھڑاتے ہوئے بولی''ارے کم بخت! چھوڑ مجھے، اپنی ماں کو دبوچا کر میرا تو دم نکلنے لگتا ہے۔''

فاخرہ ہنس رہی تھی۔ وہ گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے بولی۔''تم نے بیٹا پیدا کیا ہے یا بلڈوزر؟ اس کا پیار بڑا مہنگا پڑتا ہے۔ کچومر نکال کر رکھ دیتا ہے۔''

''اسے بیٹا کہو یا بلڈوزر۔ تمہارا ہی بھانجا ہے۔ یاد ہے میں نے کہا تھا جب یہ جوان ہو گا تو میرے لیے ایک مضبوط ڈھال بن جائے گا۔''

نیلو نے اس کے سر کی طرف پورا ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔''ماشاء اللہ! اس کے سر پر محبت سے ہاتھ پھیرنے کے لیے سیڑھی لگانی ہوگی۔ اپنے بیٹے کی نظر اُتارتی رہا کرو۔''

وہ سر جھکا کر بولا۔''سیڑھی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ میں تو امی کے اور آپ کے آگے جھکنے کے لیے پیدا ہوا ہوں۔''

وہ بڑے فخر سے اپنے بیٹے کو مسکراتے ہوئے دیکھ رہی تھی پھر بولی۔''باجی! تم نے کہا تھا ہمارے معاشرے میں عورتیں مرد کے بغیر تنہا زندگی نہیں گزار سکتیں۔ دیکھ لو۔ میں کیسے گزار رہی ہوں؟ میرا بیٹا بچے سے جوان ہو گیا۔ میں کبھی کسی مرد کی محتاج نہیں رہی۔''

نیلو نے بہن کو ذرا غور سے دیکھا پھر کہا۔''زندگی کے کسی نہ کسی موڑ پر ایک ساتھی کی ضرورت پیش آتی ہے۔ تم اب بھی جوان ہو تمہیں کسی شریف آدمی کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنی چاہیے۔''

فاخر نے کہا۔''پلیز خالہ جان! میری امی سے ایسی باتیں نہ کریں۔ یہ صرف مجھے چاہتی ہیں۔ میری محبت کسی کو نہیں دیں گی۔''

بے شک۔ تم بیٹے ہو تمہارے لیے جو ممتا ہے وہ کسی کو نہیں دیں گی۔ تم جوان ہو۔ سمجھ دار ہو تمہیں سمجھنا چاہیے کہ تمہاری امی کو ایک اچھی ہنستی کھیلتی ازدواجی زندگی گزارنی چاہیے۔''

''باجی! تم جب بھی آتی ہو۔ میری شادی کرانے کی ہی بات کرتی ہو۔ پہلے حالات اور تھے۔ ہم اپنے باپ کے رحم وکرم پر تھے۔ آپ نے وہاں سے نجات دلا کر میری شادی فاخر کے باپ سے کرادی۔ اس سے نباہ نہ ہو سکا تو دوسری شادی کے مشورے دینے لگی ہو۔ تب

سے اب تک پندرہ برس گزر چکے ہیں۔ بے شک میں دنیا والوں کے طعنے سنتی رہی۔ لوگ مجھے بدنام کرتے رہے لیکن یہ سب کچھ عارضی تھا۔ آج میرا بیٹا گبرو جوان ہو گیا ہے کہ اس کے سامنے کوئی زبان ہلانے کی جرأت نہیں کرتا ہے۔''

''بے شک۔ تم نے اب تک ایک جیون ساتھی کے بغیر زندگی گزاری ہے لیکن اب تم کسی کا ساتھ ضروری سمجھنے لگی ہو۔''

فاخرہ نے تعجب سے پوچھا ''یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟ میں بھلا کسی ساتھی کی ضرورت کیوں محسوس کروں گی۔''

نیلو نے فاخر کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ''میں تم سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتی ہوں۔''

''تنہائی کی کیا ضرورت ہے؟ میں اپنے بیٹے سے کوئی بات نہیں چھپاتی۔ یہ بھی اپنی ہر بات مجھے بتاتا ہے۔ تم جو کہنا چاہتی ہو اس کے سامنے کہہ سکتی ہو۔''

''تم اجازت دے رہی ہو اس لیے جوان بیٹے کے سامنے پوچھ رہی ہوں۔ کیا تم کسی شخص سے محبت کر رہی ہو؟''

فاخرہ نے ایک دم سے چونک کر اسے دیکھا پھر اپنے بیٹے کو دیکھا۔ وہ بھی حیرت سے ماں کو دیکھ رہا تھا۔ نیلو نے کہا۔ ''تمہارے بہنوئی راجا صاحب کے ایک دوست ہیں۔ وہ تمہیں میری بہن کی حیثیت سے پہچانتے ہیں۔ انہوں نے تمہیں کلفٹن میں ایک شخص کے ساتھ دیکھا تھا تو راجا صاحب سے یہ سوال کیا تھا۔ کیا آپ کی سالی کسی سے شادی کر چکی ہے؟''

فاخرہ نے ناگواری سے کہا۔ ''راجا صاحب کا دوست بکواس کرتا ہے۔ میں بھلا کسی شخص کے ساتھ کلفٹن کیوں جاؤں گی۔''

نیلو نے کہا۔ ''راجا صاحب جانتے ہیں کہ تم نے شادی نہیں کی ہے۔ اس لیے انہوں نے دوست کی بات کا یقین نہیں کیا لیکن پرسوں خود راجا صاحب نے تمہیں ایک نوجوان کے ساتھ حیدری مارکیٹ میں دیکھا ہے تم اس کے ساتھ بڑی ہنس کر بول رہی تھی اور وہ تمھیں ایک چوڑی والے کی دکان پر لے جا کر اپنے ہاتھ سے چوڑیاں پہنا رہا تھا۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی دونوں ماں بیٹے زوردار قہقہے لگانے لگے۔ وہ تعجب سے انہیں دیکھنے لگی پھر بولی۔ ''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے؟''

وہ نیلو کو دونوں بازوؤں میں سمیٹ کر بولا۔ ''خالہ جان! وہ میں تھا۔ میں امی کو ایک

دکان میں چوڑیاں پہنا رہا تھا۔''

وہ ماں اور بیٹے کو باری باری دیکھتی رہی پھر بولی۔ ''یا خدا! تم دونوں واقعی ماں بیٹے نہیں لگتے ہو۔ کہیں باہر جاتے ہو گے تو دنیا والے دھوکا کھاتے ہوں گے۔ راجا صاحب نے بھی دھوکا کھایا۔ ان کے دوست نے بھی دھوکا کھایا اور پتا نہیں کتنے ہی لوگ ہوں گے جو تمہارے بارے میں طرح طرح کی رائے قائم کرتے ہوں گے۔''

فاخرہ نے کہا۔ ''دوسروں کی غلط رائے سے ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا۔''

نیلو نے کہا۔ ''بگڑتا ہے۔ دوسروں کے باتیں بنانے سے اور غلط الزامات لگا کر اسے درست ثابت کرنے سے ہی بہت کچھ بگڑ جاتا ہے۔ ہم جس معاشرے میں سانسیں لے رہے ہیں۔ یہاں تنگ نظری، تنگ دلی، حسد اور بغض اس قدر ہے کہ خود کو برتر رکھنے اور دوسروں کو کم تر بنانے کے لیے ایک دوسرے کی کمزوریاں تلاش کی جاتی ہیں۔ اگر چھوٹی سی رائی جیسی کمزوری بھی ہاتھ آ جائے تو اس کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔''

''باجی! تم پہلے بھی مجھے تنہا زندگی گزارنے کے سلسلے میں ڈراتی رہتی تھیں۔ اب بیٹا جوان ہو گیا ہے پھر بھی بدنامیوں سے ڈرا رہی ہو۔ ہم ماں بیٹے ڈر ڈر کر جینے والوں میں سے نہیں ہیں۔ تم ہماری فکر نہ کرو۔''

''میں ڈرنے کو نہیں سنبھلنے کو کہہ رہی ہوں۔ ہم دنیا والوں کو ایسا کوئی موقع کیوں دیں کہ وہ ہمیں کسی طور پر بھی بدنام کریں۔ اگر تم شادی نہیں کرنا چاہتیں اور یہ سمجھتی ہو کہ وقت بہت گزر چکا ہے تو کوئی بات نہیں۔ بیٹے کی شادی کرو ایک بہو لے آؤ۔ بہو آئے گی بچے ہوں گے۔ ایک خاندان آباد ہو گا تو لوگوں کی غلط فہمیاں ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں گی۔''

فاخرہ نے پریشان ہو کر بیٹے کو دیکھا۔ بیٹے نے آگے بڑھ کر ماں کو اپنے بازوؤں میں لے کر کہا۔ ''خالہ جان! میں شادی نہیں کروں گا۔ اپنی ماں کی محبت کسی دوسری عورت کو نہیں دوں گا۔''

''کیا تم ماں بیٹے دونوں ہی پاگل ہو؟ تم سے کون کہہ رہا ہے کہ اپنی ماں کی محبت بیوی کو دو۔ ماں الگ ہوتی ہے، بیوی الگ ہوتی ہے۔ محبت میں پھلنے اور پھولنے کی اتنی گنجائش ہے کہ کئی رشتوں میں محبتوں کو تقسیم کیا جاتا ہے۔ ماں کی محبت ماں کو اور بیوی کی محبت بیوی کو دی جاتی ہے۔''

فاخرہ نے کہا۔ ''باجی! ابھی میرے بیٹے کی عمر ہی کیا ہے کہ تم اس کی شادی کرانے کو کہہ

رہی ہو؟ اگلے الیکشن میں اس کی پارٹی کا لیڈر جیتے گا تو اسے ایک پلاٹ بھی دے گا اور کاروبار کے لیے اچھی خاصی رقم بھی دے گا۔ جب یہ کوئی بزنس کرنے لگے گا۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے گا تب میں بہو لے کر آؤں گی۔ خدا کے لیے آپ ماں بیٹے کو الگ کرنے والی باتیں ابھی سے نہ کریں۔"

وہ حیرانی اور پریشانی سے ان ماں بیٹے کو دیکھ رہی تھی اور سوچ رہی تھی۔ "میں نے فاخرہ کو ایک دلدل سے نکال کر مشتاق کی دلہن بنایا یہ اس کے ساتھ نباہ نہ کر سکی۔ اپنی ساری ممتا بیٹے پر نچھاور کرتی آ رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھ پر مہربان ہوا مجھے ایک موقع ملا تو میں اس دلدل سے نکل کر اب عزت آبرو سے زندگی گزار رہی ہوں پھر بھی ڈرتی ہوں کہ میری کوئی چھوٹی سی غلطی میری پچھلی بدنامیوں کو پھر سے نہ اچھال دے۔ ہم عورتیں شیشے کا وجود رکھتی ہیں۔ کوئی بھی پتھر مار کر ہمیں توڑ دیتا ہے۔ یہ بات فاخرہ کی سمجھ میں نہیں آ رہی ہے۔ اسے تو اللہ ہی سمجھائے گا۔"

☆======☆======☆

الیکشن کے ہنگامے جاری تھے۔ قومی اسمبلی کے امیدواروں کے درمیان زبردست مقابلہ تھا۔ ووٹنگ ہو رہی تھی۔ تمام سیاسی پارٹیوں کے رہنما دعویٰ کر رہے تھے کہ امن وامان سے انتخابات ہوں گے لیکن ان کے غنڈے اپنے اپنے لیڈروں کے حق میں ووٹ حاصل کرنے کے لیے محلے والوں کو دھمکیاں دے رہے تھے۔ انہیں اپنی گاڑیوں میں بٹھا کر ووٹ ڈالنے کے لیے لے جا رہے تھے۔ ووٹروں کو اپنی طرف کھینچنے، چھیننے، جھپٹنے کے سلسلے میں دنگے فساد بھی ہونے لگے تھے۔ ایک آدھ علاقے میں گولیاں بھی چلائی گئی تھیں۔ فاخرہ پریشان ہو کر محلے میں اِدھر سے اُدھر بھاگی پھر رہی تھی۔ فاخر کو تلاش کر رہی تھی۔ اس کی پارٹی کے غنڈے نے کہا۔ "اماں جی! تم گھر جاؤ فاخر ابھی نہیں آئے گا۔ اس نے مخالف پارٹی کے ایک غنڈے کی اچھی طرح پٹائی کر کے اسے اسپتال پہنچا دیا ہے۔"

وہ پریشان ہو کر بولی۔ "یہ لڑکا کیا کرتا پھر رہا ہے۔ مجھے اس کے پاس لے چلو۔ اسے کچھ ہو گیا تو میں جیتے جی مر جاؤں گی۔"

"ماں جی! سیاسی کھیلوں میں خون خرابے ہوتے ہی ہیں۔ جان جاتی ہے تو اچھی خاصی رقم بھی ملتی ہے۔ ویسے تمہارا بیٹا تو باڈی بلڈر ہے پارٹی کا ہیرو ہے۔ اس کی پرواہ نہ کرو۔"

وہ شام کو گھر آ گئی۔ بیٹے نے سختی سے تاکید کی تھی کہ اندھیرا ہونے کے بعد وہ کبھی گھر سے باہر نہ جائے۔ وہ بیٹے کا حکم ایسے مانتی تھی جیسے وہی اس گھر کا اور اس کی زندگی کا مالک مختار ہو لیکن اس وقت گھر کے اندر سکون نہیں مل رہا تھا۔ وہ پریشان ہو رہی تھی کہ بیٹے کی خیریت کیسے معلوم کرے؟ بار بار دروازہ کھول کر باہر جھانکتی تھی اور گزرنے والوں سے پوچھتی تھی۔ "تم نے فاخر کو کہیں دیکھا ہے؟"

کسی نے اس کے بارے میں صحیح اطلاع نہیں دی۔ اس نے ٹی وی کھول کر خبریں سنیں۔ خبروں میں بتایا جا رہا تھا کہ انتخابات امن وامان سے ہو رہے ہیں۔ کہیں کہیں دنگے فسادات کرنے کی کوششیں کی گئی تھیں۔ انہیں ناکام بنا دیا گیا ہے۔ خون خرابہ کرنے والے شرپسندوں کو گرفتار کیا گیا ہے۔ خبروں میں یہ بھی بتایا گیا تھا کہ ووٹوں کی گنتی جاری ہے۔

فاخر آدھی رات کو آیا پھر جلدی جلدی کھانا کھا کر واپس جانے لگا۔ وہ بولی۔ "اب کہاں جا رہے ہو؟ انتخابات تو ہو چکے ہیں۔"

"ابھی ووٹوں کی گنتی جاری ہے۔ دیکھ لینا ہماری پارٹی یہ الیکشن جیت لے گی۔ ہم جشن منانے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ تم فکر نہ کرو میں کل دوپہر کو کھانے کے لیے آؤں گا۔ اس سے پہلے نہیں آ سکوں گا۔"

"تم نہیں آؤ گے تو میری جان نکلتی رہے گی۔"

"امی! کبھی تو میرے بغیر رہ لیا کرو۔ میں کہیں دور نہیں جا رہا ہوں۔ اسی علاقے میں اپنے سیاسی رہنما عنایت اللہ برقی صاحب کے ساتھ رہوں گا۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ تم پرواہ نہ کرو۔ دروازہ بند کرو اور آرام سے سو جاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اس نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ وہ اندر سے بکھر گئی تھی۔ وہ جب تک خیر خیریت سے واپس نہ آتا اس کا دل اور دماغ اسی طرف لگا رہتا۔ اس نے بیٹے کے ساتھ روٹی کھالی تھی لیکن آج اس کے ساتھ سو نہیں سکتی تھی اور اس کے بغیر نیند بھی نہیں آ سکتی تھی۔ وہ دونوں الگ الگ چارپائی پر سوتے تھے۔ راتوں کو جب بھی وہ کروٹیں بدلتی تھی تو ہر کروٹ پر آنکھ کھل جاتی تھی۔ سر اٹھا کر بیٹے کو دیکھتی تھی۔ مختصر سی دعا مانگتی تھی پھر سو جایا کرتی تھی۔

وہ رات کھلی آنکھوں میں کٹ گئی۔ دوسرا دن بھی گزرنے لگا۔ شام ہوتے ہوتے فاخر

خبر ملی کہ ووٹنگ کے دوران میں دنگا فساد کرنے والوں کو گرفتار کیا گیا ہے۔ فاخر نے مخالف پارٹی کے جس غنڈے کی پٹائی کی تھی وہ اسپتال پہنچ کر مر گیا تھا۔ یہ سنتے ہی فاخرہ کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس نے پوچھا۔ ”میرا بیٹا کہاں ہے۔“

”یہ کوئی نہیں جانتا پولیس اسے تلاش کر رہی ہے اور وہ کہیں رُوپوش ہو گیا ہے۔“

وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ ”بیٹا! تم فاخر کے دوست ہو اسے تلاش کرو۔ اس کی حفاظت کرو۔ مجھے کسی طرح وہاں پہنچا دو۔ میں اپنے بیٹے کو یہاں سے کہیں دور لے جاؤں گی۔ پولیس والے اس تک نہیں پہنچ سکیں گے۔“

وہ بولا۔ ”ماں جی! آپ فکر نہ کریں۔ وہ جہاں بھی ہوگا خیریت سے ہوگا۔ مجھے اس کا پتا ٹھکانا معلوم ہوگا تو میں آپ کو وہاں لے جاؤں گا۔“

اس اطلاع دینے والے جوان کا نام راشد تھا۔ وہ اسے تسلیاں دے کر گھر سے باہر آیا۔ باہر کچھ فاصلے پر تین افراد کھڑے ہوئے تھے۔ راشد نے ان کے پاس آ کر کہا۔ ”وہ گھر میں نہیں ہے۔ ماں اس کے لیے پریشان ہو رہی ہے۔“

ایک شخص نے دانت پیس کر کہا۔ ”سالا بچ کر کہاں جائے گا؟ میں نے اسپتال میں بھائی کی لاش کے پاس قسم کھائی ہے، اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا اگر وہ نہ ملا تو اس کی ماں کو جہنم میں پہنچا دوں گا۔“

دوسرے شخص نے کہا۔ ”اس کی پارٹی ہار چکی ہے۔ اب نہ تو لیڈر اس کا ساتھ دے سکے گا اور نہ ہی تھانے والے اس کے کسی کام آئیں گے۔“

راشد نے کہا۔ ”یار! میں نے پہلی بار اس کی ماں کو دیکھا ہے۔ وہ تو ماں لگتی ہی نہیں، جوان لڑکی دکھائی دیتی ہے۔“

تیسرے شخص نے کہا۔ ”سالے! میں دروازے کے پاس کان لگا کر سن رہا تھا۔ تُو اسے ماں جی کہہ رہا تھا اب یہاں آ کر جوان چھوکری کہہ رہا ہے۔ کیا رال ٹپک رہی ہے؟“

اس بات پر سب قہقہے لگا کر وہاں سے جانے لگے۔ ایک نے کہا۔ ”میں نے اس کی ماں کو کئی بار دیکھا ہے واقعی بڑی چھیل چھبیلی ہے۔ خوب صورت بھی ہے اور بھرپور جوان بھی۔“

وہ محلے میں ایک مرد اور ایک عورت کو دیکھ کر رک گئے۔ ان میں سے ایک نے پوچھا۔ ”یہ جو فاخر کے گھر میں عورت رہتی ہے؟ وہ کیا اس کی ماں ہے؟“

اس عورت نے کہا۔ ”ہم سے نہ پوچھو۔ وہ اس علاقے کا غنڈا بدمعاش ہے۔ ہمارے منہ سے سچ نکلے گا تو ہمیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔“

ایک نے کہا۔ ”ماں جی! اب اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کی سیاسی پارٹی ہار چکی ہے اس علاقے میں اب ہمارا راج ہے۔ تھانے والے بھی اس کی نہیں ہماری سنا کریں گے۔“

اس عورت کے ساتھ کھڑے ہوئے مرد نے کہا۔ ”ہم فاخر کو بچپن سے دیکھتے آ رہے ہیں۔ پہلے وہ یہاں سے چوتھی گلی میں رہتے تھے۔ سنا ہے اس کی ماں نے اپنے شوہر سے طلاق لے لی تھی۔ تب سے بیٹے کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے لیکن اب تو وہ بیٹا نہیں، اس کا کچھ اور ہی لگتا ہے۔“

اس عورت نے کہا۔ ”محلے میں کسی سے بھی پوچھ لو۔ وہ فاخر سے ڈرتے ضرور ہیں پھر بھی دبی زبان سے یہی کہتے ہیں کہ وہ ماں بیٹے نہیں ہیں۔ فاخرہ نے پوری جوانی یونہی گزار دی کسی سے شادی نہیں کی۔ اس کے پیچھے کوئی بات تو ضرور ہوگی۔“

شام ہوتے ہوتے غیر سرکاری طور پر جو اعلان ہوا اس کے مطابق وہ سیاسی پارٹی ہار گئی، جس سے فاخر کا تعلق تھا اور وہ پارٹی جیت گئی، جس کے ایک غنڈے کی پٹائی فاخر نے کی تھی اور وہ اسپتال پہنچ کر مر گیا تھا۔

فاخر کے ہارے ہوئے سیاسی لیڈر عنایت اللہ برقی نے کہا۔ ”تم میری رہائش گاہ میں جب تک چاہو رہ سکتے ہو۔ پولیس والوں کے ہتھے چڑھ جاؤ گے تو میں تمہارے لیے کچھ نہیں کر سکوں گا۔ آئندہ ہم پاور میں نہیں رہیں گے۔ تم نے میری خاطر اس غنڈے کو ہلاک کیا ہے۔ اگلے الیکشن میں ان شاء اللہ ہماری جیت ہوگی تو میں تمہارے لیے بہت کچھ کروں گا۔“

اس نے پوچھا۔ ”سر! میں پانچ برس تک کہاں چھپتا پھروں گا۔ امی میرے لیے پریشان ہوتی رہیں گی۔“

”تم اپنی ماں کو بھی یہاں بلا لو۔ جب تک چھپ کر رہ سکتے ہو رہو۔ ویسے ہمارے ملک میں کسی سیاسی پارٹی نے پانچ برس تک حکومت نہیں کی۔ ہم اپوزیشن میں رہ کر جلد ہی اس جیتنے والی پارٹی کی حکومت کو گرائیں گے۔“

پھر عنایت اللہ برقی جاتے ہوئے بولا۔ ”تمہارے پاس اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار ہے اور رابطے کے لیے موبائل فون ہے۔ تم کسی بھی وقت مجھ سے رابطہ کر سکتے ہو۔“

عنایت اللہ برقی کے جانے کے بعد وہ اپنی امی کے بارے میں بے چین ہو کر سوچنے لگا۔ اس نے فون کے ذریعے اپنے ایک ساتھی سے رابطہ کیا پھر اس سے کہا۔ ''میں فاخر بول رہا ہوں۔ خدا کے لیے میرے امی کے پاس جاؤ اور انہیں یہ تسلی دو کہ میں خیریت سے ہوں وہ میری فکر نہ کریں۔ تم ان سے مل کر مجھے ان کی خیریت کے بارے میں کچھ بتاؤ۔''

اس نے کہا۔ ''میں شام کو تمہارے گھر گیا تھا۔ تمہاری ماں بہت پریشان ہے۔ تم نے جسے قتل کیا ہے اس کا بھائی تین غنڈوں کے ساتھ تمہارے مکان کے قریب آیا تھا۔ ان میں سے ایک کو میں جانتا ہوں۔ اس کا نام راشد ہے وہ تمہاری ماں سے ملنے گیا تھا پھر تھوڑی دیر بعد وہ چاروں واپس چلے گئے۔''

فاخر نے کہا۔ ''میں سمجھ گیا، وہ لوگ مجھے تلاش کر رہے ہیں۔ کیا تم اس مقتول کے بھائی سے فون پر میری بات کرا سکتے ہو؟ اگر وہ مل جائے تو اسے میرا فون نمبر دو۔ اس سے کہو میں کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

فاخر نے اپنا موبائل نمبر دے کر رابطہ ختم کر دیا۔ آدھے گھنٹے بعد ہی فون کا بزر سنائی دیا۔ اس نے اسے آن کر کے کان سے لگایا پھر کہا۔ ''میں فاخر بول رہا ہوں۔''

دوسری طرف سے گالی دی گئی۔ ''کتے کے بچے! تُو کہاں چھپا ہوا ہے؟ میرے بھائی کو مار ڈالنے کے بعد کیا تُو زندہ بچے گا؟''

فاخر نے کہا۔ ''آصف بھائی! تم جانتے ہو میں کسی سے ڈرتا نہیں ہوں۔ تم مجھے للکار رہے ہو۔ میں تمہارے سامنے آ کر تمہیں گولی مار سکتا ہوں لیکن اپنی صفائی پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ میں نے تمہارے بھائی کو جان بوجھ کر ہلاک نہیں کیا ہے۔ اس کے ساتھ معمولی سی جھڑپ ہوئی تھی پتا نہیں وہ اسپتال پہنچ کر کیسے مر گیا۔''

''جھوٹ مت بول۔ تُو اپنی صفائی پیش کر کے زندہ نہیں بچے گا۔ مرد کا بچہ ہے تو چوہے کے بل سے نکل کر باہر آ پھر ہم تجھ سے نمٹ لیں گے۔''

''میں جواباً تمہیں چیلنج نہیں کروں گا۔ ایک دوست اور بھائی کی حیثیت سے کہتا ہوں میری سچائی کو سمجھو اس کے مقدر میں موت تھی، وہ مر گیا۔ خدا گواہ ہے، میں نے اسے نہیں مارا۔ تم چاہو تو میرا ساتھ دے سکتے ہو۔ تھانے میں بیان دے سکتے ہو کہ اس کی ہلاکت میں میرا ہاتھ نہیں ہے۔ دیکھو میری حمایت کر کے مجھ سے دوستی کر کے فائدے میں رہو گے۔''

آصف نے پھر اسے گالیاں دیتے ہوئے کہا۔ ''میں تجھ سے تو ایسی دوستی کروں گا کہ سالے چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔ یہ مت سمجھنا کہ میں تجھے تلاش نہیں کر سکوں گا۔ بس تھوڑی دیر انتظار کر لے۔ اس کے بعد تُو خود ہی روتا گڑگڑاتا ہوا میرے قدموں میں آئے گا۔''

فاخر نے اپنے فون کو دیکھا پھر اسے بند کرتے ہوئے سوچنے لگا، وہ ایسی کیا حرکت کر سکتا ہے کہ میں اس کے قدموں میں گرنے پر مجبور ہو جاؤں گا؟

ایک ہی بات سمجھ میں آئی کہ وہ اس کی امی کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس نے فوراً ہی موبائل کے ذریعے عنایت اللہ برقی سے رابطہ کیا۔ پتا چلا وہ گھر میں نہیں ہے۔ اس کے دوسرے موبائل پر رابطہ کیا مگر رابطہ نہ ہو سکا۔ اس نے اپنا فون کسی وجہ سے بند رکھا تھا۔ وہ جھنجھلا کر رہ گیا۔

اس وقت کوئی اور اس کے ساتھ نہیں تھا وہ کسی کے ذریعے ماں کی حفاظت نہیں کر سکتا تھا اور نہ ہی خود اپنے علاقے میں قدم رکھ سکتا تھا۔ ایک تو دشمن اس کی تاک میں تھے دوسرے پولیس والے بھی اسے تلاش کر رہے تھے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ عنایت اللہ برقی کے گھر واپس آنے کا انتظار کرے۔ اس سے رابطہ کر کے ہی وہ اپنی امی کے تحفظ کے لیے کچھ کر سکتا تھا۔

اس سے پہلے ہی آصف خان اپنی چال چل چکا تھا۔ اس نے اپنے ساتھی راشد کو فاخرہ کے پاس بھیجا۔ اس نے کہا۔ ''ماں جی! میں آپ کے بیٹے سے مل کر آ رہا ہوں۔ وہ ایک جگہ چھپا ہوا ہے۔ وہاں سے باہر نہیں آ سکتا۔ آپ سے ملنا چاہتا ہے آپ فوراً وہاں چلیں۔''

فاخرہ یہ سنتے ہی چادر لپیٹ کر باہر آئی۔ دروازے پر تالا ڈالا پھر اس کے ساتھ ایک جیپ میں آ کر بیٹھ گئی۔ وہ جیپ اسے اس علاقے سے باہر لے جانے لگی۔ اس نے پوچھا۔ ''بیٹے وہ یہاں سے کتنی دور ہے؟''

راشد نے کہا۔ ''وہ جتنی بھی دور ہو وہاں تو تمہیں جانا ہی ہے۔ یہ بتاؤ کہ واقعی تم اس کی ماں ہو اور وہ تمہارا بیٹا ہے؟''

''ہاں بیٹے میں اس کی ماں ہوں۔ ماں نہ ہوتی تو تم اس کا پیغام لے کر میرے پاس کیوں آتے؟''

"ہاں مگر تمہیں دیکھ کر یقین نہیں ہوتا کہ تم فاخر کی ماں ہو۔"

وہ ناگواری سے بولی۔ "فضول باتیں نہ کرو۔"

وہ جیپ ایک ویران سی بستی کے آخری سرے کے آخری مکان کے سامنے پہنچ گئی۔ راشد نے کہا۔ "تمہارا بیٹا اس مکان میں چھپا ہوا ہے۔"

فاخرہ یہ سنتے ہی جیپ سے اُتر کر دوڑتی ہوئی، بیٹے کو پکارتی ہوئی دروازے پر آئی۔ دروازہ کھل گیا وہاں آصف خان کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ "آؤ میں تمہارا ہی انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ اندر آ کر بولی۔ "میرا بیٹا کہاں ہے؟"

وہ دروازے کو اندر سے بند کرتے ہوئے بولا۔ "واہ! کیا غضب کی چیز ہو بالکل جوان چھوکری لگتی ہو۔ اس ہاتھی کے بچے کو اپنا بیٹا نہ کہا کرو۔"

وہ ایک قدم پیچھے ہٹ کر غصے سے بولی۔ "یہ کیا بکواس کر رہے ہو۔ میرا بیٹا کہاں ہے؟"

"بے چینی کیوں ہے؟ تم دونوں اب تک دنیا والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے آ رہے ہو۔ ماں بیٹے ہرگز نہیں ہو سکتے۔ میں تمہارے محلے کے کئی لوگوں سے مل چکا ہوں۔ سبھی یہ کہتے ہیں کہ تم دونوں میاں بیوی کی زندگی گزار رہے ہو۔"

وہ حلق پھاڑ کر چیختی ہوئی بولی۔ "بکواس مت کرو، کیا تمہیں کسی ماں نے جنم نہیں دیا ہے؟ تم کسی ماں کے بیٹے نہیں ہو تمہاری ماں کے اور تمہارے بارے میں ایسی باتیں کی جائیں گی تو کیا تم سن سکو گے؟"

وہ بولا۔ "میری ماں میرے باپ کے ساتھ رہتی ہے اور اگر میرا باپ نہ ہوتا تو میں کبھی ماں کے ساتھ کبھی ایک مکان میں ایک کمرے میں نہ سوتا۔ اگر وہ جوان ہوتی تو اسے شادی کرنے کی اجازت دیتا میں شادی کر کے بھولے آتا لیکن تمہاری طرح ایک بیٹے کے ساتھ کبھی بدنام نہ ہوتا۔"

میں تمہاری فضول باتیں سننے نہیں آئی ہوں۔ مجھے میرے بیٹے سے ملاؤ۔"

"ابھی ملاتا ہوں۔"

اس نے موبائل پر نمبر پنچ کیے پھر اسے کان سے لگا کر سننے لگا تھوڑی دیر بعد رابطہ ہوتے ہی بولا۔ "ہیلو فاخر! میں آصف خان بول رہا ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ تھوڑی دیر بعد تجھے اپنے پاس آنے اور گڑگڑانے پر مجبور کر دوں گا۔ یہ تو پہلے اپنی ماں سے بات کرو۔"

اس نے موبائل فاخرہ کے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے فاخر نے کہا۔ "ہیلو امی! کیا میری آواز سن رہی ہیں؟"

وہ تڑپ کر بولی۔ "ہاں بیٹے! کل سے تمہاری آواز سننے کو ترس رہی ہوں تم کہاں ہو؟ مجھے بتایا گیا تھا کہ اس مکان میں ہو۔ اس لیے تم سے ملنے یہاں آئی ہوں لیکن یہاں تو مجھے غنڈے بدمعاش دکھائی دے رہے ہیں اور ایسی باتیں کر رہے ہیں جو ایک ماں کے لیے بہت بڑی گالیاں ہوا کرتی ہیں۔"

وہ پریشان ہو کر بولا۔ "امی تم وہاں کیوں چلی گئیں وہ میرے دشمن ہیں، میری جان لینا چاہتے ہیں۔ مجھے پکڑنے اور قتل کرنے کے لیے آپ کو دھوکا دے کر وہاں بلایا گیا ہے۔"

"بیٹے اگر ایسی بات ہے تو تم یہاں کبھی نہ آنا۔"

"میں نہیں آؤں گا تو وہ تمہیں جان سے مار ڈالیں گے۔"

"تم میری پرواہ نہ کرو۔ میں تمہیں قسم دیتی ہوں، مجھ پر قیامت بھی آ جائے تو یہاں کبھی نہ آنا۔"

آصف خان نے فون اپنے کان سے لگا کر پوچھا۔ "کیا خیال ہے؟ ماں کی بات مانے گا اور یہاں نہیں آئے گا؟"

وہ غرا کر بولا۔ "میری امی کو وہاں سے جانے دو۔ اگر ان پر ذرا سی بھی آنچ آئے گی تو میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا؟"

"میں کب کہتا ہوں مجھے زندہ چھوڑ دے؟ آ، مجھے قتل کرنے کے لیے یہاں آ جا۔"

اس نے پوچھا۔ "مجھے بتاؤ کہاں ہو تم۔"

"تم جہاں بھی ہو وہاں سے نکلو۔ کھوکھرا پار کی طرف آؤ جب وہاں پہنچو تو مجھ سے فون پر رابطہ کرو۔ میں تمہیں یہاں کا صحیح پتا ٹھکانا بتاؤں گا۔"

ایسے وقت فاخرہ چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی۔ "نہیں فاخر! تمہیں میری قسم ہے، یہاں کبھی نہ آنا۔ میں تمہیں منع کر رہی ہوں۔ میری پرواہ نہ کرو۔ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔"

وہ بولتی جا رہی تھی۔ آصف خان نے فون بند کرتے ہوئے کہا۔ "خواہ مخواہ چیخ رہی ہو۔ تمہاری آواز بیٹے تک نہیں پہنچے گی۔ تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ تمہارے بیٹے نے جس شخص کو قتل کیا ہے، میں اسی مقتول کا بھائی ہوں۔ خون کا بدلہ خون ہوتا ہے۔ میں اپنے بھائی کے قتل کا انتقام ضرور لوں گا۔ اسے تمہارے سامنے گولی ماروں گا۔"

وہ چیختی ہوئی اس کے قریب آئی پھر دونوں ہاتھوں سے اسے مارنے لگی۔ اس نے ہنستے ہوئے اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ لیا پھر بازوؤں میں بھر کر بولا۔ ''ہائے! کیا غضب کی چیز ہو۔ بیٹے کے آنے تک میرا دل خوش کر سکتی ہو۔''

وہ خود کو اس سے چھڑانے کی کوششیں کرنے لگی لیکن اس کے مقابلے میں کمزور تھی۔ اپنے بچاؤ کے لیے چیخنے چلانے لگی۔ اس نے منہ پر ایک ہاتھ مارا پھر اس کی پٹائی کرتا چلا گیا۔

''سالی! سیدھی طرح مان جا۔ تیری چیخ و پکار سن کر یہاں کوئی نہیں آئے گا۔ اس کتے نے میرے بھائی کو قتل کیا ہے۔ میں اس کی ماں کی دھجیاں اُڑا دوں گا۔''

اس مکان میں دو کمرے تھے دونوں کے دروازے بند تھے۔ دوسرے کمرے میں راشد سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا اور فاخرہ کی چیخیں سن رہا تھا۔ اس کی چیخیں دل میں گھونسے کی طرح لگ رہی تھیں۔ وہ دھوکا دے کر اسے وہاں لایا تھا۔ اس سے کہا گیا تھا کہ بیٹے کو پھانسنے کے لیے ماں کو صرف چارہ بنایا جائے گا۔ اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا لیکن اب جیسی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں، انہیں سن کر اس نے شرم سے سر جھکا لیا تھا۔

اس کمرے میں اور دو ساتھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ ''آصف خان گنگا نہا رہا ہے۔ اس گنگا میں ہم بھی ہاتھ دھوئیں گے۔''

راشد نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے غصے سے کہا۔ ''کیا بکواس کر رہے ہو۔ کچھ تو شرم کرو۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے میری ماں کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہو۔ آصف بھائی کو ایسا نہیں کرنا چاہیے۔''

دوسرے نے کہا۔ ''ابے! چپ چاپ بیٹھ جا۔ آصف بھائی کے سر پر خون سوار ہے۔ ہماری پارٹی جیت گئی ہے۔ جیت کا نشہ بھی ہے۔ تو اس کے دشمن کی ماں کی حمایت کرے گا تو وہ تیری ماں کو بھی......''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے راشد نے چیخ کر کہا۔ ''خبردار! میری ماں کے بارے میں کچھ کہا تو۔''

وہ جیب سے ریوالور نکالنے لگا۔ اس سے پہلے ہی ان دونوں نے اپنے ہتھیار نکال لیے۔ اسے گن پوائنٹ پر رکھ کر کہا۔ ''خبردار! اگر ذرا بھی حرکت کی تو سالے! کتے کی موت مارا جائے گا۔''

ایک نے آگے بڑھ کر اس کے لباس کے اندر سے ریوالور نکال لیا پھر ایک لات

مارتے ہوئے بولا۔ ''چل جا یہاں سے۔''

اس نے بے بسی سے ان دونوں کے ہاتھوں میں ریوالور دیکھے پھر وہاں سے سر جھکا کر دروازہ کھولتا ہوا باہر چلا گیا۔ دوسرے کمرے میں خاموشی چھا گئی تھی۔ کبھی کبھی فاخرہ کے سسکنے اور آہیں بھرنے کی آوازیں آتی تھیں پھر آصف خان کی آواز سنائی دی وہ فون پر کہہ رہا تھا۔

''ہاں فاخر! بول کہاں ہے؟''

فاخر نے کہا۔ ''میں کھوکھراپار پہنچ گیا ہوں۔ مجھے پتا بتاؤ۔''

اس نے فون کو فاخرہ کے منہ کے پاس رکھا۔ اس کے منہ سے کراہیں نکل رہی تھیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''بیٹے خدا کے لیے یہاں نہ آؤ۔''

آصف خان نے فون کو کان سے لگا کر ہنستے ہوئے کہا۔ ''آؤ اور اپنی ماں کی زندہ لاش دیکھو، یہ زندہ ہے لیکن اب کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہی ہے۔''

فاخر نے چیخ کر پوچھا۔ ''اگر تُو نے میری ماں سے کوئی بدتمیزی کی ہو گی تو میں تمہیں کتے کی موت ماروں گا۔''

''پہلے یہاں تو آ جا پھر مجھے مارنے کی بات کرنا۔ تیرے آنے تک ہم یہاں عیش کر رہے ہیں۔ میں تو کر چکا ہوں۔ اب میرے اور تین ساتھی بھی خرمستی کرتے رہیں گے۔''

اس نے اس مکان کا پتا بتا کر فون بند کر دیا۔ فاخر دوسری طرف چیخ رہا تھا۔ وہ ایک ٹیکسی میں وہاں تک آیا تھا پھر وہاں سے دوڑتا ہوا اس بستی کی طرف جانے لگا جہاں کا پتا اسے بتایا گیا تھا۔ وہ بستی وہاں سے بہت دور تھی۔ کچا راستہ تھا۔ ٹیکسی والے نے آگے جانے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے فون پر جو کچھ سنا تھا اس کے بعد دماغ غصے سے پھٹ رہا تھا۔ ان لمحات میں وہ ساری دنیا کو آگ لگا دینا چاہتا تھا لیکن پہلے اپنی ماں تک پہنچنے کے لیے تڑپ رہا تھا۔ ایک سمت تیزی سے دوڑتا جا رہا تھا۔

بہت دیر ہو چکی تھی۔ فاخرہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ آصف نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ ''اس سالی کو باہر لے جا کر کہیں پھینک دو۔ ہمیں چارہ ڈالنا تھا، ڈال چکے۔ اب شکار یہاں کھنچا چلا آ رہا ہے۔''

راشد باہر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''آصف بھائی! اسے میرے حوالے کر دو۔''

اس کے ساتھیوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ سالا اسے اپنی ماں کہہ رہا ہے۔''

آصف خان نے کہا۔ ''اسے یہاں سے لے جانے دو۔ یہ سالی ہوش میں آئے گی تو چیخ چیخ کر بیٹے کو ہمارے قریب آنے سے روکتی رہے گی۔''

ایک نے پوچھا۔ ''آصف بھائی! اسے ختم کیوں نہیں کر دیتے۔''

راشد نے آگے بڑھتے ہوئے انکار میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ''نہیں آصف بھائی! اسے چھوڑ دو میں جیپ میں اسے لے جاتا ہوں پھر گھر پہنچا کر گاڑی واپس لے آؤں گا۔''

آصف خاں نے ساتھیوں سے کہا۔ ''اسے جیپ میں ڈال دو، یہاں سے جانے دو۔ وہ دشمن ادھر آتا ہوگا۔''

فاخرہ کو جیپ کے پچھلے حصے میں ڈال دیا گیا۔ راشد اس جیپ کو ڈرائیو کرتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ انہوں نے اس مکان کی تمام لائٹس بجھا دیں۔ ان میں سے ایک چھت پر چلا گیا۔ باقی دو الگ الگ کمروں میں جا کر کھڑکیاں اور دروازے بند کر کے بیٹھ گئے۔

وہ بستی اس لیے ویران تھی کہ وہاں زندگی کی بنیادی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔ صرف بجلی وہاں تک پہنچی ہوئی تھی۔ دور دور فاصلے پر بنے ہوئے مکان تاریکیوں میں ڈوبے ہوئے تھے۔ کوئی اسٹریٹ لائٹ نہیں تھی۔ باہر دور تک تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔ تاریکی میں بیٹھے ہوئے وہ تینوں شکاری کسی حد تک اندھیرے میں ذرا دور تک دیکھ سکتے تھے۔

وہ دیکھ رہے تھے اور طویل انتظار کے باعث بے چین ہو رہے تھے۔ آصف خان نے فون کے ذریعے رابطہ کیا۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ شکار اب تک پہنچا کیوں نہیں ہے؟ کیا وہ راستے سے بھٹک گیا ہے؟ اگر ایسا ہے تو وہ اسے صحیح پتا بتائے گا لیکن رابطہ کرنے پر پتا چلا کہ دوسری طرف سے اس نے فون کو بند کر دیا ہے۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ فون اچانک خراب ہو گیا ہے؟ بیٹری ڈاؤن ہو گئی ہے؟ یا اس نے جان بوجھ کر فون کو بند کیا ہے؟ اسے خطرے کا احساس ہو رہا تھا۔ کچھ بھی ہو، اگر فون خراب تھا، تب بھی اسے بہت پہلے وہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔ اس نے صحن میں آ کر چھت پر بیٹھے ہوئے ساتھی سے پوچھا۔ ''کیا وہ نظر آ رہا ہے؟''

''نہیں آصف بھائی! دور دور تک کوئی دکھائی نہیں دے رہا ہے۔''

''وہ اندھیرے میں چھپ چھپ کر آ سکتا ہے۔''

''کیسے چھپے گا۔ مکانات دور دور ہیں۔ آس پاس کوئی درخت نہیں ہے چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں ہیں اگرچہ اندھیرا ہے مگر اتنا بھی نہیں ہے۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔''

آصف خان نے جھنجلا کر کہا۔ ''وہ کتے کا بچہ کہاں مر گیا ہے؟ کیا اپنی ماں سے ملنے نہیں آئے گا؟''

دوسرے ساتھی نے کمرے سے نکل کر کہا۔ ''شاید اسے معلوم ہو گیا ہے کہ اس کی ماں یہاں سے چلی گئی ہے۔ اس لیے وہ ادھر نہیں آ رہا ہے۔''

چھت پر سے اس کے ساتھی نے کہا۔ ''میرا بھی یہی خیال ہے۔ اسے یہاں اپنی جان کا خطرہ ہے۔ جانتا ہے کہ یہاں سے زندہ واپس نہیں جائے گا۔ اس لیے ماں سے ملنے گھر کی طرف گیا ہوگا۔''

''وہ کتا اپنے گھر میں چھپ کر ہم سے نہیں بچ سکے گا۔ ہم ابھی وہاں جائیں گے۔ تھوڑی دیر اور انتظار کر لیتے ہیں۔''

وہ انتظار کرتے رہے۔ پریشان بھی ہوتے رہے اور بیزار بھی ہوتے رہے۔ اس کے ساتھی نے چھت پر سے اُترتے ہوئے کہا۔ ''فضول ہے۔ یہاں دور تک تاریکی میں کوئی نظر نہیں آ رہا ہے اور وہ اتنا احمق نہیں ہے کہ اپنی جان دینے کے لیے ہم تینوں سے مقابلہ کرنے آئے گا۔''

دوسرے ساتھی نے کہا۔ ''آصف بھائی! میں بھی یہی کہتا ہوں۔ وہ سالا بہت چالاک ہے۔ خواہ مخواہ مرنے کے لیے نہیں آئے گا۔ ہمیں وہاں جانا ہوگا۔''

وہ تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر بولا۔ ''فیقے! پہلے تُو باہر جا۔ ذرا دور تک جا کر اطمینان کر لے کہ وہ آس پاس نہیں ہے۔''

فیقے نے کہا۔ ''میں اوپر چھت سے دیکھ رہا تھا۔ یہاں کوئی نہیں ہے۔ تمہاری تسلی کے لیے جاتا ہوں۔''

وہ سب صحن سے چلتے ہوئے کمرے میں آئے پھر اگلا دروازہ کھول کر فیقہ باہر چلا گیا۔ دروازے کو بند کر دیا گیا۔ وہ دونوں کھڑکی کھول کر جھانکنے لگے۔ اندھیرے میں کچھ دور تک دکھائی دے رہا تھا پھر وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کی آواز سنائی دی۔

''آصف بھائی! کوئی نہیں ہے۔ آجاؤ وہ کتا اپنے گھر میں ملے گا۔''

وہ دونوں باہر آ گئے۔ انہیں نے باہر سے دروازے کو بند کیا۔ اس پر تالا ڈالا۔ آصف

نے اس کی چابیاں اپنے ساتھی کو دیتے ہوئے کہا۔ ''ہم ذرا دور دور تک ہو کر آگے پیچھے دیکھتے چلیں گے۔''

پھر وہ ایک طرف بڑھتے ہوئے اونچی آواز میں بولا۔ ''فیقے! تم ادھر کچے راستے پر چلے جاؤ۔ ہم وہیں آ رہے ہیں۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی ٹھائیں سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ اس کے ساتھ ہی ایک ساتھی کی چیخ ابھری، وہ اچھل کر زمین پر گر پڑا۔ خطرے، خوف اور دہشت سے آصف خان کا بدن گرم ہو گیا۔ خون تیزی سے گردش کرنے لگا۔ اس نے پلٹ کر دوبارہ مکان کے اندر چھپنے کے لیے دوڑ لگائی۔ دروازے پر پہنچ کر دیکھا تو تالا پڑا ہوا تھا۔ اس کی چابی اس ساتھی کے پاس تھی جو گولی کھا کر مر چکا تھا۔

وہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ کہیں جائے پناہ نہیں تھی۔ آس پاس کھلی جگہ تھی مکان دور دور پر تھے۔ دس بارہ گز کے فاصلے تک کچھ کچھ دکھائی دیتا تھا اس کے بعد تاریکی ہی تاریکی تھی۔ یہ معلوم نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ گولی چلانے والا تاریکی میں کہاں چھپا ہوا ہے؟

دوسری گولی اس کی طرف آ سکتی تھی۔ وہ دروازے کے پاس سے ہٹ کر دیوار سے لگ کر چلتا ہوا مکان کے پچھلے حصے کی طرف جانے لگا۔ اسی وقت فائرنگ کی آوازیں سنائی دیں۔ پہلے ایک گولی چلی پھر دوسری، یہ سمجھ میں آیا کہ فاخر اور فیقے کے درمیان فائرنگ کا تبادلہ ہو رہا ہے پھر اندھیرے میں دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔

آصف خان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا کوئی اس کی طرف دوڑتا آ رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی نشانہ لگا کر گولی چلائی۔ جواباً فیقے کی چیخ سنائی دی۔ فاخر کی دہشت ایسی طاری ہوئی تھی کہ اس نے دھوکے میں اپنے ہی ساتھی کو گولی مار دی۔ ایسی بدحواسی نے اسے اور زیادہ خوف زدہ کر دیا۔ اس کے دونوں ساتھی مارے گئے تھے۔

وہ مکان کی دیوار سے لگ کر گہری گہری سانسیں لیتے ہوئے کبھی اِدھر کبھی اُدھر دیکھنے لگا۔ دونوں ہاتھ ریوالور کے دستے پر سختی سے جمے ہوئے تھے۔ انگلی ٹریگر پر رکھی ہوئی تھی پھر وہ ایک دم سے اچھل کر ذرا دور چلا آیا۔ جہاں وہ کھڑا ہوا تھا وہیں دیوار پر ایک پتھر آ کر لگا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے فاخر اس کے سر پر پہنچ گیا ہے۔ گھبراہٹ میں اس کی انگلی ٹریگر پر دبتی چلی گئی۔ فائرنگ کی گونجتی ہوئی آوازوں کے ساتھ دو چار گولیاں چلیں پھر

خاموشی چھا گئی۔

وہ دوڑتا ہوا پھر اس مکان کی طرف جانے لگا۔ مکان کے پچھلے حصے کی طرف جھاڑیاں تھیں۔ وہ ان جھاڑیوں میں جا کر چھپنا چاہتا تھا۔ اسی وقت ٹھائیں کی آواز کے ساتھ اس کی پشت پر ایک گولی لگی۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گر پڑا۔ ہاتھ سے ریوالور چھوٹ کر دور چلا گیا۔ ابھی اس میں جان تھی۔ اس نے کراہتے ہوئے کروٹ بدل کر دور پڑے ہوئے ریوالور کی طرف دیکھا۔ وہ اتنا دور بھی نہیں تھا۔ کھسکتا ہوا وہاں تک پہنچ سکتا تھا۔ بشرطیکہ موت اسے پہنچنے دیتی۔

موت کا ہرکارہ تاریکی سے نکل کر اس کے اور ریوالور کے درمیان آ گیا۔ وہ غصے سے کانپتے ہوئے گرجتے ہوئے اس کے منہ پر ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔ ''کتے! تیری ماں نے تجھے اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا۔ ماں تو سبھی کی محترم ہوتی ہے لیکن آج تُو نے ایک ماں کی کوکھ کی دھجیاں اڑا دیں۔ کتے کمینے۔''

وہ غصے سے جیسے پاگل ہو گیا۔ اس کے منہ پر جوتوں سے ٹھوکریں مار رہا تھا پھر اچھل کر اس کے جسم کے اس حصے پر کھڑا ہو گیا، جہاں گولی لگی تھی۔ وہ ایک کے بعد دوسری سانس نہ لے سکا۔ اس کا منہ کھلا رہ گیا۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ ان آنکھوں سے دنیا ہمیشہ کے لیے بجھ گئی تھی اور وہ کھلا ہوا منہ آئندہ کبھی اپنی ماں کو بھی ماں نہیں کہہ سکتا تھا۔

یہ بھی کیا دنیا ہے؟ یہاں انسان پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن انسانیت پیدا نہیں ہوتی۔ اتنی بڑی دنیا میں ہر جگہ بے حیائی کے باعث انسانیت کا جنازہ نکلتا رہتا ہے۔ کیا دنیا کے تمام لوگ یکجا ہو کر آپس میں سر جوڑ کر یہ معاہدہ نہیں کر سکتے کہ ہم ہر طرح کی بے حیائی کریں گے لیکن جہاں سے ہماری تخلیق ہوتی ہے ہم وہاں کی آبرو ضرور رکھیں گے۔ ایسا کب ہو گا کہ ہماری دنیا میں ماں بھی محفوظ رہ سکے؟

صبح ہونے والی تھی۔ گھر کے دروازے پر راشد سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر فاخر کو دیکھا پھر رونے لگا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ ماں صحن کے فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ دیدے پھاڑ پھاڑ کر آسمان کو تک رہی تھی۔ اس نے سر گھما کر بیٹے کو دیکھا پھر اسے دیکھتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ اس کے پاس آ کر فرش پر بیٹھ گیا پھر اس کے پاس لیٹ گیا۔ بڑے کرب سے بولا۔ ''تُو نے مجھے ایسی دنیا میں کیوں پیدا کیا، جہاں ایک بیٹا اپنی ماں کے ساتھ سو نہیں سکتا؟''

وہ روتے ہوئے بولی۔ ''میں خود حیران ہوں کہ ایسی دنیا میں کیوں پیدا ہوئی، جہاں عورت ایک مرد کے بغیر سلامتی اور نیک نامی سے زندگی نہیں گزار سکتی۔ میں تو شرم سے کب کی مرجاتی مگر تیری آہٹ پر کان لگے ہوئے تھے۔''

اس نے ریوالور کی نال ماں کے سینے پر رکھ دی پھر کہا۔ ''ہم اس دنیا سے بے حیائی ختم نہیں کر سکتے لیکن حیا سے مر تو سکتے ہیں۔ تُو نے یہاں سے مجھے دودھ پلایا تھا۔ کیوں پلایا تھا؟''

ٹھائیں کی ایک آواز کے ساتھ گہری خاموشی چھا گئی۔ فجر کی اذان ہو رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی دوسری بار گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ مسجد کی طرف جانے والے نمازی ٹھٹک گئے۔ آس پاس کے گھروں سے آوازیں آنے لگیں۔ ایک تجسس تھا کہ گولیاں کہاں چل رہی تھیں؟ کسی بوڑھی خاتون نے کہا۔ ''فاخرہ کے گھر سے آواز آئی ہے۔''

دو چار عورتیں اور مرد اس کے دروازے پر آنے لگے۔ دروازے پر راشد سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر اندر کی طرف اشارہ کیا۔ صحن کا دروازہ کھلا ہوا تھا وہ سب اندر آ کر صحن میں پہنچتے ہی ٹھٹک گئے۔ ماں بیٹے ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے ابدی نیند سو رہے تھے۔ ان کا لہو ایک دوسرے سے گڈمڈ ہو کر فرش پر بہہ رہا تھا۔

محلے والوں کی بھیڑ لگ رہی تھی۔ اس بھیڑ میں سے دو عورتیں توبہ توبہ کرتی ہوئی دروازے سے باہر آئیں۔ ایک نے کہا۔ ''ایسی بھی کیا بے حیائی ہے۔ مرتے وقت تو الگ ہو جاتے۔''

☆======☆======☆

ایک کلی گلاب کی

ایک جانب گھر کی جنت ہے، دوسری جانب وہ خندق ہے جس میں پہلی اور آخری بار گرنا ہے۔ پھر اپنی جنت کی طرف لوٹ کر نہیں آنا ہے...... ابھی تو میں سانس لے رہی ہوں۔ یہ سانسیں میں پچھلے ساٹھ برس سے لے رہی ہوں۔ دکھ اور بیماری میں انسان کتنا جیئے گا؟ سو بیماریوں کی ایک بیماری بڑھاپا ہے۔ بچپن میں سبق یاد نہ ہوتا تو سزا کے طور پر حکم دیا جاتا تھا کہ کان پکڑ کر اٹھتے بیٹھتے رہو۔ بڑھاپے میں اٹھتے بیٹھتے وقت کمر پکڑنا یوں لازمی ہو گیا تھا۔ جیسے جینے کی سزا پا رہے ہوں۔ کبھی کمر میں درد، کبھی سر میں درد، کبھی گھٹنے جواب دے دیتے ہیں۔ سوکھی ہڈیاں درد کی آماجگاہ بن جاتی ہیں...... بے شک زندگی کا اختتام بڑا ہی دردناک ہوتا ہے۔

یاسر کی آواز سنائی دی۔ ''پھوپھی اماں! میرا وہ بلیڈ کا پیکٹ کہاں ہے؟ ابھی میں نے میز پر رکھا تھا۔''

وہ بولتا ہوا میرے کمرے میں آیا۔ میں نے کہا۔ ''تمہاری چیز ہے تم جانو۔ میں کیا شیو کرتی ہوں جو مجھ سے پوچھ رہے ہو؟''

وہ میرے پاس بیٹھ کر مجھے دونوں بازوؤں میں جکڑتے ہوئے بولا۔ ''پھوپھی اماں! آپ ہی آنکھیں میچ میچ کر جھاڑو پونچھا کرتی ہیں۔ آدھا کچرا گھر میں چھوڑ دیتی ہیں اور گھر کا آدھا سامان باہر پھینک دیتی ہیں۔''

''اب ایسا بھی نہیں ہے۔ کیوں مذاق اُڑاتا ہے لڑکے......؟ تیری ماں کی ایک بالی کچرے کے ساتھ باہر پھینک دی تھی۔ تب سے سارا گھر مجھے بدنام کرتا رہتا ہے۔''

وہ مجھے چومتے ہوئے بولا۔ ''آپ تو سنجیدہ ہو گئیں۔ میں نے کئی بار ممی ڈیڈی سے کہا ہے، آپ سے گھر کا کام نہ کروائیں۔ آپ میری پھوپھی اماں ہیں۔ کوئی ماسی نہیں ہیں۔''

"وہ بھی کیا کریں بیٹے! ماسی چھٹیاں کرتی رہتی ہے۔ اب گھر کا کام میں نہیں کروں گی تو کون کرے گا؟"

"یہاں ہماری بھابھی جان ہیں، ممی ہیں سب ہی مل کر کام کرسکتی ہیں۔"

میں نے کمر پکڑ کر اٹھتے ہوئے کہا۔ "ارے کیوں میرے لئے سب سے لڑتا پھرتا ہے؟ میں تو مقدر کا لکھا پورا کررہی ہوں۔ یہاں بیٹھ۔ میں باہر جا کر کچرے میں دیکھتی ہوں۔"

میں ٹھہر ٹھہر کر چلتی ہوئی کمرے سے باہر آگئی۔ وہ کمرہ کیا تھا، ایک چھوٹا سا اسٹور روم تھا۔ میرے لئے وہاں ایک چارپائی ڈال دی گئی تھی۔ گھر کا کاٹھ کباڑ بھی ادھر رکھا جاتا تھا۔ میں بھی ٹوٹی پھوٹی تھی۔ گھر کے فالتو سامان کی طرح تھی۔ وہیں پڑی رہتی تھی۔

اسٹور روم کا وہ دروازہ پچھلی گلی میں کھلتا تھا۔ وہ گلی بہت ہی کشادہ اور صاف ستھری تھی۔ ہر کوٹھی کے پچھلے دروازے پر ایک بڑا سا ڈسٹ بن رکھا ہوا تھا۔ میں اس کچرے دان میں آکر جھک گئی۔ ایک چھوٹی سی لکڑی اُٹھا کر کچرے کو اِدھر سے اُدھر ہٹا کر بلیڈ کا پیکٹ تلاش کرنے لگی۔

بڑی بدبو اٹھ رہی تھی۔ مگر مجھے گھن نہیں آتی۔ زندگی میں اتنی غلاظتیں دیکھی ہیں۔ ایسے کچرا دماغ بھائی اور بھاوج کے ساتھ رہتی آئی ہوں کہ بدترین حالات سے سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا ہے۔

یاسر نے ٹھیک کہا تھا، میں آنکھیں میچ میچ کر دیکھتی ہوں تو ذرا صاف دکھائی دیتا ہے۔ ورنہ دن رات یہ دنیا میرے آگے دھندلائی رہتی ہے۔ میں نے ڈسٹ بن پر بدستور جھکے ہوئے ایک ذرا سر گھما کر دیکھا تو کچھ فاصلے پر ایک دھندلا سا شخص دکھائی دیا۔ وہ چھڑی ٹیکتا ہوا آرہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ کوئی بڑے میاں چلے آرہے ہیں۔ میں پھر کچرے کو کریدنے لگی۔

وہ قریب آکر رک گئے۔ اپنی چھڑی سے ڈسٹ بن کو بجاتے ہوئے بولے۔ "یہاں کیا کررہی ہو؟"

میں جھکی ہوئی تھی۔ سیدھی ہوتے ہوئے بولی۔ "کچھ بھی کررہی ہوں۔ آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟"

"میں نے کئی بار دیکھا ہے، تم اس دروازے سے باہر آتی ہو کچرا پھینکتی ہو اور چلی جاتی ہو۔ کیا یہاں نوکری کرتی ہو؟"

مجھے برا لگا کہ وہ حضرت مجھے نوکرانی سمجھ رہے تھے۔ میں نے ذرا تن کر کہا۔ "میں

نوکری وکری نہیں کرتی۔ یہ میرے بھائی جان کی کوٹھی ہے۔ انہوں نے پورے ایک کروڑ بیس لاکھ میں خریدی ہے۔"

بڑے میاں اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "ہاں۔ ایک ماہ پہلے یہ خالی تھی۔ میرا جی چاہتا تھا، کسی سے معلوم کروں کہ تم لوگ کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟"

وہ بول رہے تھے اور گہری نظروں سے مجھے یوں دیکھ رہے تھے، جیسے بھولے ہوئے چہرے کو پہچاننا چاہتے ہوں یا مجھ سے دوستی کا ارادہ ہو۔ اب میں اس عمر میں یہ تو نہیں سوچ سکتی تھی کہ بڑے میاں کی نیت ایسی ویسی ہوسکتی ہے۔

ہاں۔ مگر ایک بات تھی، ان کی آواز اور لب ولہجہ میرے دل کو دھڑکا رہا تھا۔ مجھے ماضی کی طرف لے جارہا تھا۔ میں نے آنکھیں سکیڑ کر انہیں اچھی طرح دیکھنے کی کوشش کی۔ وہ بولے۔ "تم...... ! مجھے ایسا لگتا ہے، جیسے تم ناز آفریں ہو...... سوری۔ میں بس یونہی کہہ رہا ہوں۔ مجھے ایسا لگ رہا ہے۔"

ان کی زبان سے اپنا نام سن کر دل یکبارگی زور زور سے دھڑکنے لگا۔ انہوں نے میرا نام لے کر اس بات کی تصدیق کردی کہ میرا دل، میرا دماغ انہیں ان کی آواز اور لب ولہجے سے پہچان رہا ہے۔ میں نے بڑی حیرانی سے تڑپ کر پوچھا۔ "آ...... آپ...... ! جمال ہیں؟ آپ...... زندہ...... زندہ ہیں؟"

وہ لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے گئے۔ اگر زمین پر چھڑی نہ ٹیکتے تو گر جاتے۔ میں نے ایک ہاتھ سے ڈسٹ بن کا سہارا لیا۔ دوسرے ہاتھ سے کمر پکڑ لی۔ ان کی آواز اور لب ولہجہ سن کر آنکھوں سے دیکھ کر بھی یقین نہیں ہورہا تھا۔ "یااللہ! یہ کیا ماجرہ ہے؟ کیا یہ کوئی معجزہ ہے؟ جمال قیامت سے پہلے جی اٹھے ہیں؟"

دروازے کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ میں وہاں بیٹھ گئی۔ انہیں دیکھ کر یوں ہانپنے لگی، جیسے پچھلے ساٹھ برسوں سے دوڑتی آرہی ہوں۔ اب منزل تک پہنچ کر گرتے گرتے بیٹھ گئی ہوں۔

ہمارے درمیان کچھ فاصلہ تھا۔ وہ ڈسٹ بن کے اُس پار تھے اور میں اِس پار...... ہم برسوں سے ندی کے دو کنارے بنے ہوئے تھے۔ مقدر نے ندی کا پاٹ اتنا چوڑا کردیا تھا کہ ہم ایک دوسرے کو کبھی دیکھ نہ سکے...... کیا ستم ظریفی ہے کہ اب دیکھنے کا موقع مل رہا تھا تو بڑھاپے نے نظر دھندلادی تھی۔

ان لمحات میں عجیب سی حالت ہوگئی تھی۔ دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ مجھے یقین ہو جائے یا کوئی مجھے یقین دلائے، میرے سامنے جمال زندہ سلامت کھڑے ہیں۔ کیا ہوا کہ وہ جوانی نہیں رہی؟ زندگی نے اچھی طرح نچوڑ ڈالنے کے بعد انہیں میرے سامنے بھیجا ہے۔ پھر بھی پہچانے تو جا رہے ہیں۔ بس اس پہچان پر تصدیقی مہر لگ جائے۔

وہ چھڑی ٹیکتے ہوئے لرزتے قدموں سے چلتے ہوئے میرے سامنے آگئے۔ بڑے ہی جذباتی لہجے میں بولے۔ ''مجھے بڑھاپے کا زنگ لگ گیا ہے۔ پہلے جیسی یادداشت نہیں رہی۔ نظر بھی کمزور ہوگئی ہے لیکن آنکھیں جتنا دکھا رہی ہیں۔ تمہیں پہچاننے کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ ہم دونوں کو ایک دوسرے کے نام، آواز اور لب و لہجے بھی یاد ہیں۔''

انہوں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ''آہ..... تم میرے لئے اور میں تمہارے لئے مر چکا تھا۔ ہم صِفر ہو گئے تھے۔ پھر بھی ہماری یادیں ایک دوسرے کو پکارتی رہی تھیں۔ ہماری صدائیں ایک دوسرے کے اندر گونجتی رہی تھیں۔''

میری آنکھیں خوشی سے بھیگ رہی تھیں۔ یقین ہو رہا تھا کہ جو سامنے ہے۔ وہی سچ ہے۔
انہوں نے چبوترے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا میں یہاں بیٹھ سکتا ہوں؟''

میں نے جھجکتے ہوئے دائیں بائیں دیکھا۔ شرم آ رہی تھی کہ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا؟

انہوں نے کہا۔ ''ہم بدنام ہونے والی جوانی کو بہت پیچھے چھوڑ چکے ہیں۔ عمر کی اس منزل پر ہیں، جہاں ایک ساتھ بیٹھنے والے بوڑھوں کو کوئی بدنام نہیں کرتا۔''

وہی پہلے جیسی عادت تھی۔ انہوں نے پہلی بار مجھ سے پوچھا تھا۔ ''کیا میں تمہیں چُھو سکتا ہوں؟''

اور میری اجازت سے پہلے ہی مجھے چُھو لیا تھا۔ حاکم بننے والوں کی عادتیں نہیں بدلتیں۔ اب بھی یہی ہوا۔ انہوں نے میرے پاس بیٹھنے کی اجازت مانگی۔ مگر اجازت ملنے سے پہلے ہی میرے پاس یوں آ کر بیٹھ گئے۔ جیسے اپنا حق حاصل کر رہے ہوں۔ پچھلا قرض وصول کر رہے ہوں۔ پہلے کی بات اور تھی۔ مگر اب ہم بزرگ کہلانے لگے تھے۔ کچھ تو اخلاقی پابندیوں کا پاس رکھنا چاہئے تھا۔ ہماری مشرقی تہذیب کسی بوڑھے اور بوڑھی کو بھی تنہائی میں یوں پاس پاس بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتی۔

میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''کوئی دیکھ لے گا......''

میں وہاں سے اٹھنے لگی۔ انہوں نے بازو پکڑ کر بٹھا دیا۔ سخت لہجے میں پوچھا۔ ''کون

دیکھے گا؟ اس دنیا سے ڈرتی ہو۔ جس نے ہماری جوانی ہم سے چھین لی۔ لاعلمی کے اندھیروں میں بھٹکا کر ہماری زندگی کے چھتیس برس چرا لئے......؟''

میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''لیکن یہ سب کیسے ہو گیا؟ آپ تو ایک حادثے میں اپنے والدین کے ساتھ ہلاک ہو گئے تھے۔ تمام رشتے داروں نے آپ کی موت کی تصدیق کی تھی؟''

وہ چھڑی کے ہتھے پر اپنی ٹھوڑی ٹیکتے ہوئے بولے۔ ''کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے۔ کسی بات کو یا کسی واقعے کو سچ مان لیا جاتا ہے۔ بعد میں وقت سمجھاتا ہے کہ جیسا ہم سمجھ رہے تھے۔ ویسا نہیں تھا، بلکہ ایسا تھا جواب سمجھ میں آ رہا ہے۔''

میں ان کا منہ تک رہی تھی۔ وہ بول رہے تھے۔ عمرِ رفتہ کو آواز دے رہے تھے اور میں سن رہی تھی۔

☆======☆======☆

اب سے چالیس برس پہلے جمال میری زندگی میں آئے تھے۔ پہلے تو میں تذبذب میں رہی۔ ''کیا مجھے ان کی طرف مائل ہونا چاہئے؟''

مسئلہ یہ تھا کہ ان کے والد مراد شاہ اور میرے والد افضل حیات کے درمیان کاروباری دشمنی تھی۔ ابتدا میں وہ دونوں بزنس پارٹنر تھے۔ پھر تنازعہ پیدا ہوا تو دونوں ایک دوسرے کو بے ایمان اور دغا باز کہنے لگے۔ اس طرح پارٹنر شپ کے ساتھ دوستی ختم ہوگئی اور دشمنی شروع ہوگئی۔ ان ہی دنوں جمال لندن سے آئے تھے۔ ہم دونوں نے پہلی بار ایک دوسرے کو دیکھا۔ وہ مجھے چند لمحوں تک دیکھتے رہے۔ میں نے پوچھا۔ ''ایسے کیا دیکھ رہے ہیں؟ کیا میں کوئی عجوبہ ہوں؟''

وہ لندن کے ماحول سے آئے تھے۔ بڑی بے باکی سے بولے۔ ''ہاں۔ تمہاری آنکھیں بڑی عجیب سی ہیں۔ پتہ نہیں چلتا، دیکھ رہی ہیں یا گھائل کر رہی ہیں؟''

مجھے ایسی بے باکی کی توقع نہیں تھی۔ ایک دم سے دل دھڑکنے لگا۔ تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی میں پہلی بار کسی نے کنکر پھینکا تھا۔ اک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ دائرے پر دائرے بنتے چلے جا رہے تھے۔ انہوں نے کوٹ کی اندرونی جیب سے میری ایک تصویر نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔ ''یہ مام اور ڈیڈ نے مجھے بھیجی تھی۔ کہا تھا، تم سے میرے رشتے کی بات چلانا چاہتے ہیں۔ کیا مجھے یہ لڑکی پسند ہے؟''

میری تصویر ان کے ہاتھ میں تھی اور انہیں میرے مستقبل کا فیصلہ سنانے کو کہا گیا تھا۔ یہ میرے سامنے کرنے کی بات نہیں تھی۔ میں بری طرح شرما گئی تھی۔ نظریں چرا رہی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''مجھ سے میری پسند پوچھی گئی ہے...... یہ پسند تو بہت ہی چھوٹا اور بیچارہ سا لفظ ہے۔ میں کیا بتاؤں، تمہیں دیکھتے ہی کیا سے کیا ہوگیا ہوں؟ ایک بزنس مین کا بیٹا تھا۔ اچانک شاعر بن رہا ہوں۔ شعر و شاعری کو سمجھنے لگا ہوں۔ تمہاری تصویر دیکھ کر پہلی بار یہ اچھی طرح سمجھ میں آیا کہ حسن کو چاند اور جوانی کو کنول کیوں کہتے ہیں؟ اب تمہیں رُو برو دیکھ کر غزل کہنے کو جی چاہتا ہے لیکن اناڑی ہوں۔ موزوں الفاظ کی ترتیب اور ہنر مندی سے تمہیں جیتا جاگتا تاج محل نہیں بنا سکوں گا۔''

پھر انہوں نے دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کو تھام کر کہا۔ ''اوہ گاڈ! یہاں میں تمہارا سودائی بن رہا ہوں۔ وہاں بڑے لوگوں کی سودے بازی میں جھگڑا شروع ہو چکا ہے۔ لندن سے یہاں آیا تو پتہ چلا، وہ اپنا اپنا کاروبار الگ کر رہے ہیں۔ جب لاکھوں روپے کا منافع تقسیم ہو رہا ہے تو وہ ہمیں بھی ملنے سے پہلے ہی تقسیم کر دیں گے۔''

اُف......! خدا کی پناہ۔ وہ بولتے ہی چلے جا رہے تھے۔ میرے منہ سے کچھ سننا ضروری نہیں سمجھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا، وہ میرے دل کی بات سمجھ رہے ہیں کہ میں جواباً کیا کہنا چاہوں گی؟

انہوں نے کہا۔ ''تم نے اِدھر کے ماحول میں پرورش پائی ہے۔ یہی کہنا چاہو گی کہ جہاں ماں باپ کہیں گے وہیں شادی کرو گی۔ مگر یہ مجھ پر بہت ظلم ہوگا۔ میں ہزاروں میل دور سمندر پار سے تمہارے لئے آیا ہوں۔ شاید اتنا ہینڈسم اور اسمارٹ نہیں ہوں۔ جتنا کہ ایک آئیڈیل کو ہونا چاہئے۔ پھر بھی پوچھتا ہوں، کیا تمہارا لائف پارٹنر نہیں بن سکتا؟''

وہ پہلی ہی ملاقات میں محبت، شاعری اور شادی کی طرف اتنی تیزی سے دوڑے چلے آ رہے تھے کہ میں حواس باختہ ہو رہی تھی۔ کہنا تو بہت کچھ چاہتی تھی لیکن ان کی تیز رفتاری سے ڈگمگا رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا، ان کی اتنی ساری باتوں کا جواب کیسے دوں؟ کہاں سے شروع کروں؟

ہمارے بزرگوں نے اپنے دفتر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ میرے ڈیڈ نے دوسرے حصے سے نکلتے ہوئے مجھے دیکھا تو سخت لہجے میں کہا۔ ''ناز! وہاں کیا کر رہی ہو؟ یہاں آؤ۔''

جمال نے کہا۔ ''ہمارے بزرگوں نے سرحدی لائن کھینچ دی ہے۔ تم سرحد کے اِس پار

آ گئی ہو۔ میں چاہوں گا، آئندہ اِسی پار رہنے کا فیصلہ کرو۔''

میں پلٹ کر جانا چاہتی تھی۔ انہوں نے فوراً ہی میری کلائی پکڑ لی۔ ''پلیز جواب دو۔ اگر ابھی کچھ نہیں کہہ سکتیں تو نہ سہی۔ مجھے تمہارے گھر کا اور تمہیں میرے گھر کا فون نمبر تو معلوم ہے۔''

میرے ڈیڈ نے آگے بڑھ کر گرجتے ہوئے کہا۔ ''اے! میری بیٹی کا ہاتھ چھوڑو۔ تم نے کیا سمجھ کر اس کا ہاتھ پکڑا ہے؟''

وہ میرا ہاتھ چھوڑتے ہوئے بولے۔ ''انکل! فار گاڈ سیک۔ آپس کے جھگڑوں کو ختم کرنے کی کوشش کریں۔ میں نے ڈیڈ کو بھی یہی سمجھایا ہے۔''

ڈیڈ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا باپ میرا تمام خسارہ پورا کر دے گا۔ تب بھی اس سے کوئی سمجھوتہ نہیں کروں گا۔ کیونکہ وہ قابلِ اعتماد نہیں رہا ہے۔ پکا فراڈ ہے۔''

وہ مجھے اپنے ساتھ کھینچتے ہوئے لے گئے۔ میں اُن کے ساتھ کار میں بیٹھ کر جاتے جاتے بھی جمال کو دیکھتی رہی۔ وہ دور کھڑے مجھے یوں دیکھ رہے تھے، جیسے واپس آنے کو کہہ رہے ہوں۔ ''آؤ ناز! آج نہیں تو کل آؤ۔ کل نہیں تو ایک برس بعد...... ایک صدی بعد آؤ۔ مگر میرے ہی پاس آؤ۔''

ہماری وہ پہلی ملاقات بڑی عجیب سی تھی؟ پہلے ہی مرحلے میں جدائی کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ ڈیڈی راستے بھر بڑبڑاتے رہے۔ جمال اور اس کے والد کو برا بھلا کہتے رہے۔ میں چاہتی تھی، وہ ان کے خلاف نہ بولیں۔ سمجھوتے کی کوئی راہ نکالیں۔ میں اس بات کی قائل نہیں ہوں کہ پہلی نظر میں محبت ہو جاتی ہے لیکن میں پہلی ملاقات میں متاثر ہو گئی تھی۔ ہم کسی سے بھی مختلف پہلوؤں سے متاثر ہو سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ تاثر محبت کے حوالے سے ہو۔

میں ڈیڈی کے آفس سے گھر تک اور صبح سے شام تک بہت اُلجھی رہی۔ کئی بار چاہا، ان کے بارے میں نہ سوچوں لیکن میں اپنے طور پر سوچنے سمجھنے کے اختیارات سے محروم ہو رہی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کوئی بھی دوسری بات سوچتے سوچتے ان تک کیسے پہنچ جاتی ہوں؟

اُدھر ان کی بے چینی کا اندازہ ہو رہا تھا۔ ہم شام کو لان میں چائے پی رہے تھے۔ انہوں نے فون کے ذریعے مجھے مخاطب کرنا چاہا مگر ممی نے فون ریسیو کیا۔ وہ ناگواری سے بولیں۔ ''تم میری بیٹی سے کیا بات کرنا چاہتے ہو؟''

ان کی زبان تو سوچے سمجھے بغیر تیر کی طرح چل پڑتی تھی۔ انہوں نے کہا۔ ''میں ناز

سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"

امی نے غصے سے کہا۔ "بکواس مت کرو۔ ہم فراڈ کرنے والوں کے گھر اپنی بیٹی کبھی نہیں دیں گے۔ یہ رشتہ قیامت تک نہیں ہوگا۔"

"پلیز۔ آپ اپنی بیٹی سے اس کی مرضی تو پوچھ لیں۔"

"ہماری بیٹی بچپن سے سعادت منداور فرمانبردار ہے۔ وہ ہمارا فیصلہ سن چکی ہے۔ تمہاری طرف تھوکنا بھی پسند نہیں کرے گی۔ دیٹس آل......"

انہوں نے ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ میں نے اس جارحانہ انداز پر تڑپ کر کہا۔

"ممی! دشمن سے بھی گفتگو کا ایک سلیقہ ہوتا ہے۔ آپ خواہ مخواہ کسی پر تھوکنے کی بات کیوں کر رہی ہیں؟"

بھائی جان نے کپ کو میز پر پٹختے ہوئے کہا۔ "ممی نے بالکل ٹھیک کہا ہے۔ وہ لوگ ایسے ہی سلوک کے مستحق ہیں۔ تم کیوں ان کی حمایت میں بول رہی ہو؟ ہم نے اعلیٰ خاندان کے کتنے ہی لڑکوں کو پسند کیا ہے، مگر تمہارے تو نخرے ہی سمجھ میں نہیں آتے۔ ایسے انکار کر دیتی ہو، جیسے آسمان سے کوئی شہزادہ اُتر کر آنے والا ہے؟"

میں نے کہا۔ "یہ تو ہے بھائی جان! رشتے آسمانوں پر ہی بنتے ہیں۔ جسے آنا ہوگا وہیں سے آئے گا۔ مگر آپ کو جلدی ہے کہ مجھے یہاں سے چلتا کریں تو گھر میں بہورانی آ جائے۔"

ممی نے کہا۔ "یہ بات میں کئی بار کہہ چکی ہوں، بیٹی کو بٹھا کر بہو گھر نہیں لاؤں گی۔ پہلے تمہیں رخصت کروں گی۔"

"یہ کسی آسمانی کتاب میں نہیں لکھا ہے۔ آپ پہلے بہو لے آئیں۔ میری تو جب تک تعلیم مکمل نہیں ہوگی۔ شادی کا سوچوں گی بھی نہیں......"

میں وہاں سے اٹھ کر جانے لگی۔ بھائی جان نے کہا۔ "ممی! وہ اِدھر فون کر رہا ہے۔ آپ اپنی بیٹی سے پوچھیں کہ اس کے دل میں ہے کیا؟ یہ کیا چاہتی ہے؟"

میں تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے میں آ گئی۔ اگر مجھ سے پوچھا جاتا کہ میں کیا چاہتی ہوں؟ تو اس کا جواب کیا دیتی......؟ میں خود ہی سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ ان کی طرف کیوں کھنچی جا رہی ہوں؟ زندگی میں پہلی بار ان کی حمایت میں ممی کی مخالفت کی تھی۔ ایسا کیوں ہوا تھا؟ بس مجھے اچھا نہیں لگا تھا کہ ان کے خلاف کوئی کچھ کہے۔ اس لئے میں بے اختیار بول پڑی تھی۔

رات کو بستر پر کروٹیں بدلتے وقت پتہ چلا کہ نیند کیسے اُڑتی ہے؟ اور کون اُڑا رہا

ہے؟ میں ایسے سوال کے جواب کسی سے پوچھ نہیں سکتی تھی۔ یہ دل کا معاملہ تھا۔ دل سے ہی پوچھنا تھا۔ میں نے دل سے کہا۔

"اے دیوانے بتا
جب سے کوئی ملا
تُو ہے کھویا ہوا
یہ کہانی ہے کیا، ہے یہ کیا سلسلہ
دھڑکنوں میں چھپی کیسی آواز ہے
کیسا یہ گیت ہے، کیسا یہ ساز ہے
کیسی یہ بات ہے، کیسا یہ راز ہے؟"
میرے دل نے کہا۔ "جب سے کوئی ملا
چاند، تارے، فضا، پھول، بھونرے، ہوا
یہ حسین وادیاں اور یہ آسمان
سب ہے جیسا نیا
میں نے دل سے کہا۔ "مجھ کو یہ تو بتا
جو ہے تجھ کو ملا
اس میں کیا بات ہے
وہ منفرد ہے۔ بڑا صاف گو
وہی بات کہتا ہے۔ دل میں ہو جو
وہ پہلا تاثر ہے
اور آخری بھی
میرے دل کی حالت خدا جانتا ہے
میرا رت جگا اسے مانگتا ہے
میں نے دل سے کہا۔ "بات اتنی سی ہے کہ تجھے پیار ہے۔"
میرے دل نے کہا۔ "مجھے اقرار ہے۔"
"ہاں۔ مجھے پیار ہے۔ ہاں مجھے پیار ہے۔"

میں ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ بستر چھوڑ کر تیزی سے چلتی ہوئی بیڈ روم سے باہر

آ گئی۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ پورے گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ سب ہی اپنے اپنے کمروں میں گہری نیند سو رہے تھے۔ میں دبے قدموں چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں ٹیلی فون کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

ریسیور اٹھاتے وقت دل کی دھڑکنیں بے قابو ہو رہی تھیں۔ مجھے یہ خیال فون تک لے آیا تھا کہ ان سے رابطہ نہیں کروں گی تو گھر والے کبھی میرے اندر ہونے والی تبدیلیوں کو سمجھ نہیں پائیں گے اور وہ بے چارے مجھ سے بات کرنے کے لئے ترستے ہی رہ جائیں گے۔

میں نے سوچ سوچ کر ٹھہر ٹھہر کر نمبر پنچ کئے۔ دوسری طرف فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ وہاں بھی سب سو رہے ہوں گے۔ سناٹے میں فون کی گھنٹی چیخ رہی ہو گی۔ جمال کے کمرے میں بھی فون نہیں ہوگا۔ کسی دوسرے کمرے میں یا ڈرائنگ روم میں چیخ رہا ہوگا۔ ان دنوں موبائل فون نہیں تھے۔ آج جیسی سہولتیں میسر نہیں تھیں۔

پھر اچانک ہی ایک بھاری بھر کم سی آواز سنائی دی۔ ’’ہیلو۔ کون ہے؟‘‘

میں نے آواز پہچان لی۔ جھجکتے ہوئے کہا۔ ’’انکل! میں ناز آفریں بول رہی ہوں۔‘‘

اتنی رات کو جگائے جانے پر وہ غصے میں تھے۔ میری آواز سنتے ہی نرم پڑ گئے۔ بڑی شفقت سے بولے۔ ’’ہاں بیٹی! بولو۔ اتنی رات کو فون کیا ہے۔ کوئی پریشانی ہے؟‘‘

’’نہیں انکل! وہ۔ وہ دراصل میں جمال سے بات کرنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’اچھا بیٹی! ہولڈ آن کرو۔ میں ابھی بلاتا ہوں۔‘‘

’’جسٹ آ منٹ انکل! آپ سے ایک التجا ہے۔‘‘

’’بیٹی! التجا نہ کرو۔ مجھے باپ سمجھو اور اپنی کوئی بھی بات منوالو۔‘‘

’’بس ایک ہی بات ہے۔ کسی طرح آپس کی لڑائی ختم کر دیں۔ میں دونوں گھرانوں میں پہلے جیسی محبت اور دوستی دیکھنا چاہتی ہوں۔‘‘

’’خدا تمہیں خوش رکھے۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا ہوں لیکن تمہارے ماموں جان وہاں چیف اکاؤنٹنٹ ہیں۔ انہوں نے ایسا گھپلا کیا ہے کہ سارا الزام مجھ پر آ گیا ہے۔ تمہارے باپ کو زبردست غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ مجھے بے ایمان اور دھوکے باز سمجھ رہے ہیں۔ کوئی بھی جھوٹا الزام برداشت نہیں کرتا۔ میں بھی نہیں کروں گا۔ ان کی غلط فہمی دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا رہوں گا۔ یہ لو...... جمال خود ہی آ گیا۔ اس سے بات کرو۔‘‘

میں نے دھڑکتے ہوئے دل سے ان کی آواز سنی۔ ’’ہائے ناز! کیسی ہو؟‘‘

میں کچھ کہنا چاہتی تھی۔ انہوں نے پہلی ملاقات میں مجھے کب کچھ کہنے دیا تھا جواب کہنے دیتے۔ انہوں نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔ ’’مجھے یہ پوچھنا تو نہیں چاہئے، کیسی ہو؟ تمہارا رت جگا بتا رہا ہے کہ میرے ہی جیسی ہو...... دونوں طرف ہے آگ برابر لگی ہوئی۔‘‘

میں نے گھبرا کر کہا۔ ’’آپ اپنے ڈیڈ کے سامنے کیسی باتیں کر رہے ہیں؟‘‘

’’وہ سمجھدار ہیں۔ یہاں سے جا چکے ہیں۔‘‘

میں نے اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ’’وہ بات یہ ہے کہ میں نے معافی مانگنے کے لئے فون کیا ہے۔ آج شام ممی نے آپ سے بڑی نامناسب باتیں کی ہیں۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔‘‘

’’تم نے شرمندہ ہونے میں رات کے تین بجا دیئے۔ صاف گوئی سے کیوں کترا رہی ہو؟ تم نے شرمندگی سے نہیں دل سے مجبور ہو کر فون کیا ہے۔‘‘

توبہ ہے۔ کوئی بات تو پردے میں رہنی چاہئے۔ مگر وہ سیدھے آ کر دل کے چور کو پکڑ رہے تھے۔ میں جواب میں کچھ نہ کہہ سکی اور کہتی بھی کیا؟ وہ تو خود ہی ایک بات کہتے تھے۔ پھر بات سے بات نکالتے چلے جاتے تھے۔

کہنے لگے۔ ’’تم یونیورسٹی میں ہو۔ دنیا دیکھتی ہو۔ پھر بولنے اور پرکھنے میں سب سے پیچھے کیوں رہنا چاہتی ہو؟ میں تو صاف کہتا ہوں۔ شام کو تم سے بات نہ ہو سکی تو میری بے چینی اور بڑھ گئی۔ ایسا سکون برباد ہوا کہ اب تک جاگ رہا ہوں۔ تم نے تو پہلی ہی ملاقات میں انتہا کر دی ہے۔ اب ماں لوری سنائے گی، تب بھی نیند نہیں آئے گی۔‘‘

یہ ایسی بات تھی کہ میں بے ساختہ ہنس پڑی۔ وہ بولے۔ ’’ناز! میں بہت خوش ہوں۔ ابھی تم نے کال کر کے میرا حوصلہ بڑھا دیا ہے۔ سیروں کے حساب سے خون بڑھ گیا ہے۔ صبح ڈاکٹر کے پاس جا کر چیک اپ کراؤں گا۔ تمہارے پیار کا پریشر بڑھتا رہے، اچھی بات ہے۔ بلڈ پریشر نہیں بڑھنا چاہئے۔‘‘

میں پھر بے اختیار ہنسنے لگی۔ رات کی خاموشی میں میری ہنسی کی آواز دور تک جا رہی ہو گی۔ مجھے غلطی کا احساس ہوا تو فوراً ہی چپ ہو گئی۔

انہوں نے پوچھا۔ ’’کیا ہوا؟ جلترنگ خاموش کیوں ہو گیا؟ کوئی آیا ہے کیا؟‘‘

’’نہیں۔ مگر اب فون بند کرنا چاہئے۔ کوئی بھی آ سکتا ہے۔‘‘

’’تم یونیورسٹی کب جاتی ہو اور کب واپس آتی ہو؟‘‘

"صبح آٹھ بجے گھر سے نکلتی ہوں اور دو تین بجے تک واپس آجاتی ہوں۔"

"کیا کوئی گاڑی میں لے جاتا اور لاتا ہے؟"

"نہیں۔ یونیورسٹی کی پوائنٹ یہاں سے چلتی ہے۔ میں اسی میں آتی جاتی ہوں۔"

"کل میں یونیورسٹی کے گیٹ پر انتظار کروں گا۔"

دل یکبارگی تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اگرچہ خوشی ہو رہی تھی۔ مگر ڈر بھی لگ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ "نن۔ نہیں۔ کوئی دیکھ لے گا۔"

"ہم بھی اسے دیکھ لیں گے۔ آنکھیں ہوتی ہی دیکھنے کے لئے ہیں۔"

"پلیز۔ مذاق نہ کریں۔"

"مذاق تو تم اپنا بنا رہی ہو۔ اٹھارویں صدی کی نیک پروین بن رہی ہو۔ فون بند کرو اور ایک آدھ گھنٹے کے لئے سو جاؤ۔ تمہیں صبح اٹھ کر وہاں پہنچنا ہے۔ میں نے جو کہہ دیا، وہی ہوگا۔ شب بخیر۔"

دوسری طرف سے رابطہ ختم کر دیا گیا۔ اللہ! کیا بتاؤں ان کا یہ انداز کتنا اچھا لگا؟ انہوں نے حکم دیتے ہی فون بند کر دیا تھا۔ جیسے میں ان کی محکوم ہوں۔ ان کی ملکیت ہوں۔ عورت چاہتی کیا ہے، بس یہی کہ وہ کسی ایک کی ملکیت بن جائے...... اور وہ کسی سے پوچھے بغیر بلکہ مجھ سے بھی پوچھے بغیر میرے سکندر اعظم بن رہے تھے۔ دیکھ رہے تھے کہ ہزاروں مخالف ہیں۔ اس کے باوجود آندھیوں میں چراغ جلانا چاہتے تھے۔

☆======☆======☆

دوسرے دن میں نے بڑے اعتماد اور کھلے ذہن سے ملاقات کی۔ اگر ایسا نہ کرتی تو وہ مجھے طعنہ دیتے کہ پچھلی صدی کی نیک پروین ہوں۔ وہ تو بس اپنے ہی رنگ میں رنگنا جانتے تھے اور عورت تو ہوتی ہی ہے پیا کے رنگ میں رنگ جانے والی۔ بالکل پانی کی طرح...... جس برتن میں جاتی ہے، وہی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔

یوں ہماری ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا اور میں پانی کی طرح ان کی ڈھلان پر بہتی چلی گئی۔ گھر میں میرے رویے سے ایک کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ جب بھی کاروباری دشمنی کا ذکر چھیڑا جاتا تو میں جمال اور اس کے والد کی حمایت میں ہی بولتی تھی۔ میں نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ ماموں جان نے ہمارے کاروبار میں ہیرا پھیری کی ہے۔ میری اس بات سے بھائی جان انگاروں پر لوٹنے لگے۔ کیونکہ وہ ماموں جان کی بیٹی نادرہ سے عشق فرما رہے تھے اور ممی

کب اپنے بھائی کے خلاف کچھ سننے والی تھیں۔ وہ بھی مجھے صلواتیں سنانے لگیں۔

اگرچہ گھر والوں کو میری اور جمال کی ملاقاتوں کا علم نہیں تھا لیکن یہ بات سب کی سمجھ میں آگئی تھی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ بھائی جان نے تو صاف طور سے کہہ دیا تھا کہ میں ان سے چھپ کر ملتی ہوں۔ ڈیڈ نے کہا۔ "مراد شاہ ہمارا دشمن ہے۔ اسے بیٹی کہہ کر سر پر ہاتھ پھیر کر ہمارے خلاف بھڑکا رہا ہے۔ ہمارے گھر میں آگ لگا رہا ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے، اس کی شادی کرواور گھر سے دھکے دے کر نکالو۔"

میں نے پہلی بار سب کے منہ پر کہہ دیا۔ "میں شادی نہیں کروں گی۔ اگر ماں باپ کا گھر چھوڑنا ضروری ہے تو پھر اپنی مرضی سے کروں گی۔"

بھائی جان جیسے پھٹ پڑے۔ "صاف کیوں نہیں کہتی، تم جس کی حمایت میں بول رہی ہو، اسی سے شادی کرو گی۔ ہمارے دشمنوں سے رشتہ جوڑو گی۔"

پھر انہوں نے ممی اور ڈیڈی کی طرف پلٹ کر کہا۔ "ہم مرتے مر جائیں گے۔ مگر دشمن سے رشتہ نہیں جوڑیں گے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ یہ اس گھر سے نہیں ٹلے گی؟ اور میری شادی کھٹائی میں پڑ جائے گی۔ میں آپ دونوں سے صاف صاف کہہ دیتا ہوں۔ اگر ایک آدھ ماہ کے اندر اس نے ہماری مرضی سے شادی نہیں کی تو آپ پہلے ماموں جان کے گھر میری شادی کی تاریخ پکی کرنے جائیں گے۔ بس...... میں نے بہت صبر کیا ہے۔ اب نہیں کروں گا۔"

ممی نے تائید کی۔ "یہ ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے۔ میرے بھائی کی بیٹی کب تک بیٹھی رہے گی؟ بیٹا اٹھائیس برس کا ہو گیا ہے۔ اس کا نام تو ہم نے خواہ مخواہ ناز رکھ دیا۔ یہ اسی طرح ناز نخرے دکھاتی رہے گی تو میرا بچہ کیا بوڑھا ہو کر شادی کرے گا؟"

ڈیڈی نے مجھ سے کہا۔ "تمہیں اپنی چھوٹی بہن کے بارے میں بھی سوچنا چاہئے۔ اس کے بھی رشتے آرہے ہیں۔ ہم تمہارے انتظار میں انہیں بھی ٹال رہے ہیں۔ بس بہت ہو چکا ناز! میں نے بھائی کے بیٹے اور بہن کے بیٹے کو پسند کیا ہے۔ ایک ہفتے کے اندر دونوں میں سے کسی ایک کے لئے ہاں کر دو۔ ورنہ ہم اپنی مرضی سے تمہیں کسی سے بھی منسوب کر دیں گے۔"

میں نے بڑے ہی مستحکم لہجے میں کہا۔ "ڈیڈ! آپ سب میری فکر نہ کریں۔ میں کہہ چکی ہوں، شادی نہیں کروں گی تو پھر نہیں کروں گی۔ آپ آج ہی ماموں جان کے گھر جا کر بھائی جان کی بات پکی کر دیں۔ میرے بعد چھوٹی کی شادی ہو سکتی ہے۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ بڑی شادی نہ کرے تو چھوٹی کو بٹھا کر رکھا جائے۔ آپ اس کا بھی رشتہ طے کر دیں۔"

میں اپنا فیصلہ سنا کر ان کی کوئی بات سنے بغیر وہاں سے چلی آئی۔ می نے میرے پیچھے چیختے ہوئے کہا۔ ''یہ اپنا فیصلہ ہم پر مسلط کر رہی ہے۔ جیسے ہم اس کے ماں باپ نہیں ہیں۔ اس کے دباؤ میں رہتے ہیں۔ میں پورے یقین سے کہتی ہوں، وہ دشمن اس پر جھاڑ پھونک کرا رہے ہیں۔ اس کا دماغ گھوم گیا ہے۔ یہ پہلے ایسی تو نہیں تھی؟''

میں نے وہاں سے جاتے ہوئے سوچا۔ ''ہاں۔ میں پہلے ایسی نہیں تھی۔ انسان کو حالات بدل دیتے ہیں اور جمال نے میرے حالات بدل دیئے ہیں۔ میں تو ان کے ساحل پر آکر کشتی جلا چکی ہوں۔ واپسی کا راستہ بند کر چکی ہوں۔ اب جو ہونا ہے، ہو جائے۔''

گھر میں سب ہی جانتے تھے کہ میں بہت ضدی ہوں۔ ویسے بچپن سے جوانی تک جو ضد اور خودسری ہوتی ہے۔ اس میں بڑی حد تک معصومیت ہوتی ہے لیکن جوانی کی خودسری بزرگوں کو چونکا دیتی ہے۔ یہ سمجھا دیتی ہے کہ معصومیت کی جگہ بغاوت لے رہی ہے۔

ڈیڈی، می اور بھائی جان اس ٹوہ میں رہنے لگے کہ میں دشمنوں سے کس طرح رابطہ رکھتی ہوں؟ کیا فون کے ذریعے بات ہوتی ہے یا ان سے ملنے جاتی ہوں؟

کچھ اس طرح سختی سے نگرانی ہونے لگی تھی کہ میں اور جمال محتاط ہو گئے تھے۔ باہر کم ملتے تھے لیکن رات کے تین بجے فون کے ذریعے ہمارا رابطہ رہا کرتا تھا اور ہم کم از کم ایک گھنٹے تک ضرور بات کرتے تھے۔

ہر ماہ چھ سو سے زیادہ بل نہیں آتا تھا۔ دوسرے ماہ پندرہ سو روپے کا بل آیا تو می چیخنے لگیں۔ ''یہ تم سب دن رات کیسے فون کرتے ہو؟ کتنی لمبی باتیں کرتے ہو؟''

انہوں نے ڈیڈی کے سامنے بل پھینکتے ہوئے کہا۔ ''آپ اپنی کاروباری لمبی لمبی باتیں دفتر سے ہی کیا کریں۔ اگر آئندہ اتنا بل آیا تو میں گھر کے بجٹ سے پیسہ نہیں نکالوں گی۔ آپ ہی کو بل ادا کرنا ہوگا۔''

میرے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ میں نے اسی رات فون پر جمال سے کہا۔ ''آئندہ ہم لمبی باتیں نہیں کریں گے۔ ورنہ ہماری یہ چوری پکڑی جائے گی۔''

جمال نے کہا۔ ''بڑی مصیبت ہے۔ میں یہاں سے فون کروں تو تمہارا ایک پیسے کا بھی بل نہیں آئے گا لیکن تم منع کرتی ہو کہ وہاں تمہارے آنے اور ریسیور اٹھانے تک فون کی گھنٹی رات کے سناٹے میں بجتی رہے گی۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ تم سے پہلے دوسرے فون اٹھانے آجائیں گے۔''

''آئندہ ہم کم سے کم بات کریں گے اور جس روز باہر ملیں گے، اس رات فون پر کوئی بات نہیں ہوگی۔ اسی طرح یہاں کا بل کم آئے گا۔''

باتیں کیسے کم ہو سکتی ہیں؟ وہ بھی ایسے وقت، جب پیار کرنے والے فون کے ذریعے کانوں سے دل میں اُتر رہے ہوں؟ نظر نہ آتے ہوئے بھی اِدھر آواز کی شیرینی سے اور اُدھر لب و لہجے کے دبدبے سے نگاہوں کے سامنے مجسم ہو رہے ہوں تو وہ سارے لمحے وصال کی گھڑیاں بن جاتے ہیں۔ پھر یہ گھڑیاں ٹلنے کا نام نہیں لیتیں۔

پھر بھی ہم نے کوشش کی۔ کم سے کم بات ہوتی رہے۔ کبھی پون گھنٹے کبھی آدھے گھنٹے۔ دوسرے مہینے فون کا بل گیارہ سو روپے آیا۔ می پھر چیخنے لگیں۔ ڈیڈی نے سر پکڑ کر کہا۔ ''خدا کے لئے آہستہ بولو۔ میرا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا ہے۔ ٹیلی فون ایکسچینج میں میرا ایک شناسا ہے۔ اس سے کہوں گا، وہ بل کے ساتھ تفصیلی رپورٹ بھیجے گا کہ پچھلے ماہ کن نمبروں پر کتنی بار فون کئے گئے ہیں اور کس وقت کئے گئے ہیں؟ ذرا صبر کرلو۔ آئندہ اتنا بل نہیں آئے گا۔''

دوسرے ہی دن رپورٹ آگئی۔ اس میں سب سے زیادہ جمال کے گھر کے فون نمبر درج تھے۔ اس رپورٹ کے مطابق ہر رات تین بجے سے چار بجے تک کال برابر جاری رہتی ہے۔

اس رپورٹ نے تو جیسے دھماکہ کر دیا۔ می سینہ پیٹتے ہوئے ہائے ہائے کرنے لگیں۔ بھائی جان غصے سے غرانے لگے۔ ڈیڈی نے کہا۔ ''میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ہماری لڑکی ہماری ہی ناک کے نیچے دشمنوں سے دوستی کی اور پیار کی پینگیں بڑھا رہی ہوگی؟''

می نے کہا۔ ''یہ لڑکی تو ہمیں کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑے گی۔ اسے باندھ کر رکھو۔ یہ بات باہر تک پھیلے گی تو کیا ہوگا؟''

بھائی جان نے کہا۔ ''میں تو نادرہ اور اس کی امی کے سامنے سر نہیں اٹھا سکوں گا۔ وہ یہاں بہو بن کر آئے گی تو بہن کی بے حیائی کے طعنے دیتی رہے گی۔''

ڈیڈی نے ایک قدم میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ''لعنت ہے تم پر...... تمہیں اپنی چھوٹی بہن کا بھی خیال نہیں ہے۔ تمہاری بے حیائی کا چرچا ہوگا تو اس کا رشتہ کہیں سے نہیں آئے گا۔''

مجھے جمال کی بے باکی اور تیز طراری نے دوٹوک باتیں کرنا سکھا دیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''جب تک آپ جمال کو دشمن سمجھتے رہیں گے۔ تب تک میں بے حیا دکھائی دیتی رہوں گی۔ دوستی کرلیں، محبت سے گلے لگالیں۔ ہمارا دین بھی یہی کہتا ہے۔ صلح جوئی کا راستہ نکل رہا ہو تو نکالنا چاہئے۔ اس پر ضرور عمل کرنا چاہئے۔''

"بکواس مت کرو۔ ہم اُس گھر سے کبھی رشتہ نہیں جوڑیں گے۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں بھی ضد نہیں کروں گی۔ خاموش رہوں گی۔ میرا وعدہ ہے، اندر کی بات باہر نہیں جائے گی۔ میں آپ کی نیک نامی پر حرف نہیں آنے دوں گی۔ مگر......"

میں نے شہادت کی انگلی اُٹھاتے ہوئے کہا۔"شادی نہیں کروں گی۔ آخری سانس تک اس زندگی کو جمال کے نام سے گزارتی رہوں گی۔"

میری وہ اٹھی ہوئی انگلی ایک چیلنج بن رہی تھی۔ سب پر سکتہ طاری ہو گیا۔ وہ مجھے زیادہ سے زیادہ گالیاں دے سکتے تھے۔ مجھ پر ہاتھ اٹھا سکتے تھے۔ مگر گھر سے نہیں نکال سکتے تھے۔ اس طرح بدنامی کو ہوا نہیں دے سکتے تھے۔

میں تیزی سے چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ پھر رک کر بولی۔"آپ بزرگ ہیں۔ بدنامی کو اسی طرح روک سکتے ہیں کہ مجھے فون پر جمال سے بات کرنے کی اجازت دے دیں۔ میں ہفتے میں کم از کم ایک بار ان کے گھر جایا کروں گی۔ اعتراض نہ کریں۔ میں خدا کو حاضر و ناظر جان کر کہتی ہوں، میری پارسائی اور آپ کی نیک نامی پر کوئی حرف نہیں آئے گا۔ آپ سوچیں، اچھی طرح غور کریں۔ ورنہ بات بگڑے گی تو بگڑتی چلی جائے گی۔"

ڈیڈ نے میرے پیچھے ممی اور بھائی جان سے کہا۔"ہم بچپن سے اس لڑکی کے مزاج کو سمجھتے آ رہے ہیں۔ اس پر تشدد کریں گے، جبر کریں گے تو یہ ٹوٹ جائے گی مگر جھکے گی نہیں۔ دانشمندی یہ ہے کہ اسے خودسری کی انتہا تک نہ پہنچنے دیا جائے۔ ابھی مصلحتاً خاموش رہا جائے۔ بعد میں سوچیں گے، کیا کیا جاسکتا ہے؟"

وہ بعد میں دن رات سوچتے رہے۔ ہفتوں مہینوں سوچتے رہے اور کوششیں کرتے رہے کہ میں جمال کی طلب سے باز آجاؤں جبکہ میں باز آنے والوں میں سے نہیں تھی۔ جوان لڑکیوں کے والدین بدنامی سے ڈرتے ہیں اور عاقبت نااندیش لڑکیاں اپنے بزرگوں کی اسی کمزوری سے فائدہ اٹھاتی ہیں۔ اس تصویر کا دوسرا رخ یہ بھی ہے کہ عاقبت نااندیش والدین جہاں دوستی اور محبت سے بات بنا سکتے ہیں۔ وہاں بات بگاڑنے پر تلے رہتے ہیں۔

سچائی یہ تھی کہ ماموں جان نے چیف اکاؤنٹینٹ کی حیثیت سے دفتر میں جو گھپلا کیا تھا، ممی اسے ایک بہن کی حیثیت سے تسلیم نہیں کر رہی تھیں۔ وہ اپنے بھائی پر کسی بھی طرح کا الزام برداشت نہیں کر سکتی تھیں اور ڈیڈی تو ان کے اشاروں پر چلتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے سالے کو سچا اور جمال کے والد کو جھوٹا مان لیا تھا۔ بھائی جان ماموں جان کی بیٹی نادرہ پر مرمٹے

تھے۔ اس لئے وہ بھی ان کی حمایت کرتے رہتے تھے۔ ان حالات میں جمال سے رشتے داری تقریباً ناممکن ہوتی جارہی تھی۔

☆======☆======☆

چھ ماہ بعد بھائی جان کی شادی ہوگئی۔ نادرہ ہماری بھابھی جان بن کر گھر آگئی۔ انہوں نے دوسرے ہی دن طنزیہ لہجے میں مجھ سے پوچھا۔"تمہارا عشق کس مرحلے پر ہے؟"

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ ہم ماں باپ اور بھائی بہنوں کے درمیان یہ طے پایا تھا کہ میرے عشق و محبت کا ذکر نادرہ بھابھی کے سامنے کبھی نہیں کیا جائے گا۔ میں نے انجان بن کر پوچھا۔"یہ آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں؟ کس نے کہہ دیا کہ میں کسی کے عشق میں مبتلا ہوں؟"

انہوں نے پرانی کہاوت دہرائی۔"عشق اور مُشک چھپائے نہیں چھپتے۔ مجھے تو اس عشق کی مہک اپنے میکے تک ملتی رہی ہے۔"

میں تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں پہنچی۔ وہاں بھائی جان، ممی اور ڈیڈی کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے کہا۔"بھابھی جان مجھ سے پوچھ رہی ہیں کہ میرا عشق کس مرحلے پر ہے؟ آپ لوگوں نے تو کہا تھا، بات صرف ہمارے درمیان ہی رہے گی۔ کسی سے اس کا ذکر نہیں کیا جائے گا۔ یہ تو یہاں آتے ہی کیچڑ اچھالنے کے انداز میں طنزیہ لہجہ اختیار کر رہی ہیں۔"

بھائی جان نے کہا۔"کیوں خواہ مخواہ نادرہ کے خلاف بول رہی ہو۔ کیچڑ تو تم نے اچھالی ہے۔ ہم تو پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مگر تم پردہ رکھنا ہی نہیں چاہتیں۔"

"بھائی جان! آپ اب باتیں نہ بنائیں۔ صرف اتنا بتا دیں کہ بھابھی جان کو یہ بات کیسے معلوم ہوئی ہے؟"

"اور کیسے معلوم ہوگی؟ انہوں نے رات کو تمہیں جمال سے بات کرتے ہوئے سن لیا تھا۔"

میں نے کہا۔"خدا کے لئے ممی اور ڈیڈی کے سامنے جھوٹ نہ بولیں۔ کل رات تو میں نے ان سے بات ہی نہیں کی۔ آپ کیوں چھپا رہے ہیں کہ خود پیٹ کے ہلکے ہیں۔ بیوی کے سامنے ساری باتیں اُگل دی ہیں۔ بھابھی جان کا دعویٰ ہے کہ یہ باتیں انہیں میکے میں ہی معلوم ہوگئی تھیں۔"

ممی نے کہا۔"چیختی کیوں ہو؟ آہستہ بولو۔ نادرہ صرف بہو نہیں ہے۔ ہمارے بعد اس گھر کی مالکن ہے۔ اس سے نہ کوئی بات چھپ سکتی ہے اور نہ چھپائی جاسکتی ہے۔ اتنی سی بات پر طوفان کیوں اٹھا رہی ہو؟"

"یہ بات میری کسی حرکت سے ظاہر ہوتی تو آپ طوفان اٹھاتیں لیکن بیٹے صاحب بہو کے دیوانے ہو کر جو بھی کر گزریں، وہ سب قابلِ معافی ہے۔ میں تو آپ لوگوں کی ہدایت پر عمل کر رہی تھی کہ گھر کی بات دنیا والوں تک تو کیا بھائی جان کے میکے تک بھی نہ پہنچے۔"

"بس آگے نہ بولو۔ یہ بات اور آگے نہیں جائے گی۔"

"کیسے نہیں جائے گی۔ آپ بہو نہیں، لاؤڈ اسپیکر لائی ہیں۔ یہ اتنی دور تک بولیں گی کہ آپ سب نظریں چراتے پھریں گے۔ میں آپ کے سامنے بہت چھوٹی ہوں، کم عقل ہوں۔ پھر بھی سمجھاتی ہوں کہ مراد انکل سے سمجھوتہ کر لیں۔ رشتے داری کر لیں۔ پھر کوئی ہم پر انگلی نہیں اٹھا سکے گا۔"

بھائی جان نے کہا۔ "تمہیں تو ان کی حمایت کرنے کا ایک بہانہ مل گیا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔ نادرہ اس گھر کی عزت بن کر آئی ہے۔ ہماری عزت پر کبھی حرف نہیں آنے دے گی۔"

میں نے کہا۔ "یہ تو آنے والا وقت ہی بتائے گا۔ ویسے مجھے اطمینان ہے کہ یہ بات باہر تک جائے گی تو مجھ پر الزام نہیں آئے گا۔ مجھ سے پہلے بھائی جان پنڈورا باکس کھول چکے ہیں۔"

وہاں بحث کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوتا۔ بھائی جان اپنی نئی نویلی کے خلاف کوئی بات بھی سننا گوارہ نہ کرتے اور ممی نے تو بھائی جان کو پیدا کرتے ہی جیسے قسم کھالی تھی کہ بیٹا بھلے گھر میں آگ لگائے، تب بھی اسی کی حمایت میں بولیں گی کہ آگ دیا سلائی نے لگائی تھی۔ بیٹے نے نہیں۔

اور میں ڈیڈی سے کیا کہتی؟ ان کا ریموٹ کنٹرولر تو ممی کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ وہاں میری سننے والا اور سمجھنے والا کوئی نہیں تھا۔ ایسے وقت ایک ملازمہ دوڑتی ہوئی آ کر بولی۔

"چھوٹی بی بی جی بیٹھے بیٹھے گر پڑی ہیں۔ پھر وہی سانس لینے میں تکلیف ہو رہی ہے۔"

ہم سب دوڑتے ہوئے اس کے کمرے میں پہنچے۔ میری چھوٹی بہن مہناز استھیما کی مریضہ تھی۔ اسے بعض اوقات سانس لینے میں دقت ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے دوائیں دی تھیں اور ایک انہیلر تجویز کیا تھا۔ اس کے ذریعے آسانی سے سانسیں بحال ہو جاتی تھیں۔

ممی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ "انہیلر کہاں ہے؟"

مہناز فرش پر بیٹھی سانسیں کھینچ کھینچ کر جیسے زندگی کو پکار رہی تھی۔ اور سانسیں آسانی سے پھیپھڑوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ ان لمحات میں وہ کچھ بولنے کے قابل نہیں رہتی تھی۔ پتہ

نہیں، اس نے انہیلر کہاں رکھا تھا؟ سب ہی کمرے میں اسے اِدھر اُدھر ڈھونڈنے لگے۔ میز پر دیکھا، دراز میں دیکھا۔ آخر وہ تکیے کے نیچے سے ملا۔

میں نے اسے اچھی طرح ہلا کر اس کا کور ہٹا کر مہناز کے منہ میں رکھ دیا۔ اس نے ایک زور کی سانس کھینچی۔ پھر چند سیکنڈ کے بعد ہی ساری پریشانی دور ہو گئی۔ وہ سہولت سے سانس لینے لگی۔

ممی نے غصہ سے کہا۔ "کتنی بار سمجھایا ہے، انہیلر کو ساتھ رکھا کرو۔ یہ کوئی سونے کا وقت تو نہیں ہے کہ اسے تکیے کے نیچے رکھ لیا تھا۔"

ڈیڈی نے کہا۔ "بیٹی! اب تم بچی نہیں ہو۔ تمہیں اپنی دواؤں کا خیال رکھنا چاہئے۔"

مہناز نے بیڈ کے سرے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ہمیشہ تو ایسا نہیں ہوتا ہے ڈیڈ! بس غلطی ہو گئی۔ میں اِدھر کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اچانک ہی سانس رکنے لگی۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ انہیلر کہاں ہے؟ میں کرسی سے اٹھ کر اسے ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ مگر گر پڑی۔"

یہ معمول کی بات تھی۔ وہ پچھلے تین برس سے دمے کی مریضہ تھی اور مرض رفتہ رفتہ بڑھتا جا رہا تھا۔ انہیلر کے ذریعے سانسیں بحال ہو جاتی تھیں تو اطمینان ہو جاتا تھا کہ زیادہ پریشانی کی بات نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا، آئندہ اسے زیادہ پاورفل انہیلر لینا ہوگا۔ یہ روگ تو جیسے زندگی کے ساتھ ہی جانے والا تھا۔

ممی کو یہ فکر لاحق تھی کہ اس کی شادی جلدی ہو جائے۔ زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں ہے۔ جتنی رہ گئی ہے اسے سہاگن بن کر ہنسی خوشی گزار لے۔ انہوں نے مجھے گھور کر دیکھا۔ میں نے کہا۔ "میں تو کہہ چکی ہوں، میرا انتظار نہ کریں۔ جب بھائی جان کی شادی کر چکی ہیں تو مجھ سے پہلے مہناز کی بھی کر دیں۔"

وہ بڑبڑاتی ہوئی کمرے سے چلی گئیں۔ ڈیڈی بھی ان کے پیچھے یوں چلے گئے۔ جیسے کچے دھاگے سے بندھے ہوں۔ ان سب کے جانے کے بعد مہناز نے میرے ہاتھ کو تھام کر کہا۔ "آپی! ممی تو کبھی ماموں جان کے خلاف نہیں سوچیں گی لیکن ڈیڈی کو تو سوچنا چاہئے۔ انہوں نے مراد انکل سے برسوں کی دوستی ختم کر دی۔ کاروبار دو حصوں میں بٹ گیا۔ اب ماموں جان اس گھر میں نقب لگا رہے ہیں۔ بیٹی کو بہو بنا کر بھیجا ہے۔ دیکھیں اور کیا گل کھلانے والے ہیں؟"

میں نے کہا۔ "یہ اچھا ہوا کہ تم چچا جان کے گھر بہو بن کر جانے والی ہو۔ وہ ساری سچائی

کو سمجھتے ہیں۔انہوں نے کئی بار ڈیڈی کو سمجھایا ہے مگر وہ کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہتے۔ پتہ نہیں، ممی اور ماموں جان نے انہیں کیا گھول کر پلا دیا ہے؟''

مہناز نے اپنا سر میرے سینے پر رکھتے ہوئے کہا۔''آپی! لگتا ہے، اب میں زیادہ نہیں جیوں گی۔''

میں نے پیار سے ڈانٹ کر کہا۔''فضول باتیں نہ کرو۔ تمہیں کوئی تشویش ناک مرض نہیں ہے۔''

''آپ نے سنا نہیں ڈاکٹر نے کیا کہا تھا؟ میرے پھیپھڑوں پر ورم آ گیا ہے۔ ایک پھیپھڑے پر ہلکا سا اسپاٹ ہے۔''

''اس نے یہ بھی تو کہا ہے کہ دوا باقاعدگی سے کھاتی رہو۔کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔''

''ڈاکٹر تو بس یونہی تسلی دیتے ہیں۔''

''دیکھو مہناز! انسان صرف دوا سے نہیں دعاؤں سے اور اپنے حوصلوں سے بھی زندگی بسر کرتا ہے۔ اللہ نے چاہا تو نانی اور دادی بننے تک جیو گی۔ منفی باتیں نہ سوچا کرو۔''

میں اسے تھپک کر تسلیاں دے کر وہاں سے چلی آئی۔ آنے والے دن ہمارے لئے بڑے ہی کٹھن اور صبر آزما تھے۔ نادرہ بھابھی آتے ہی اپنا رنگ دکھانے لگی تھیں۔ ایک ماہ کے اندر ہی ایسی پھوٹ ڈالی کہ گھر میں دو محاذ بن گئے۔ ایک محاذ پر ہم دونوں بہنیں تھیں اور دوسرے پر وہ اپنے ساس، سسر اور شوہر کے ساتھ تھیں۔ ہم دونوں کو جلد سے جلد اس گھر سے رخصت کر دینے کی فکر میں تھیں اور اس بات پر تلملا رہی تھیں کہ میں نے کبھی شادی نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

ایک دن انہوں نے غصے سے کہا۔''کیا ساری عمر ماں باپ کے گھر میں بیٹھی رہو گی؟ یہ کب تک رہیں گے؟ اس کے بعد تو تمہارے بھائی جان ہیں اور میں ہوں۔ کیا ہمارے سینوں پر مونگ دلتی رہو گی؟''

میں نے ڈیڈی سے کہا۔''بھابھی جان نے بہت اچھی بات کہی ہے۔ آج یہ فیصلہ ہو جانا چاہئے کہ آپ لوگوں کے بعد میرا اس گھر میں کیا بنے گا؟''

ممی نے کہا۔''یہ تو تم اپنی عقل سے سوچو۔ جب تک ہم اس دنیا میں ہیں، اپنا گھر بسا لو۔ ہم نہیں رہیں گے تو تمہارا کیا بنے گا؟''

''آپ اپنی زندگی میں میرے لئے بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ بھائی جان کے لئے یہ کوٹھی

کار بینک بیلنس سب کچھ چھوڑ کر جائیں گے تو کیا بیٹی کا کوئی حصہ نہیں ہوگا؟''

اس بات پر بھابھی اور تلملا گئیں۔ وہ اپنے میاں اور سسر کی دولت و جائیداد سے ایک تنکا بھی نہیں دینا چاہتی تھیں۔ ان بزرگوں کی زندگی میں نکاح کے تین بول پڑھا کر ہمیں رخصت کر دینا چاہتی تھیں لیکن میں ان کی سیاست کا شکار ہونے والی نہیں تھی۔

انہوں نے بھائی جان سے کہا۔''بیٹیوں کا بھلا کیا حصہ ہوتا ہے؟ شادی کے وقت جہیز میں جو لے جانا ہوتا ہے، لے جاتی ہیں۔ اس کے بعد میں ان کا کوئی حق نہیں رہتا۔''

میں نے کہا۔''آپ کے کہہ دینے سے دینی اور دنیاوی قوانین بدل نہیں جائیں گے۔ میں ڈیڈی کی کمائی میں سے اپنا حصہ ضرور وصول کروں گی۔ اگر مجھے میرا پورا حق نہ ملا تو......''

سب نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ بھابھی نے تڑخ کر پوچھا۔''تو کیا کر لو گی؟''

میں نے بہت ہی مستحکم اور ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا۔''تو میں مراد انکل کے گھر چلی جاؤں گی۔''

ممی نے چیخ کر کہا۔''یہ کیا بکواس کر رہی ہو؟''

میں نے ایک ہاتھ اٹھا کر انہیں آگے کچھ کہنے سے روکتے ہوئے کہا۔''میں وہی کروں گی جو بھابھی جان یہاں آ کر کر رہی ہیں۔ وہ بہو بن کر میرے باپ اور بھائی کی ساری کمائی پر اپنا حق جما رہی ہیں۔ اسی طرح میں مراد انکل کے گھر جا کر ان کی اور جمال کی کمائی کی حقدار بن جاؤں گی۔''

پھر میں نے نادرہ بھابھی کو دیکھتے ہوئے کہا۔''آپ یہاں آ کر ہمیں ہمارا حصہ نہیں دینا چاہتیں۔ اپنے طور پر گھاٹے کا سودا نہیں کرنا چاہتیں تو پھر میں گھاٹے کا سودا کیوں کروں؟ میں ایسی جگہ جانا چاہوں گی، جہاں آپ کی طرح مجھے بھی حکمرانی کے لئے ایک سلطنت ملے گی۔''

بھابھی نے کہا۔''تم بولتی بہت ہو۔ ہم کب کہتے ہیں کہ تمہیں کوئی سلطنت نہیں ملنی چاہئے؟ مگر جہاں ماں باپ کہتے ہیں، وہیں جانا چاہئے۔''

''آپ بھی تو اپنے ماں باپ سے زیادہ اپنی مرضی سے یہاں آئی ہیں۔ یہ ہم سب جانتے ہیں۔ ممی اور ڈیڈی بھی جانتے ہیں کہ دو برس پہلے بھائی جان نائلہ کے دیوانے تھے۔ اس سے شادی ہونے والی تھی لیکن آپ نے ان کا اسٹیئرنگ اپنی طرف موڑ لیا۔ جب آپ اپنی مرضی سے راستے ہموار کرتی ہوئی یہاں بہو بن کر آ سکتی ہیں تو میں مراد انکل کے گھر بہو بن کر کیوں نہیں جا سکتی؟''

مہناز نے کہا۔ ''بھابھی جان! جو آپ نے کیا ہے، وہی آپی کر رہی ہیں۔ پھر آپ کو اور ممی ڈیڈی کو اعتراض کیوں ہے؟''

''اس لئے اعتراض ہے کہ یہ دشمنوں کو گلے لگانا چاہتی ہے۔''

مہناز نے بھائی اور بھابھی کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''دشمن وہ نہیں ہیں۔ بلکہ وہ ہیں جو اپنی چالبازیوں سے مراد انکل کو دشمن بنا رہے ہیں۔''

وہ ایک دم سے تڑخ کر بھائی جان سے بولیں۔ ''دیکھ لیجئے! یہ میرے ابو کو چالباز کہہ رہی ہے۔''

''میں نے ماموں جان کا نام تو نہیں لیا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں، چور کی داڑھی میں تنکا......''

بھائی جان ایک دم سے اچھل کر کھڑے ہو گئے۔ غصے سے مٹھیاں بھینچ کر بولے۔

''مہناز! تم حد سے بڑھ رہی ہو۔ نادرہ کو چور اور ماموں جان کو چالباز کہہ رہی ہو۔ میں تمہارا منہ توڑ دوں گا۔''

میں نے کہا۔ ''یہی تو دیکھنا ہے کہ بیٹا منہ توڑے گا تو کیا ماں باپ تماشہ دیکھیں گے؟ جبکہ ہم نے کسی کا نام لے کر الزام نہیں دیا ہے۔''

مہناز نے کہا۔ ''کتنی عجیب سی بات ہے، ممی ڈیڈی کو یہ نظر نہیں آ رہا ہے کہ دلہن بیگم کے آتے ہی ہم کس طرح نظروں سے گر گئی ہیں؟ جب یہی ہمیں دو کوڑی کا سمجھ رہے ہیں تو پھر یہاں ہماری حیثیت کیا ہے؟ کیا اوقات ہے؟ آپی ٹھیک ہی کہتی ہیں ڈیڈ! آپ کی زندگی میں ہمیں ہمارا حصہ مل جانا چاہئے۔''

بھابھی نے نظروں ہی نظروں میں بھائی جان پر پتھر پھینکا۔ بھائی جان نے پلٹ کر وہ پتھر ہمیں دے مارا۔ ''نہیں ملے گا حصہ۔ کیا کر لوگی تم؟ یہاں تین وقت کی روٹی مل رہی ہے۔ کھانا کپڑا عیش و آرام جو کچھ بھی ہے۔ اسے غنیمت جانو۔ اپنی اوقات سے زیادہ مطالبہ کرو گی تو پھوٹی کوڑی نہیں ملے گی۔''

میں نے ڈیڈی سے پوچھا۔ ''کیا بھائی جان درست کہہ رہے ہیں؟ ہمیں پھوٹی کوڑی بھی نہیں ملے گی؟''

وہ ہچکچاتے ہوئے بولے۔ ''خواہ مخواہ بات کو بڑھا رہی ہو۔ بیٹیوں کو شادیاں کر کے رخصت کر دیا جاتا ہے۔ اسی وقت انہیں جو دینا دلانا ہوتا ہے، دے دیا جاتا ہے۔ خواہ مخواہ حصے داری کی بات نہ کرو۔''

''میں دینی احکامات کے مطابق اپنا اور مہناز کا حق طلب کروں گی۔ کیا قانون کی موجودگی سے آپ انکار کر سکیں گے؟''

بھائی جان نے کہا۔ ''زیادہ قانون نہ بگھارو۔ کیا قانونی طور پر کچھ وصول کرنے کے لئے اپنے ڈیڈی سے مقدمے بازی کرو گی؟ تمہیں پتہ ہے، کورٹ کچہری کے معاملات میں لاکھوں روپے لگ جاتے ہیں اور تم دونوں کے پاس مشکل سے دس بیس ہزار روپے ہوں گے۔''

''بھائی جان! ہمیں چیلنج نہ کریں۔ مجھ سے دشمنی آپ کو بہت مہنگی پڑے گی۔ میں مراد انکل کی پناہ میں چلی جاؤں گی۔ وہاں سے قانونی طور پر اپنا حق طلب کروں گی تو آپ سب منہ چھپاتے پھریں گے۔''

وہ سب غصے سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ میں نے کہا۔ ''آپ غصہ دکھائیں، گالیاں دیں، ہمیں جان سے مار ڈالیں۔ ہم مر جائیں گے تو آپ کو ہم سے نجات مل جائے گی۔ ورنہ ہم اپنا حق حاصل کرنے کے لئے مراد انکل کے پاس ضرور جائیں گے۔ پھر کیا ہوگا؟ آپ یہ اچھی طرح جانتے ہیں؟''

اور وہ سب خوب سمجھ رہے تھے۔ اسی لئے صرف غصہ دکھا رہے تھے۔ نہ ہمیں گالیاں دے رہے تھے۔ نہ ہاتھ اٹھا رہے تھے۔ یہ جانتے تھے کہ میں گھر سے باہر نکل گئی تو پھر وہ مجھے واپس نہیں لا سکیں گے۔ اس کے بعد ہم بہنوں کے حقوق بھی ادا کرنے ہوں گے اور جنہیں دشمن سمجھ رہے ہیں، ان کے سامنے ہمیشہ ان کی گردنیں جھکی رہیں گی۔

میں نے مہناز کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ ''چلو مہناز! انہیں سوچنے دو۔ ہمیں بھی بہت کچھ سوچنا ہے اور اپنے طور پر بہت کچھ کرنا ہے۔''

میں نے گویا دھمکی دینے کے انداز میں یہ شوشہ چھوڑا کہ حقوق حاصل کرنے کے لئے اپنے طور پر تیاری کرنے والی ہوں۔ مہناز نے کمرے میں آ کر کہا۔ ''آپی! بھابھی جان اپنے میکے سے خوب پکی پکائی آئی ہیں۔ اگر ہمارے حقوق ادا کرنے پڑے تو ان میں بھی ڈنڈی ماریں گی۔ بھائی جان بھی ضرور کوئی گھپلا کریں گے۔ ہمیں کم سے کم حصہ دینا چاہیں گے۔''

''تم فکر نہ کرو۔ مراد انکل مجھے پوری طرح گائیڈ کریں گے۔ ڈیڈ کے کاروبار کے مطابق مجھے پورا حساب کتاب بتائیں گے کہ ہم دونوں بہنوں کو کتنا حصہ ملنا چاہئے؟''

''بے شک۔ آپ کو ان کے ذریعہ صحیح رہنمائی ملے گی۔ اگر بھابھی جان سیر ہیں تو ہمیں

سوا سیر بن کر رہنا ہوگا۔ تب ہی ہمارا گزارہ یہاں ہو سکے گا۔''

شام کو ممی نے میرے پاس آ کر کہا۔ ''میرے ساتھ چلو۔''

میں نے پوچھا۔ ''کہاں......؟''

''ایک بنگالی بابا ہیں۔ وہ بڑے سے بڑے کالے عمل کا توڑ کرتے ہیں۔''

میں ایک دم سے تن سی گئی۔ ''واہ ممی! کالا عمل کرنے والی کو تو بہو بنا کر گھر لے آئیں۔ پتہ نہیں، وہ صبح شام کیا پڑھ پڑھ کر آپ سب پر پھونکیں مارتی رہتی ہیں؟ آپ کو ڈیڈی کو اور بھائی جان کو اس بنگالی بابا کے پاس جانا چاہئے۔''

انہوں نے سمجھانے کے انداز میں کہا۔ ''بیٹی! سمجھنے کی کوشش کرو۔ تمہارے دماغ کو کسی عمل سے باندھا گیا ہے۔ تم سمجھ نہیں پا رہی ہو۔ جب اس کا توڑ ہوگا اور تمہارا دماغ کھلے گا، تب پتہ چلے گا کہ تم اپنے ماں باپ اور بڑے بھائی کو کس طرح دشمنوں کے سامنے جھکانا چاہتی ہو؟ تم سے جو غلطیاں ہو رہی ہیں۔ وہ ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔''

''یہی میں کہتی ہوں، ابھی آپ کی سمجھ میں بھی نہیں آ رہا ہے کہ کس طرح ماموں جان بھائی بن کر پہلے کاروبار کو آدھا کر چکے ہیں۔ اب آپ کے دلوں میں ہمارے لئے نفرت پیدا کر رہے ہیں۔''

''تم میرے بھائی کے لئے زہر کیوں اگلتی رہتی ہو؟''

''وہ میرے بھی ماموں جان ہیں۔ ان سے ہی زہر اگلنا سیکھا ہے۔''

وہ غصے سے پیر پٹختی ہوئی چلی گئیں۔ رات کو ڈیڈ میرے کمرے میں آئے۔ چہرے سے پریشانی ظاہر کر رہے تھے۔ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولے۔ ''بیٹی! تم نے تھکا مارا ہے۔ بوڑھے ماں باپ بیٹیوں سے نہیں ڈرتے۔ اپنی بدنامی سے ڈرتے ہیں۔ اسی لئے میں تم پر کسی بھی طرح کی سختی نہیں کر رہا ہوں مگر تم سمجھ رہی ہو کہ میں بہت کمزور ہو گیا ہوں۔ اور تمہاری بغاوت ہے کہ دن بدن شدت اختیار کرتی جا رہی ہے۔''

''ڈیڈ! میں شروع سے ایک ہی بات کہہ رہی ہوں...... سچائی کو سمجھیں۔ مگر آپ نے کبھی میرے کہنے پر ماموں جان کا محاسبہ نہیں کیا۔ کبھی آڈیٹر کو بلا کر اپنے اکاؤنٹس کے رجسٹر چیک نہیں کرائے۔ ماموں جان نے سمجھایا کہ آپ کو اپنا کاروبار الگ کر لینا چاہئے اور آپ نے ان کی اور ممی کی باتوں میں آ کر ایک بہت اچھے دوست، کو دشمن سمجھ لیا اور اب تک سمجھتے آ رہے ہیں۔ جب ایک پیدا کرنے والا باپ سچائیوں سے منہ پھیرتا رہے گا تو اس کی اولاد اس کے

اصولوں پر یا اس کی کسی بات پر کیسے عمل کرے گی؟''

''میں تم سے بحث نہیں کروں گا۔ مجھ سے وعدہ کرو، کبھی اس گھر سے نکل کر مراد شاہ کے گھر نہیں جاؤ گی۔''

''جب گھر میں ہمارے ساتھ ناانصافی ہوگی تو انصاف مانگنے کے لئے کہیں تو جانا ہو گا۔''

''تمہارے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔ میں نے تمہاری ممی کو اور بھائی جان کو سمجھایا ہے کہ تم دونوں کا حصہ میری زندگی میں ہی دے دیا جائے۔''

''پھر تو میں اپنے گھر کا کوئی معاملہ لے کر مراد انکل کے گھر نہیں جاؤں گی اور یہ آپ شروع سے دیکھ رہے ہیں، آپ کی عزت اور نیک نامی کی خاطر میں نے اب تک ایسا کوئی قدم نہیں اٹھایا ہے۔ کبھی نہ کبھی یہ بات آپ کی سمجھ میں آئے گی کہ بیٹوں سے زیادہ بیٹیاں اپنے باپ کا سر بلند رکھتی ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔ میں کل ہی سارا حساب کتاب چیک کروں گا اور تم دونوں بہنوں کا حصہ الگ کروں گا۔''

''حساب کتاب چیک کرنے والے آپ ہیں اور آپ کے سر پر سوار رہنے والی ممی ہیں۔ چیف اکاؤنٹنٹ ماموں جان ہیں۔ میں آپ سے تو شکایت نہیں کروں گی لیکن ماموں جان کی بندر بانٹ کو قبول نہیں کروں گی۔''

''تو پھر کیا کرو گی؟''

''آپ کا اور مراد انکل کا ایک ہی کاروبار ہے۔ وہ آپ کی بزنس پوزیشن کو اور موجودہ آمدنی کو اچھی طرح سمجھتے ہیں اور آج تک بنائی ہوئی آپ کی تمام جائیداد کی مالیت کا حساب بھی رکھتے ہیں۔ وہ یہ بات مجھ سے کہہ چکے ہیں۔ لہٰذا وہی مجھے صحیح طور پر گائیڈ کریں گے کہ ہم دونوں بہنوں کو آپ کی طرف سے کتنا حصہ ملنا چاہئے؟''

وہ غصے سے گرجنے لگے۔ ''کیا بکواس کر رہی ہو؟ تم میرے دشمنوں سے میرے کاروبار کا حساب کراؤ گی؟ وہ کیا جانتا ہے؟ میرا کاروبار کیسے خسارے میں جا رہا ہے؟''

میں نے کہا۔ ''اتنے خسارے میں کہ آپ نے پچھلے ماہ بھائی جان کو چالیس لاکھ کی مرسڈیز دلائی ہے۔''

انہیں ایک دم سے چپ لگ گئی۔ وہ میرا منہ تکنے لگے۔ پھر ممی کی طرح غصے سے پاؤں

پٹختے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ پہلے اس چھت کے نیچے ہم بہت خوش تھے۔ سب ہی ہنستے بولتے رہتے تھے۔ اب اسی گھر کی چار دیواری میں خانہ جنگی اپنے عروج کی طرف جا رہی تھی۔

دوسری صبح ناشتے کی میز پر ممی نے اور بھائی جان نے مجھے سمجھایا کہ میں اس معاملے میں مراد انکل سے رجوع نہ کروں۔ ہم دونوں بہنوں کو پورے انصاف سے حصہ ملے گا۔

میں نے کہا۔ ''میں صرف تصدیق کروں گی کہ ہمارے ساتھ واقعی انصاف کیا جا رہا ہے یا نہیں؟ اس کے لئے میں ان کے گھر نہیں جاؤں گی۔ فون پر ہی معلومات حاصل کر لوں گی۔''

انہوں نے غصے سے کہا۔ ''کیا تم نے دشمنوں کے سامنے ہمیں ذلیل کرنے کی قسم کھالی ہے؟''

''جب ہم سے انصاف ہوگا تو ذلت نہیں......عزت ملے گی۔''

بھائی جان نے جھنجلا کر کہا۔ ''ڈیڈ! میں نے پہلے ہی کہا تھا، یہ سر پھری ہے۔ بدمزاج ہے۔ ہم سے دشمنی کرنے کے لئے اس گھر مین پیدا ہوئی ہے۔''

مہناز نے کہا۔ ''ایک بات سمجھ میں نہیں آتی، جب آپ انصاف کر رہے ہیں تو پھر ڈرتے کیوں ہیں؟ جھنجلاتے کیوں ہیں؟''

ممی نے کہا۔ ''مہناز! تم تو ایسی نہیں تھیں۔ کیوں اس کی حمایت میں بولتی رہتی ہو؟''

بھابھی نے کہا۔ ''خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔''

مہناز نے کہا۔ ''جس طرح ماموں جان کو دیکھ کر آپ نے رنگ پکڑا ہے۔''

وہ فورک کو میز پر پٹختے ہوئے بولی۔ ''کیوں میرے ابو کے پیچھے پڑ گئی ہو؟ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ انہوں نے تم دونوں کو یا اس گھر کو کوئی نقصان پہنچایا ہے؟''

بھائی جان نے بیگم کی تائید میں میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ ''ہاں۔ بولو۔ تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟''

''کیا آپ کے پاس مراد انکل کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت ہے کہ انہوں نے ڈیڈ کو نقصان پہنچایا ہے؟ ماموں جان نے ان کے خلاف جو کہہ دیا، جو حساب پیش کر دیا اسی کو آمنا صدقنا مان لیا گیا۔''

بیوی نے فورک کو میز پر پٹخا تھا۔ میاں نے چمچ پٹختے ہوئے کہا۔ ''بس بہت ہو چکا۔ ڈیڈ! ان دونوں کا جو حصہ نکلتا ہے، نکال دیں۔ اس کے بعد ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں رہے گا۔ نہ یہ ہمارے کچن میں پکائیں گی۔ نہ ہمارے برتنوں میں کھائیں گی۔''

میں نے کہا۔ ''اور ایک بات کا اضافہ کریں کہ ہم اس چھت کے نیچے بھی نہیں رہیں گی۔''

ممی نے غصے سے پوچھا۔ ''یہاں نہیں رہو گی تو مہناز کو لے کر کہاں جاؤ گی؟''

''جب ہم یہاں نہیں کھائیں گی تو کیا باہر ہوٹل میں جا کر کھائیں گی؟ ہم آپ کی بیٹیاں ہیں۔ کیا حصہ ملنے کے بعد ہمارا آپ سے رشتہ ختم ہو جائے گا؟ کھسیانی بلی کھمبا نوچتی ہے۔ بھائی جان جھنجلا کر الٹا سیدھا حکم دے رہے ہیں۔''

مہناز کرسی سے اٹھتے ہوئے بولی۔ ''یہ ہمارے باپ کا گھر ہے۔ دیکھتی ہوں، کون ہمارا دانہ پانی بند کرتا ہے؟''

وہ پلٹ کر جانے لگی۔ تب ہی اس نے ایک آواز کے ساتھ گہری سانس کھینچی۔ میں سمجھ گئی، اس کی سانسیں رک رہی ہیں۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر گہری گہری سانسیں کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے انہیلر کی ضرورت تھی۔

میں فوراً ہی دوڑتی ہوئی اس کے بیڈروم سے انہیلر لے آئی۔ وہ اس کے ذریعہ اپنی سانسیں بحال کرنے لگی۔ اس وقت تک ممی، ڈیڈی، نادرہ بھابھی اور بھائی جان بے حس بنے اپنی اپنی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ بے شک، وہ اس کی سانسیں بحال نہیں کر سکتے تھے لیکن قریب آ کر اسے تھپک سکتے تھے۔ حوصلہ دے سکتے تھے۔ ان کی بے حسی اور اختلافات اس حد تک بڑھ گئے تھے کہ انہوں نے بیٹیوں کو جھوٹی ہمدردیوں سے بھی محروم کر دیا گیا ہے۔

دوسرے دن ڈیڈ نے ہم بہنوں کو سب کے سامنے بلایا۔ ایک کاغذ میز پر رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں نے خود ہی اپنا تمام حساب چیک کیا ہے۔ میری موجودہ آمدنی اور اب تک کی جائیداد کے مطابق تم میں سے ہر ایک کا حصہ پچیس لاکھ روپے نکلتا ہے۔ تم دونوں کو پچاس لاکھ ملیں گے۔ ابھی میرے سامنے مراد شاہ کو فون کرو اور پوچھو کہ میں نے انصاف کیا ہے یا نہیں؟''

میں فون کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ریسیور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے لگی۔ انہوں نے کہا۔ ''اور میرے ہوتے ہوئے اس سے زیادہ بات نہ کرنا۔ اگر وہ میرے انصاف کو غلط کہے گا تو پھر میں اسے چیلنج کروں گا۔ وہ کبھی ثابت نہیں کر سکے گا کہ میں تم دونوں سے ناانصافی کر رہا ہوں۔''

رابطہ ہونے پر میں نے کہا۔ ''انکل! آپ کو معلوم ہے کہ ہمیں ہمارا حصہ ملنے والا تھا۔ آج ڈیڈی پچیس لاکھ روپے کے حساب سے ہم دونوں بہنوں کو پچاس لاکھ دے رہے ہیں۔ کیا یہ درست ہے؟''

انہوں نے کہا۔ ''بیٹے! میں تو بیس بائیس لاکھ کا اندازہ کر رہا تھا۔ اگر وہ پچیس لاکھ کے حساب سے دے رہا ہے تو بالکل درست ہے۔ اسے قبول کر لو۔''

''شکریہ انکل! آپ دشمن بن کر ڈیڈ کو غلط بھی کہہ سکتے تھے۔ لیکن بڑی سچائی اور فراخ دلی سے انہیں منصف کہہ رہے ہیں۔''

''بیٹے! تم میرے مشوروں پر چلتی ہو۔ اس لئے ایک مشورہ اور دیتا ہوں۔ ایک ہفتے کے اندر رقم وصول کر لو اور پوری رقم کو فکس ڈپازٹ میں رکھو۔ خدا تمہارے ڈیڈ کو لمبی عمر دے۔ جب تک وہ زندہ ہیں، تمہیں بینک سے رقم نکالنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ یہی رقم دس پندرہ برس میں دگنی ہو جائے گی۔ پچاس لاکھ کے ایک کروڑ ہو جائیں گے تو تمہارے بھائی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں گی۔ تم دونوں بہنیں کبھی کسی کی محتاج نہیں رہو گی۔''

ڈیڈی نے گرج کر پوچھا۔ ''اتنی لمبی باتیں کیا ہو رہی ہیں؟ میں نے تم سے کہا تھا مختصر سی گفتگو کی جائے۔''

میں نے کہا۔ ''سوری انکل! پھر کسی وقت بات کروں گی۔''

میں نے فون بند کر دیا۔ ڈیڈ نے کہا۔ ''میں اسی شرط پر تمہیں یہ رقم دوں گا کہ اب تم کبھی مراد شاہ کے گھر نہیں جاؤ گی۔ کبھی فون کے ذریعے بات نہیں کرو گی۔''

''سوری ڈیڈ! آپ کی پہلی بات منظور ہے کہ میں ان کے گھر نہیں جاؤں گی لیکن فون کے ذریعے ضرور رابطہ رکھوں گی۔ مجھے برے وقت کے لئے کسی کو تو سہارا بنا کر رکھنا ہی ہو گا۔''

''جب میں تمہارے ساتھ ہوں۔ تمہارے ساتھ انصاف کر رہا ہوں تو دشمن کا سہارا کیوں لے رہی ہو؟''

''اللہ تعالیٰ آپ کو لمبی عمر عطا کرے۔ ابھی مراد انکل بھی آپ کے لئے یہی دعا کر رہے تھے۔ لیکن ڈیڈ! آپ کے بعد کیا ہو گا؟''

مہناز نے میز پر سے اس کاغذ کو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔ ''ہمیں صرف یہ کاغذ ہی ملے گا یا پچاس لاکھ روپے بھی ملیں گے؟''

ڈیڈی نے کہا۔ ''رقم جلدی مل جائے گی۔''

میں نے کہا۔ ''ڈیڈ! میں آپ سے وعدہ کر رہی ہوں کہ مراد انکل کے گھر کبھی نہیں جاؤں گی۔ آپ بھی میری بات مان لیں، ایک ہفتے کے اندر ہمیں یہ رقم ادا کر دیں۔''

بھائی جان نے ناگواری سے پوچھا۔ ''ایسی جلدی بھی کیا ہے؟''

میں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''پلیز۔ آپ ہمارے درمیان نہ بولیں۔ میں نے اچھی طرح معلوم کیا ہے۔ ماشاءاللہ کاروبار عروج پر ہے۔ پچاس لاکھ کی ادائیگی گراں نہیں گزرے گی۔ بس اس سے آگے میں کوئی بحث کرنا نہیں چاہتی۔''

ممی نے کہا۔ ''یہ تو بس ہماری کمزوریوں سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ اچھی طرح جانتی ہے کہ ہم انہیں باہر نکلنے نہیں دیں گے۔ اپنی بدنامی برداشت نہیں کریں گے۔ اس لئے یہ ہمیں بلیک میل کر رہی ہے۔''

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ مہناز کا ہاتھ پکڑ کر وہاں سے چلی آئی۔ ایک ہفتے بعد ہم بہنوں کو پچیس پچیس لاکھ کے دو چیک مل گئے۔ مہناز نے اپنا چیک مجھے دیتے ہوئے کہا۔ ''آپی! آپ اپنے ہی اکاؤنٹ میں فکس ڈپازٹ کر دیں۔ میں کم سے کم دس برس تک اس میں سے ایک پیسہ بھی نہیں لوں گی۔''

''دس برس میں تمہارے میاں اور سسرال والے ناک میں دم کر دیں گے۔ بار بار رقم کا تقاضہ کریں گے۔''

''ہاں۔ وہ ایسا کر سکتے ہیں لیکن انہیں صبر آ جائے گا اور یہ بات سمجھ میں آ جائے گی کہ دس برس بعد دگنی رقم ملنے والی ہے۔''

اس دن کے بعد ہماری محاذ آرائی اور مستحکم ہو گئی۔ ہم ایک ہی چھت کے نیچے ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کے روادار نہیں تھے۔ کبھی سامنا ہوتا تو یوں کترا کر نکل جاتے تھے، جیسے چھو بھی لیا تو ایک دوسرے کی بیماری لگ جائے گی۔ ہم بہنیں یہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ ڈیڈی کی زندگی میں ہمیں برداشت کیا جا رہا ہے۔ ان کے بعد پتہ نہیں ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ خدا کا شکر ہے، مراد انکل کا ہاتھ ہمارے سروں پر تھا اور بینک میں اتنی رقم تھی کہ ہم کسی کی محتاجی کے بغیر تنہا زندگی گزار سکتی تھیں۔

ان سارے ہنگاموں کے دوران میرا رابطہ جمال سے بھی رہا کرتا تھا۔ ہم رات کو اسی طرح فون کے ذریعے رابطہ کرتے تھے اور وہ ایک ہی بات پوچھتے تھے۔ ''ایسا کب تک ہوتا رہے گا؟ تم نے میرے بغیر شادی نہ کرنے کی قسم کھا لی ہے اور حالات بتا رہے ہیں، بزرگوں کی دشمنی برسوں چلتی رہے گی۔ آخر کب تک بن بیاہی بیٹھی رہو گی؟''

''آپ میری فکر نہ کریں۔ کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر اسے لائف پارٹنر بنا لیں۔''

''میں صرف ایسی ہی شریکِ حیات چاہوں گا جو میری خاطر ساری دنیا سے لڑتی ہو اور

وہ تم ہو۔صرف تم ہو۔تم حالات کے سازگار ہونے کا انتظار کر رہی ہو۔میں تمہارا انتظار کرتا رہوں گا۔"

میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میرے انتظار میں شادی نہ کریں لیکن یہ سن کر اچھا لگ رہا تھا۔ وہ برسوں میرا انتظار کرنا چاہتے تھے۔اپنے چاہنے والے کی زبان سے اور اس کے عمل سے ہی اپنی قدر و منزلت کا پتہ چلتا ہے۔

میں نے پوچھا۔"فرض کریں، میں دس یا بیس برس میں بھی نہ مل سکی، تب آپ کیا کریں گے؟"

"محبت میں پالینا ضروری نہیں ہوتا۔ جسے چاہو، وہ ملتے ملتے بھی نہ ملے تو محبت اور شدید ہوتی چلی جاتی ہے۔ پتہ ہے میں کیا سوچتا ہوں؟"

"کیا سوچتے ہیں؟"

یہی کہ......

محبت بندگی ہے۔اس میں تن کا قرب نہ مانگو
کہ جس کو چھو لیا جائے، اسے پوجا نہیں کرتے

میں نے کہا۔"شاعری کی حد تک تو جذباتی باتیں درست ہیں، لیکن مرد کو اپنی نسل آگے بڑھانے کے لئے شادی کرنی ہی پڑتی ہے۔"

"ہماری دنیا میں کتنی ہی قومیں اور نسلیں پیدا ہوئیں اور ہمیشہ کے لئے نیست و نابود ہو گئیں۔آج ان کا نام و نشان بھی نہیں ہے۔ایک میری نسل آگے نہیں بڑھے گی تو کون سی قیامت آ جائے گی؟تم میرے لئے اپنے پورے خاندان سے لڑ سکتی ہو، اپنی پوری زندگی داؤ پر لگا سکتی ہو تو میں اپنے ساتھ اپنی نسل کو بھی داؤ پر لگا سکتا ہوں۔"

ان کی زبان سے ایسی باتیں سن سن کر میں ہواؤں میں اُڑنے لگتی تھی۔ایسا لگتا تھا، ذرا ہاتھ اوپر کروں گی تو ستاروں کو چھو لوں گی۔میں پیدا ہونے کے بعد اتنی اہم نہیں تھی۔انہوں نے میری زندگی میں آتے ہی مجھے سب سے زیادہ اہم بنا دیا تھا۔

وہ بولے۔"کل ہم سوات کے علاقوں میں جا رہے ہیں۔تقریباً دو ہفتوں کے بعد واپسی ہوگی۔"

"یہ اچانک سوات جانے کا پروگرام کیسے بن گیا؟"

"ممی اور ڈیڈ گرمیاں وہاں گزارنا چاہتے تھے۔کاروباری مصروفیات اتنی زیادہ ہیں کہ

یہ شہر چھوڑنا مشکل ہو جاتا ہے۔پھر بھی ہم نے سوچا ہے، کم سے کم دو ہفتے تو تفریح کے لئے نکال ہی لیں۔کل مجھے سی آف کرنے آؤ گی؟"

"میں نے ڈیڈی سے وعدہ کیا ہے، انکل کے گھر کبھی نہیں جاؤں گی۔"

"گھر نہ آؤ کہیں باہر تھوڑی دیر کے لئے ملاقات ہو جائے۔"

"کل سنڈے ہے۔ ڈیڈ اور بھائی جان سب ہی گھر میں ہوں گے۔ میں یونیورسٹی جانے کا بہانہ بھی نہیں کر سکوں گی۔ کسی سہیلی کے گھر جانے کا بہانہ کروں گی تو ممی ساتھ ہو جائیں گی۔"

"بڑی مشکل ہے۔تمہارے گھر میں تو فون پر بھی پہرہ دیا جاتا ہے۔کل رات کو سفر کے دوران کسی بڑے شہر سے گزر ہوگا تو فون ضرور کروں گا۔"

"وعدہ کریں، سوات پہنچ کر بھی آپ فون کریں گے۔ میں انتظار کیا کروں گی۔اب ریسیور رکھتی ہوں۔ بہت وقت ہو چکا ہے۔"

میں رابطہ ختم کرتے وقت کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ جمال سے آخری بار فون پر گفتگو ہو رہی ہے۔دوسری رات اپنے مقررہ وقت کے مطابق فون کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ایک گھنٹہ گزر گیا۔دو گھنٹے گزر گئے۔صبح ہو گئی۔مگر انہوں نے کہیں سے رابطہ نہیں کیا۔میں نے سوچا۔"کوئی مجبوری ہوگی۔سوات پہنچ کر سب سے پہلے مجھے فون کے ذریعے اپنی آواز سنائیں گے۔"

دوسرا دن دوسری رات بھی گزر گئی۔اب دل گھبرانے لگا۔"یا اللہ خیر ہو۔وہ کہیں سے کال کیوں نہیں کر رہے ہیں؟"

چوتھے دن ڈیڈی نے مجھے ڈرائنگ روم سے آواز دی۔"ناز! جلدی آؤ۔تمہارا فون ہے۔"

میں دھڑکتے دل کے ساتھ تیزی سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔ڈیڈ بہت خوش تھے۔چہک کر بولے۔"بھئی! ہمارے لئے تو بہت بڑی خوشخبری ہے۔اب تمہارے لئے کیا ہے......؟ فون پر سن لو۔"

میں نے لپک کر ریسیور لیا۔پھر کان سے لگاتے ہوئے پوچھا۔"ہیلو......!"

دوسری طرف سے جمال کے انکل کی آواز سنائی دی۔"بیٹی ناز! بہت بری خبر ہے۔میں جانتا ہوں، تم جمال کو کس قدر چاہتی ہو؟ پتہ نہیں، یہ صدمہ کیسے برداشت کرو گی؟ لیکن بتانا تو ہوگا۔ بھائی جان، بھابی جان اور جمال پہاڑی راستے میں ہلاک ہو گئے ہیں۔ان کی گاڑی سینکڑوں فٹ کی بلندی سے نیچے ایسی کھائی میں گری ہے کہ ان کی لاشوں کا بھی پتہ نہیں

چل رہا ہے۔"

میرے حلق سے ایک زور کی چیخ نکلی۔ "نہیں۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ وہ نہیں مرسکتے۔ وہ کبھی نہیں مرسکتے۔ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتے۔"

میں فون پر رونے لگی۔ ان سے التجا کرنے لگی۔ "انکل! خدا کے لئے کہہ دیں، یہ سب جھوٹ ہے۔ انہیں کچھ نہیں ہوا ہے۔ وہ سب زندہ سلامت ہیں۔"

"بیٹی! ہونی ہوکر رہتی ہے۔ جو ہونا تھا، وہ ہو چکا ہے۔ ہم بھی صبر کر رہے ہیں۔ تمہیں بھی صبر کرنا ہوگا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔"

ریسیور میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ میں چکرا کر صوفے پر بیٹھ گئی۔

آہ۔ یہ کیسا فریب تھا؟ زندگی تو تمام عمر فریب دیتی ہی رہتی ہے۔ موت نے بھی یہ کیسا فریب دیا تھا؟

☆======☆======☆

میں اس چبوترے پر اپنے پاس بیٹھے ہوئے جمال کو دیکھ رہی تھی۔ پچھلے چالیس برس سے ان کی موت کا فریب کھاتی رہی تھی۔ اب وہ اچانک ہی موت کی تاریکی سے نکل کر سامنے آگئے تھے۔ انہیں دوبارہ پالینے کا یقین ہونے کے بعد ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے صدیوں کے فاصلے مٹ گئے ہوں۔ چالیس برس کیسے گزر گئے پتہ ہی نہ چلا؟ یوں لگ رہا تھا، صبح جو جھوٹ تھا۔ وہ شام کو سچ ہوگیا ہے۔

یہ وقت بھی کیا چیز ہے؟ رُلاتا ہی رہتا ہے۔ بس رُلاتا ہی رہتا ہے۔ پھر ایک پل میں مسکرا کر صدیوں کے آنسو پونچھ ڈالتا ہے۔

میں نے پوچھا۔ "کیا ہوگیا تھا؟ آپ کہاں گم ہوگئے تھے؟"

انہوں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ "اسے مقدر کی ہیرا پھیری سمجھو۔ تقدیر نے ہمیں بھٹکا دیا تھا۔ اتنے برس تک گردش میں رہنا تھا۔ شاید ہم گردش سے نکل آئے ہیں۔ میں نے تم سے ایک ... ہ کیا تھا، سفر کے دوران جہاں بھی موقع ملے گا، تم سے رابطہ کروں گا لیکن اس رات موقع نہ ملا۔"

انہوں نے ایک ذرا توقف سے کہا۔ "دوسرے دن ہم مالاکنڈ ایجنسی پہنچے۔ ڈیڈ نے اپنے منیجر سے فون پر رابطہ کیا تو اس نے کہا...... ہم نے دسویں جماعت کی ایک ٹیکسٹ بک شائع کرنے کے لئے جو کوٹیشن دیا تھا۔ وہ منظور ہو چکا ہے۔ جمال میاں کو پیپر سائن کرنے

کے لئے فوراً یہاں آنا ہوگا۔"

ڈیڈ نے خوش ہوکر کہا۔ "ہمیں ایک ہی کتاب کے ذریعے لاکھوں روپے کمانے کا موقع مل رہا ہے۔ ابھی یہاں سے واپس جانا چاہئے۔ وہاں تمہیں ضروری کاغذات سائن کرنے ہوں گے۔"

میں نے کہا۔ "اب اتنی دور آگئے ہیں۔ پہاڑی علاقے میں پہنچ گئے ہیں۔ آپ دونوں کیوں جائیں گے؟ میں تنہا چلا جاؤں گا۔ وہاں پیپر سائن کرکے دوسرے ضروری کام نمٹا کر پھر آپ کے پاس آجاؤں گا۔"

انہوں نے کہا۔ "ٹھیک ہے۔ تم گاڑی لے جاؤ۔ ہم کسی کوچ میں چلے جائیں گے۔"

"نہیں ڈیڈ! یہ انجانی جگہ ہے۔ پہاڑی علاقے میں اِدھر سے اُدھر جانے کے لئے اپنی ذاتی گاڑی ضروری ہے۔ میں کوچ میں چلا جاؤں گا۔ یہاں سے دو گھنٹے میں پشاور پہنچوں گا۔ وہاں سے بائی ایئر کراچی پہنچنے میں ڈیڑھ گھنٹہ لگے گا۔"

ممی اور ڈیڈ کار میں بیٹھ کر وہاں سے جانے لگے۔ میں سڑک کے کنارے کھڑا ہوکر انہیں جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میرے ایک طرف میدانی علاقہ اور پہاڑیاں تھیں اور دوسری طرف گہری کھائی تھی۔ مالاکنڈ کے تمام راستے ایسے ہی ہیں۔ ایک طرف پہاڑی ہوتی ہے۔ دوسری طرف گہری کھائی۔ کہیں دس فٹ اور کہیں بارہ فٹ چوڑی سڑک ہوتی ہے۔ اسی پر سے تمام چھوٹی بڑی گاڑیاں آتی جاتی ہیں۔ مالاکنڈ کا راستہ جتنا پختہ ہے، اتنا ہی خطرناک بھی ہے۔ ہر دو منٹ کے بعد خطرناک موڑ آتے رہتے ہیں۔ ڈیڈی کی کار اسی سڑک پر جارہی تھی۔ ایسے ہی وقت شاید ان کے ہاتھ سے اسٹیئرنگ بہک گیا۔ کار ذرا اِدھر سے اُدھر ہوئی۔ پھر نیچے گہری کھائی میں گرتی چلی گئی۔ میرے حلق سے ایک چیخ نکلی۔ میں دوڑتا ہوا اُدھر جانے لگا۔ ممی اور ڈیڈ کو آوازیں دینے لگا۔ مگر وہ میری آوازوں سے بہت دور جاچکے تھے۔ اتنی گہری کھائی میں پہنچ چکے تھے کہ زندگی کی طرف کبھی لوٹ کر نہیں آسکتے تھے۔"

جمال اتنا کہہ کر چپ ہوگئے۔ سر جھکائے بیٹھے رہے۔ شاید ماں باپ کی موت کا غم تازہ ہوگیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "آپ نے مجھ سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟"

"میں پولیس اور وہاں کے رضاکاروں کے ساتھ مصروف ہوگیا تھا۔ وہ کوششیں کر رہے تھے کہ گہری کھائی سے لاشیں نکال کر لائی جاسکیں لیکن انتہائی پستی میں قد آور گھنی کانٹے دار جھاڑیاں تھیں۔ وہاں تک کوئی نہیں جاسکتا تھا۔ دوپہر سے شام اور شام سے دوسری صبح ہو

گئی۔ تب مایوسی ہوئی کہ ان کی لاشیں نہیں مل سکیں گی۔ پھر میں نے فون پر تم سے رابطہ کیا تو تمہارے بھائی جان کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے غصے سے گالیاں دیں اور کہا کہ ذرا بھی غیرت ہے تو دوبارہ یہاں فون نہ کرنا۔''

انہوں نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھ گیا، وہ کبھی تم سے بات کرنے نہیں دیں گے۔ بہتر یہی ہے کہ رات کے وقت فون کیا جائے۔''

میں نے کہا۔ ''آپ کے انکل نے فون پر اطلاع دی تھی کہ آپ تینوں اس حادثے کا شکار ہو گئے ہیں؟''

''میں نے وہاں کے پولیس اسٹیشن میں اپنا اور اپنے انکل کا پتہ اور فون نمبر لکھوایا تھا۔ شاید پولیس والوں نے انکل کو خبر دی ہوگی اور یقیناً یہ بتانا بھول گئے ہوں گے کہ میں بچ گیا ہوں۔''

''آپ کراچی تو واپس آئے ہوں گے۔ پھر مجھ سے کیوں نہیں ملے؟''

''ہاں۔ میں واپس آیا تھا۔ مالاکنڈ سے پشاور پہنچا تو وہاں دوسرے دن کی فلائٹ میں سیٹ ملی۔ اس رات ہوٹل میں رہا۔ سوچا تھا، رات کے تین بجے فون پر تم سے بات کروں گا لیکن پچھلے اڑتالیس گھنٹوں سے جاگ رہا تھا۔ بیڈ پر لیٹتے ہی ایسی نیند آئی کہ رات سے صبح ہو گئی۔ جاگنے کے بعد افسوس ہوا کہ پچھلی رات بھی تم سے رابطہ نہ کر سکا۔ دوپہر کو کراچی پہنچتے ہی سیدھا تمہاری کوٹھی کی طرف آیا۔ آہ...... وہاں پہنچتے ہی دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ وہاں تمہارا جنازہ اٹھایا جا رہا تھا۔''

میں نے چونک کر پوچھا۔ ''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''سچ کہہ رہا ہوں۔ اس جنازے کو کوٹھی کے احاطے کے باہر لایا گیا تھا اور اسے ایک گاڑی میں رکھا جا رہا تھا۔ تمہارے ڈیڈی، بھائی جان سب ہی موجود تھے۔ میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ کس کی موت ہوئی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ افضل حیات کی صاحبزادی کا انتقال ہو گیا ہے۔ تمہارے ڈیڈی مجھے دیکھ کر تیزی سے قریب آئے پھر غصے سے بولے۔

''یہاں کیوں آئے ہو؟''

میں صدمے سے ٹوٹ رہا تھا۔ آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ لوگوں نے میری ناز کو مار ڈالا ہے۔''

میری اس بات پر انہوں نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پھر آس پاس چور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ دوسرے سنیں گے تو کیا کہیں گے؟ موت ہماری تمہاری

مرضی سے نہیں آتی۔ ناز کی زندگی اتنی ہی تھی۔ اس کے لئے دعا کرو اور صبر کرو۔ چلو گاڑی میں بیٹھو۔ میں دشمنی بھلا کر تمہیں قبرستان تک چلنے کی اجازت دے رہا ہوں۔''

میں یہ باتیں سن رہی تھی اور حیرانی سے منہ کھولے انہیں تک رہی تھی۔ پھر میں نے کہا۔

''یا خدا! اتنا بڑا دھوکہ۔ وہ میں نہیں تھی۔ مہناز تھی۔ اس روز سیڑھیوں سے گر پڑی تھی۔ نیچے پہنچتے ہی اس کی سانسیں رکنے لگی تھیں۔ میں دوڑ کر انہیلر لینے گئی تو دیر ہو گئی۔ میری واپسی تک اس کا دم نکل چکا تھا۔''

انہوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''بات سمجھ میں آ رہی ہے۔ تمہارے ڈیڈی نے بروقت ایک جھوٹ بول کر ہمارے درمیان برسوں کا فاصلہ پیدا کر دیا۔ وہ قبرستان پہنچنے تک میرے ساتھ لگے رہے اور مجھے یہی سمجھاتے رہے کہ میں وہاں کسی کے سامنے ناز کا نام نہ لوں۔ مرنے کے بعد اسے بدنام نہ کروں کہ وہ میرے عشق میں مبتلا تھی۔ ایک مرنے والی نے اپنی زندگی میں محبت کی...... اچھا کیا یا برا کیا۔ مگر اب اس کا نام نہ لیا جائے۔ ہمارے معاشرے میں پیار کرنے والی شریف زادیاں بدنام ہو جاتی ہیں اور میں تمہیں بدنام کرنا نہیں چاہتا تھا۔ دنیا والوں کے سامنے ماتم کر کے یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ اندر سے کس قدر زخمی ہو چکا ہوں؟''

میں نے پوچھا۔ ''آپ کو ایک ذرا خیال نہیں آیا کہ میری ایک بہن مہناز ہے۔ اس کا انتقال ہو سکتا ہے؟''

''کیسے خیال آتا؟ تمہارے ڈیڈی اور بھائی جان نے پہلے ہی آنسو بہا کر تمہارا نام لے کر یہ یقین دلا دیا تھا کہ موت تمہاری ہی ہوئی ہے۔ پھر میں مہناز کے بارے میں کیسے سوچتا؟''

''آپ نے اس رات بھی یہی سوچ کر فون نہیں کیا کہ مر چکی ہوں؟''

''میں اس رات فون کے پاس ہی بیٹھا رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا، جیسے تمہیں دیکھ رہا ہوں اور اب تب میں تم سے بات ہونے والی ہے۔''

''میں بھی اس رات فون کے پاس بیٹھی رہی تھی اور آپ کو یاد کرتی رہی تھی۔''

ہائے......! یادوں کو یاد نہ کرو۔ یہ گزرے ہوئے کل سے آتی ہیں۔ پھر ہمارے آج اور کل کو بے کل کر دیتی ہیں۔

کل کا باسی کھانا کتنا ہی تازہ دکھائی دے۔ وہ زہریلا ہوتا ہے۔ باسی یادیں فوڈ پوائزن بن کر جینا حرام کر دیتی ہیں۔ میں اس خاموش فون کو دیکھ دیکھ کر روتی رہی تھی۔

جمال نے کہا۔ ''میں بھی فون کو دیکھ رہا تھا۔ آخر مجھ سے صبر نہ ہو سکا۔ میں نے سوچا،

جب سننے والا کوئی نہیں ہوتا تو کیا ہم دیواروں سے باتیں نہیں کرتے؟...... ہاں، کرتے ہیں...... میں نے ریسیور اٹھا کر تمہارے گھر کے نمبر پنچ کیے۔ ایک بار نہیں کئی بار رابطہ کیا مگر ناکامی ہوتی رہی۔ ٹیلی فون ایکسچینج میں ڈیڈ کے ایک جاننے والے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ ذرا معلوم کیا جائے، اس نمبر پر رابطہ کیوں نہیں ہو رہا ہے؟ انہوں نے تھوڑی دیر بعد ہی مجھے بتایا کہ وہ نمبر کسی وجہ سے بند ہو چکا ہے۔ کل لائن مین کسی وقت جا کر چیک کرے گا۔"

میں نے کہا۔"میں نے بھی بے چین ہو کر ریسیور اٹھا لیا تھا۔ آپ کے نمبر ڈائل کرنا چاہتی تھی لیکن اسے کان سے لگاتے ہی پتہ چلا کہ وہ مردہ ہو چکا ہے۔ آپ کے گھر تک میری آواز نہیں پہنچا سکے گا۔"

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔"اب پتہ چل رہا ہے، ڈیڈی اور بھائی جان کی سازش تھی۔ انہوں نے ٹیلی فون کے تار کاٹ دیئے تھے۔ پھر دوسرے دن جب فون لگایا گیا تو اس کا نمبر بدل چکا تھا۔"

انہوں نے بڑے دکھ سے کہا۔"یہ سب کیا ہوتا رہا؟ میں نے پھر تمہارے گھر فون نہیں کیا۔ آخر کیوں کرتا؟ میں نے قبرستان کے گیٹ سے قبر تک تمہارے جنازے کو کاندھا دیا تھا۔ پھر میری آنکھوں کے سامنے تمہیں قبر میں اتارا گیا تھا۔ غیر مرد عورت کا آخری دیدار نہیں کرتے۔ تمہارے ڈیڈ اور بھائی جان نے دیدار کیا، لیکن مجھے نہیں کرنے دیا۔ میں نے لوگوں کی موجودگی میں ضد نہیں کی۔ پھر یہ دین کے خلاف بھی تھا۔ یا اللہ! میں نے کتنا زبردست دھوکہ کھایا تھا؟"

ہم دونوں کو ہی کچھ تو تقدیر نے اور کچھ ہمارے گھر والوں نے دھوکہ دیا تھا۔ حالات کی ایسی مار پڑی تھی کہ ہمارے سر جھک گئے تھے۔ ہم تھوڑی دیر تک چپ رہے۔ پھر انہوں نے کہا۔"ناز! جو ہونا تھا، وہ تو ہو گیا۔ اب ہم دشمنی کرنے والوں کو نہ تو سزا دے سکتے ہیں، نہ کوئی شکایت کر سکتے ہیں۔"

میں نے کہا۔"ظلم کرنے والوں کو کبھی کبھی اسی دنیا میں سزا مل جاتی ہے۔ شادی کے تین برس بعد بھی نادرہ بھابھی ماں نہ بن سکیں تو پہلے ممی کے تیور بدلے۔ پھر بھائی جان بھی بد دل ہونے لگے۔ ایسے [illegible] ماموں جان نے پھر ایک بار فراڈ کیا۔ بھائی جان نے انہیں پورے حساب کتاب کے ساتھ پکڑ لیا۔ اپنے دفتر سے ان کی چھٹی کر دی۔ صاف صاف کہہ دیا کہ انہوں نے جو دس لاکھ روپے کی ہیرا پھیری کی ہے۔ اگر وہ رقم ادا نہ کی گئی تو ان کی بیٹی کو

طلاق دے دی جائے گی۔"

وقت اور حالات کے ساتھ انسان کا مزاج بدلتا رہتا ہے۔ وہی ممی جو بہو کو سر پر بٹھا کر رکھتی تھیں۔ پوتا یا پوتی نہ ہونے کی وجہ سے انہیں نظروں سے گرا دیا۔ ماموں جان نے بھی وہ دس لاکھ ادا نہیں کئے اور پانچ برس کے بعد بھی بھابھی ماں نہ بن سکیں تو انہیں طلاق دے دی گئی۔ اس دوران ڈیڈی کا انتقال ہو چکا تھا۔ ممی بھی پوتا پوتی کی حسرت لئے اس دنیا سے چل بسیں۔

اور بھائی جان میرے سامنے شرمندہ سے رہتے تھے۔ میں نے مشورہ دیا کہ اولاد کے لئے انہیں دوسری شادی کر لینی چاہئے۔ پھر میں ہی ان کے لئے اپنی پسند سے ایک دلہن لے آئی۔ آج اس بھابھی سے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ چھوٹا بیٹا یاسر ہے۔ وہ تو میری جان ہے۔ دن رات مجھ سے لگا رہتا ہے۔ ماں سے زیادہ مجھے چاہتا ہے۔ میرے لئے ان سے لڑتا ہے کہ مجھے اسٹور روم میں کیوں رکھا گیا ہے؟ مجھ سے گھر کا کام کیوں کرایا جاتا ہے؟"

جمال نے چونک کر پوچھا۔"کیا یہاں تمہارے ساتھ ملازموں جیسا برتاؤ کیا جاتا ہے؟"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے کہا۔"ہاں۔ بھائی جان اپنی فطرت سے باز نہیں آئے۔ چالیس برس پہلے میں نے اپنے اکاؤنٹ میں پچاس لاکھ روپے جمع کئے تھے۔ آج وہ ایک کروڑ بیس لاکھ ہو چکے ہیں۔ بھائی جان نے کئی بار اپنے کاروبار کے لئے مجھ سے رقم مانگی لیکن میں نے انکار کر دیا۔ میں نے یہ طے کیا ہے، یاسر تعلیم سے فارغ ہو کر کوئی کاروبار کرنا چاہے گا تو وہ تمام رقم اسے دوں گی۔ بہر حال بھائی جان پھر میرے دشمن ہو گئے ہیں۔ میں یہاں کھانے پینے اور رہنے سہنے کے سلسلے میں پانچ ہزار روپے ماہانہ دیتی ہوں۔ تب مجھے اسٹور روم میں رہنے کو جگہ ملی ہے۔ میں اپنی کہانی کیا سناؤں؟ میری بات چھوڑیں۔ اپنی سنائیں کب شادی کی؟ کتنے بچے ہیں؟"

"تم نے کب شادی کی اور تمہارے کتنے بچے ہیں؟"

"میں ایک بار جو بات کہہ دیتی ہوں۔ پتھر کی لکیر بن جاتی ہے۔ میں نے اب تک شادی نہیں کی ہے۔"

"اور میں نے بھی نہیں کی ہے۔"

میں نے چونک کر انہیں دیکھا۔ پھر پوچھا۔"آپ نے شادی نہیں کی؟ اپنی نسل آگے نہیں بڑھائی؟"

"ہاں۔ اور دیکھو! ایک شخص کے نسل نہ بڑھانے سے کوئی قیامت تو نہیں آ گئی۔ دنیا

اپنے حال میں مست ہے۔ ویسی کی ویسی رواں دواں ہے۔“

”کیا آپ تنہا ہیں؟“

”نہیں۔ میرے انکل کے بیٹے، بیٹیاں اور بہوئیں ہیں۔ پھر میری ایک بھتیجی نائلہ ہے۔ جس طرح تمہارا بھتیجا یاسر تمہاری جان ہے۔ اسی طرح میری نائلہ میری جان ہے...... اور ہاں۔ یاد آیا۔ اس گھر میں ایک ہیرو ٹائپ کا نوجوان ہے۔ موٹر سائیکل دوڑاتا پھرتا ہے۔ کیا وہی یاسر ہے؟“

”ہاں۔ وہی ہے۔ کیا آپ نے اسے دیکھا ہے؟“

”ارے کچھ نہ پوچھو۔ یہ اوپر والا اسی کا کمرہ ہے ناں؟ ادھر میری کوٹھی کی طرف دیکھو۔ اوپر والا میری بھتیجی کا کمرہ ہے۔ دونوں اپنے کمروں کی کھڑکیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے ہیں اور موبائل فون کے ذریعے بات کرتے ہیں۔“

پھر انہوں نے ایک سرد آہ بھر کر کہا۔ ”ہمارے وقت میں یہ موبائل فون نہیں تھا۔ اگر ہوتا تو ہم اتنے برسوں تک ایک دوسرے سے دور نہ رہتے۔ ٹیلی فون کے تار کاٹ کر اور فون کا نمبر بدل کر ہمیں چالیس برس کے لئے جدائی کے اندھیرے میں پھینک دیا گیا۔“

دروازے پر آہٹ سنائی دی۔ میں نے سر گھما کر دیکھا۔ وہاں یاسر کھڑا ہوا تھا۔ وہ میرے پاس آ کر چبوترے پر دوزانو بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”پھوپھی اماں! آپ تو میرے بلیڈ کا پیکٹ تلاش کرنے آئی تھیں اور یہیں بیٹھی رہ گئیں؟“

”بیٹے! حضرت موسیٰ کلیم اللہ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ آگ لینے گئے تھے۔ انہیں پیغمبری مل گئی۔ میں تمہارے بلیڈ کا پیکٹ تلاش کرنے آئی تھی اور مجھے یہ مل گئے۔ تمہیں ابھی بتاتی ہوں، یہ میرے لئے کتنے اہم ہیں۔“

یاسر نے کہا۔ ”آپ مجھے کچھ نہ بتائیں۔ میں وہاں دروازے کے پیچھے کھڑا آپ دونوں کی ساری باتیں سن چکا ہوں۔ خدا کی قسم پھوپھی اماں! آپ نے جیسی محبت کی ہے۔ ویسی نہ میں نے کسی کتاب میں پڑھی ہے۔ نہ ہی کسی سے سنی ہے۔“

پھر اس نے جمال کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ”انکل! آئی لو یو۔ آپ نے بھی محبت کی انتہا کی ہے۔ آپ دونوں کو دیکھ کر بھی یقین نہیں آ رہا ہے کہ اس بڑھاپے میں کنوارے ہیں۔“

میں نے اس کے گال پر ایک ہلکی سی چپت مارتے ہوئے کہا۔ ”بس۔ زیادہ نہ بول۔ یہ تُو کھڑکی کے پاس کھڑا کیا کرتا رہتا ہے؟ ان کی بھتیجی کو دیکھتا ہے؟ اور فون پر لمبی لمبی باتیں کرتا ہے؟“

وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ”ہم آپ لوگوں کی طرح گھر والوں اور دنیا والوں سے نہیں ڈرتے۔ محبت کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ میں نے ممی سے صاف صاف کہہ دیا، شادی کروں گا تو نائلہ سے......اور نائلہ نے بھی اپنی ممی سے یہی کہا ہے۔“

جمال نے کہا۔ ”ممی سے نہیں، مجھ سے کہا ہے۔ میں اس کے دل کی بات اس کے والدین تک پہنچانے والا ہوں۔ مگر اس سے پہلے معلوم کرنا چاہتا تھا کہ تم کون ہو؟ کس خاندان سے تعلق رکھتے ہو؟ اب تو ایک ہی ملاقات میں تمہارے خاندان کی پوری ہسٹری معلوم ہوگئی ہے۔“

وہ ذرا جھینپ کر بولا۔ ”مجھے شرمندگی ہے کہ میرے ڈیڈ نے پھوپھی اماں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ آپ ان سے پوچھ لیں، میں ان کی خاطر ممی ڈیڈی سے ہمیشہ ناراض رہتا ہوں۔ ان کی کوئی بات نہیں مانتا۔ اپنی من مانی کرتا ہوں۔“

جمال نے کہا۔ ”یہ تو کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ تمہیں اپنے بزرگوں سے گستاخی نہیں کرنی چاہئے۔“

”میں گستاخی نہیں کرتا۔ وہ جیسے ہیں، ویسا ہی ردِعمل پیش کرتا ہوں۔ صاف صاف کہہ دیتا ہوں، ان کا ادب تو کروں گا لیکن جب تک پھوپھی اماں کو عزت نہیں دی جائے گی۔ تب تک ان کی مخالفت کرتا رہوں گا۔ اب وہ زمانہ نہیں ہے انکل! کہ بزرگ حضرات غلطی بھی کر رہے ہوں تو ہم سر جھکا کر تسلیم کر لیں کہ وہ جو کر رہے ہیں، درست کر رہے ہیں۔ ہم تو غلط کو ہر حال میں غلط ہی کہیں گے۔“

اس نے اپنا سر میرے شانے پر رکھ دیا۔ میں نے اس کے سر کو سہلاتے ہوئے کہا۔ ”اچھا اب بس کر۔ بہت زیادہ بولنے لگا ہے۔“

پھر میں نے جمال سے کہا۔ ”گھر کا ماحول سازگار نہیں ہے۔ ورنہ میں آپ کو اندر بلاتی۔ چائے یا ٹھنڈا پلاتی۔“

یاسر نے جلدی سے کہا۔ ”اب ماحول سازگار ہو جائے گا۔ کل ویلینٹائن ڈے ہے۔ میں نے اپنی گرل فرینڈز اور بوائے فرینڈز کو انوائیٹ کیا ہے۔ انکل! نائلہ نے بھی آنے کا وعدہ کیا ہے۔ آپ اسے روکیں گے تو نہیں......؟“

جمال نے اس کے شانے کو تھپک کر کہا۔ ”نہیں بیٹے! میں اسے تمہارے دروازے تک چھوڑنے آؤں گا۔“

"اور آپ دروازے کے اندر بھی آئیں گے۔ ہم نوجوانوں کے ساتھ انجوائے کریں گے۔"

جمال نے مسکرا کر کہا۔ "یہ کیا کہہ رہے ہو بیٹے! ہمارے وقت میں ویلنٹائن ڈے اتنے جوش و خروش سے نہیں منایا جاتا تھا۔ ہم نے تو کبھی نہیں منایا۔ اب اس بڑھاپے میں کیا انجوائے کریں گے؟"

"آپ انکار نہ کریں۔ کل پھوپھی اماں بھی ہوں گی۔ میں ممی ڈیڈی کو بھی مجبور کروں گا کہ وہاں موجود رہیں۔"

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "میرا یاسر کہہ رہا ہے تو آپ کو ماننا ہی ہوگا۔ کل آپ اپنی بھتیجی کے ساتھ ہمارے گھر آئیں گے۔"

یاسر نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "بس یہ طے ہوگیا۔ اب میں جا رہا ہوں۔"

وہ وہاں سے چلا گیا۔ میں نے کہا۔ "آپ نے تو دیکھا ہی ہوگا۔ ہر سال چودہ فروری کو محبت کرنے والے لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور لڑکا اپنی چاہنے والی کو گلاب کی ایک سرخ کلی پیش کرتا ہے۔"

"میں نے اس دن کے بارے میں پڑھا ہے۔ سنا ہے۔ مگر کبھی ان نوجوانوں کی پارٹی اٹینڈ نہیں کی۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔ "کل ہم دونوں اس گھر میں دیکھیں گے۔ میرا یاسر آپ کی نائلہ کو گلاب کی سرخ کلی پیش کرے گا۔ ہم انہیں دعائیں دیں گے کہ اس کلی کے اطراف کبھی کانٹے نہ اُگیں۔ ان کی تمام مرادیں پوری ہوں۔"

☆======☆======☆

دوسرے دن یاسر اور اس کے دوستوں نے سرخ و سفید ربن اور غباروں سے ڈرائنگ روم کو خوب سجایا تھا۔ ایک سرے سے دوسرے تک میزوں پر کھانے کی مختلف ڈشیں رکھی ہوئی تھیں۔ آئس کریم اور بوتلیں بھی تھیں۔ شام ہوتے ہی نوجوان لڑکے اور لڑکیاں آنے لگے۔ ایک دوسرے کو وِش کرنے لگے۔

سال کا وہ دن ایسا ہوتا ہے کہ گلاب کی سرخ کلیاں نایاب ہو جاتی ہیں۔ گل فروشوں کے ہاں خریدنے جاؤ تو وہ معذرت کرتے ہیں۔ آدھا دن گزرنے سے پہلے ہی تمام کلیاں بک چکی ہوتی ہیں۔

یاسر نے ایک ہفتے پہلے ہی کئی گل فروشوں کو پیشگی رقم دی تھی اور گلاب کی ڈھیر ساری کلیاں خرید کر فریج میں رکھ لی تھیں۔ دوستوں سے کہہ دیا تھا کہ وہ پریشان نہ ہوں۔ خالی ہاتھ چلے آئیں۔ پیار کا یہ تحفہ اس کے گھر سے سب کو ملے گا۔

نوجوانوں کی اس محفل میں بھابھی جان اور بھائی جان بھی تھے۔ ان کا بڑا بیٹا اور بہو بھی تھی۔ ان کی موجودگی میں یاسر میری ایسی پذیرائی کر رہا تھا کہ وہ سب احساسِ کمتری میں مبتلا ہو رہے تھے لیکن وہاں سے اٹھ کر جانا آدابِ محفل کے خلاف تھا۔ اس لئے بیٹھے ہوئے تھے۔

ایسے ہی وقت جمال اپنی بھتیجی نائلہ کے ساتھ وہاں پہنچ گئے۔ یاسر نے بھائی جان سے کہا۔ "ڈیڈ! آپ انہیں پہچانیں۔ یہ جمال انکل ہیں۔ آج سے چالیس برس پہلے یہ کار کے ایک حادثے میں اپنے والدین کے ساتھ ہلاک نہیں ہوئے تھے لیکن آپ نے اور دادا جان نے پھوپھی اماں سے جھوٹ کہا تھا کہ یہ مر چکے ہیں۔"

بھائی جان ایک دم سے اچھل کر کھڑے ہوگئے۔ غصے سے بولے۔ "تم نے یہی بکواس کرنے کے لئے ہمیں یہاں بلایا ہے؟"

وہ وہاں سے پلٹ کر جانا چاہتے تھے۔ ان کے سامنے چار جوان آ کر کھڑے ہوگئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "انکل! آپ یہاں سے جائیں گے تو سچائی بدل نہیں جائے گی۔ جو زندہ ہیں، وہ زندہ ہی رہیں گے۔ ہر انسان کا اعمال نامہ سامنے آتا ہے۔ آپ کا بھی آ رہا ہے۔"

یاسر نے کہا۔ "ڈیڈ! یہ دونوں چالیس برس تک عذاب جھیلتے رہے۔ آپ کو کچھ دیر تو جھیلنا چاہئے۔ آپ نے صرف پھوپھی اماں کو دھوکہ نہیں دیا۔ بلکہ جمال انکل سے بھی یہ جھوٹ کہہ دیا کہ پھوپھی اماں مر چکی ہیں۔"

بھائی جان کے بڑے بیٹے نے کہا۔ "ڈیڈ! آپ بیٹھ جائیں۔ جو سچ ہے، اسے سنتے رہیں اور برداشت کرتے رہیں۔"

یاسر نے اپنے بڑے بھائی سے کہا۔ "بھائی جان! ہمارے ڈیڈ اور دادا جان نے پھوپھی اماں کی زندگی کے چالیس برس چھین لئے۔ آپ سوچیں، ان پر کتنا بڑا ظلم کیا گیا ہے۔ ہم کتنے مجبور ہیں؟ ان کی اولاد کہلاتے ہیں۔ ان کے اعمال کی کیا سزا دیں؟ ان سے تو ہم شکایت بھی کریں گے تو گستاخ کہلائیں گے۔"

اس نے اپنا موبائل فون نکال کر ہاتھ پر رکھ لیا۔ دوسرے تمام نوجوان بھی اپنا اپنا فون نکال کر ہاتھ اونچا کرنے لگے۔ یاسر نے کہا۔ "یہ موبائل فون اگر ان کی جوانی میں ہوتا تو آج

یہ چالیس برس کی جدائی کا عذاب نہ سہتے۔ اس موبائل فون کے ذریعے ہم تمام نوجوانوں نے ایک دوسرے کو پھوپھی اماں اور جمال انکل کی محبت کی داستان سنائی ہے۔ یہ سب ہی کہتے ہیں کہ ایسی سچی اور بے لوث محبت نہ ہم جوانوں نے کہیں پڑھی ہے، نہ کسی سے سنی ہے۔ اب میں دوستوں سے کہوں گا کہ وہ فریج کھول کر گلاب کی ایک ایک کلی نکال لیں۔''

وہ سب فریج کے پاس گئے اور ایک ایک کلی نکال کر اپنی اپنی جگہ آ گئے۔ یاسر نے گلاب کی ایک کلی آگے بڑھا کر سب کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ''پیار کرنے والوں کی تاریخ کہتی ہے۔ ایک بادشاہ نے دو محبت کرنے والوں کو سزائے موت کا حکم سنایا تھا۔ تب ایک چرچ کے پاپ ویلنٹائن نے اس سزائے موت کی مخالفت کی تھی۔ اس مخالفت کے باعث اسے بھی سزائے موت دے دی گئی تھی۔ تب سے محبت کرنے والے اس کے نام سے یہ ویلنٹائن ڈے مناتے ہیں۔

گلاب کی یہ سرخ کلی جوش، جذبہ، حرارت اور تحریک کی علامت ہے۔ یہ ہم جوانوں میں پائی جاتی ہے لیکن آج دو بوڑھوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ محبت کا جوش، جذبہ، حرارت اور تحریک بڑھاپے میں بھی قائم رہتی ہے۔ نہ یہ جوانی میں ہار مانے نہ انہوں نے بڑھاپے میں ہار مانی ہے۔

یہ ایک دوسرے کی لاعلمی میں مرنے کے باوجود بھی زندہ رہے۔ انہوں نے شادی نہیں کی۔ اپنی زندگی کو ایک دوسرے کے لئے وقف کر دیا۔ ہم نوجوان کیا محبت کریں گے جو انہوں نے کی ہے۔

اگر آج تک ہمارے غیر شادی شدہ جوانوں نے یہ دن منایا ہے اور اپنی محبوباؤں کو کلی پیش کی ہے تو میری پھوپھی اور جمال انکل بھی کنوارے ہیں۔ انہیں یہ دن منانے کا حق ہم سے زیادہ ہے۔''

یاسر نے گلاب کی وہ سرخ کلی جمال کی طرف بڑھا دی۔ وہ ایک دم سے چونک کر بولے۔ ''بیٹے! یہ کیا کر رہے ہو؟''

اس نے کہا۔ ''اب سے چالیس برس پہلے جو کرنا چاہئے تھا۔ وہی کرنے کو کہہ رہا ہوں۔ آپ میری پھوپھی جان کو یہ کلی پیش کریں گے۔''

جمال اس کلی کو لینے سے ہچکچانے لگے۔ تمام جوانوں کے سامنے جھینپنے لگے۔ میں بھی بری طرح شرما رہی تھی۔ ان میں سے ایک جوان نے اپنی گلاب کی کلی دکھاتے ہوئے کہا۔ ''انکل! ہم سب نے اپنی اپنی گرل فرینڈ کو یہ کلی پیش نہیں کی ہے۔''

دوسرے نوجوان نے کہا۔ ''ہم سب نے فون پر یہ طے کیا تھا کہ پہلے آپ آنٹی کو کلی پیش کریں گے۔''

ایک اور نے کہا۔ ''آپ نے پیار کا جو سفر اس بڑھاپے تک طے کیا ہے۔ وہ سفر ہم اسی وقت شروع کریں گے۔ جب آپ آنٹی کو پھول پیش کریں گے۔''

بھائی جان صوفے پر بیٹھے نادم ہو رہے تھے۔ یاسر ان کے پاس آ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ ان کے گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ ''خدا گواہ ہے، میں آپ کو شرمندہ کرنا نہیں چاہتا لیکن کیا کیا جائے؟ چالیس برس کے بعد بھی کسی کو اپنی غلطی کا احساس نہ ہو تو ہمارا فرض بنتا ہے کہ ہم اسے احساس دلائیں۔ میری پھوپھی اماں آج بھی اپنے محبوب کی خاطر بن بیاہی بیٹھی ہیں۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں، آپ ایک بڑے بھائی کی حیثیت سے اپنا کیا فرض ادا کریں گے؟''

میں نے یاسر کے پاس آ کر اس کے بازو کو تھام کر کہا۔ ''چلو۔ اٹھو یہاں سے...... تم بہت بول رہے ہو۔''

اس نے کہا۔ ''میں آپ کے لئے انصاف چاہتا ہوں۔ یہ نوجوانوں کی عدالت ہے۔ آج ویلینٹائن ڈے ہے۔ لہٰذا میں اپنا فیصلہ سناتا ہوں۔ اگر انکل نے آپ کو پھول پیش نہیں کیا اور آپ نے شادی نہ کرنے کی قسم نہ توڑی تو میں کبھی شادی نہیں کروں گا۔''

میں نے بری طرح جھینپ کر اِدھر اُدھر دیکھا پھر کہا۔ ''لڑکے! تُو پاگل ہوا ہے؟ کیا مجھے اس بڑھاپے میں شادی کے لئے راضی کرے گا؟''

وہ بولا۔ ''کیا اس دنیا میں بوڑھوں نے کبھی شادیاں نہیں کی ہیں؟ آپ کی اور انکل کی شادی ہوگی تو کیا یہ نئی اور انوکھی بات ہو جائے گی؟''

پھر اس نے نائلہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم بولو...... کیا کہتی ہو؟''

وہ اپنی جگہ سے چلتی ہوئی جمال کے پاس آئی۔ پھر ان کے بازو کو تھام کر بولی۔ ''میں بھی قسم کھاتی ہوں، اگر انکل نے ناز آنٹی کو دلہن نہ بنایا تو میں بھی زندگی بھر دلہن نہیں بنوں گی۔''

میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ بچے ہمیں اپنی محفل میں بلا کر ایسا تماشہ کریں گے۔ میں مارے شرم کے جمال کی طرف دیکھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتے ہوئے میرے پاس آ کر بولے۔ ''ناز! چالیس برس میں سہی...... ہمیں منزل مل رہی ہے۔ کیا تم چاہتی ہو، ہمارے بچوں کو کبھی منزل نہ ملے؟ یہ شادی نہ کریں؟ ازدواجی زندگی نہ گزاریں؟''

میں نے تڑپ کر یاسر اور نائلہ کو دیکھا۔ جمال نے گلاب کی سرخ کلی پیش کرتے ہوئے

کہا۔ ''ہپی ویلینٹائن ڈے......''

مجھے قبول تو کرنا تھا مگر سوچ میں پڑ گئی، کیسے کروں؟ شرم کے مارے عجیب سی حالت ہو رہی تھی لیکن لڑکے کہاں ماننے والے تھے؟ سب ہی ایک تال پر تالی بجاتے ہوئے کہنے لگے۔ ''ہائے ہائے آنٹی......! ہائے ہائے آنٹی!''

جمال نے میری طرف جھک کر سرگوشی میں کہا۔ ''گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف...... جب تک تم قبول نہیں کرو گی۔ یہ بچے ہائے ہائے کرتے رہیں گے۔''

میں نہیں جانتی، میں نے کیسے ہاتھ بڑھایا اور کیسے بڑھاپے کی آخری چوکھٹ پر جوانی کا پہلا تحفہ قبول کیا؟

میں نے جھکی جھکی نظروں سے دیکھا۔ وہ تمام نوجوان اپنی اپنی گرل فرینڈز کو گلاب کی کلی پیش کر رہے تھے۔ ان لمحات میں عارضی طور پر ہی سہی، میں جمال کے ساتھ چالیس برس پیچھے چلی گئی تھی۔

☆======ختم شد======☆